Scanned with CamScanner

۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں وفات پانے والے
ادبا کے حالات اور کلام

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

تعارف

زیرِ نظر مجموعے میں ان ۵۲ ادیبوں کے حالات اور کلام کا نمونہ ہے، جو ہمیں ۱۹۷۶ اور ۱۹۷۷ء کے دو برسوں کے دوران میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ راجعون۔ یہ سب لوگ اردو کے خادم اور بہی خواہ تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر اس زبان کی خدمت میں کھپا دی۔ ان میں سے بعض بزرگ اس پایے کے استاد تھے کہ چشمِ فلک اب ان کا ثانی نہیں دیکھیگی۔ شعرا میں سید محمد جعفری، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، سید محمد حسن سالک لکھنوی، شیام موہن لال جگر بریلوی، محمود رضوی مخمور اکبرآبادی، جان نثار اختر، کرپال سنگھ بیدار، بسمل سعیدی اساتذۂ زبان اور ماہرینِ فن تھے۔ نثر میں مُلّا واحدی، آغا حیدر حسن، سید وقار عظیم، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، ابراہیم جلیس نے جس طرح اپنی نگارشات سے زبان کا دامن مالا مال کیا ہے، اس پر اہلِ اردو کو رہتی دنیا تک فخر رہیگا۔ صحافت میں محمد عثمان فارقلیط اور ملک نصراللہ خان عزیز کے نام کون فراموش کرسکتا ہے!

ترتیب وہی ہے، جیسی اس سے پہلے ناظرین دیکھ چکے ہیں۔ البتہ اب کے ہر تذکرے کے شروع میں مآخذ کا بھی اضافہ کردیا گیا ہے۔ میں اپنے سب ہندستانی اور پاکستانی احباب کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کے تعاون سے اتنے حالات بھی جمع ہو گئے۔ حالات کا جمع کرنا آسان نہیں؛ بعض اوقات کسی ایک بات کی تصدیق یا تحقیق میں مہینوں صرف ہو جاتے ہیں۔ ان احباب نے جس خندہ پیشانی سے میرے خطوط کے جواب

دیے اور جزئیات فراہم کرنے میں جیسی تگ و دو کی، اس کے لیے میں ہی نہیں، تاریخِ ادب کا مؤرخ بھی ہمیشہ ان کا مرہونِ منّت رہیگا۔
حالات سے بھی زیادہ پریشان کن نمونۂ کلام مہیّا کرنا تھا کیوں کہ حضرات کے دیوان آج تک شائع نہیں ہوئے؛ ان کا کلام بیاضوں میں محفوظ ہے یا رسائل کی پرانی جلدوں میں۔ بعض اوقات ان کے اخلاف نے کرم کیا اور کچھ نقل کر کے بھیج دیا۔ جہاں میں انھیں اس پر آمادہ کرنے میں ناکام رہا، وہاں پرانے رسائل تلاش کرنا ناگزیر تھا۔ کچھ میرا ہی دل جانتا ہے کہ اس کے لیے کہاں کہاں کے کنوئیں جھانکنا پڑے ہیں!
اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا مجھ سے زیادہ کوئی واقفکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن غالباً اس کام کی ضرورت اور افادیت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوگا! پس جو کچھ ہوگیا ہے، اس کے لیے خدائے علیم و خبیر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائی۔ وما توفیقنا اِلّا باللہ العظیم!

مالک رام

نئی دلّی

۲۵ مارچ ۱۹۸۲ء

فہرست

بترتیبِ حروفِ تہجّی

فہرست

بترتیب تاریخِ وفات

نام / تخلص	مقام وفات	تاریخ وفات	صفحہ
جان نثار اختر، جان نثار حسین رضوی	بمبئی	۱۸ اگست ۱۹۷۶ء	۹۲
ملا واحدی، سید محمد ارتضیٰ	کراچی	۲۲ اگست ۱۹۷۶ء	۱۰۳
سید محمد، پروفیسر	حیدرآباد	۳۰ اگست ۱۹۷۶ء	۱۱۳
پریم ناتھ در	نئی دلی	۶ ستمبر ۱۹۷۶ء	۱۱۷
کلیم محمد مکین احسن	لاہور	۱۱ ستمبر ۱۹۷۶ء	۱۲۵
محشر عنایتی رامپوری، صابر رضا خان	رامپور	۲۲ ستمبر ۱۹۷۶ء	۱۲۷
صوفی بانکوٹی، محمد ابراہیم پرکار	بمبئی	۱۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء	۱۳۵
ذکی دامودر ٹھاکر	کوژنگل	۱۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء	۱۴۰
اختر لکھنوی، سجاد علی خان	لکھنؤ	۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء	۱۴۵
آغا حیدر حسن مرزا دہلوی	حیدرآباد	۵ نومبر ۱۹۷۶ء	۱۴۹
ریاست علی ندوی، سید	گیا	۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء	۱۵۵
فانی بلگرامی، وصی احمد، سید	کراچی	۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء	۱۶۱
وقار عظیم، سید	لاہور	۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء	۱۶۶
معزز لکھنوی، مرزا محمد عزیز	لکھنؤ	۲۳ نومبر ۱۹۷۶ء	۱۷۳
تحسین سروری، میر کاظم علی	کراچی	۷ دسمبر ۱۹۷۶ء	۱۷۷
عبدالماجد دریابادی، مولانا	لکھنؤ	۶ جنوری ۱۹۷۷ء	۱۸۱
مختار ہاشمی، مختار الدین	علی گڑھ	۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء	۱۹۵
رشید احمد صدیقی	علی گڑھ	۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء	۲۰۱
سخاوت مرزا، محمد سخاوت مرزا	کراچی	۲۴ جنوری ۱۹۷۷	۲۱۷

سیّد محمد جعفری

ان کا خاندان حضرت جعفر صادق علیہ السّلام کا نام لیوا تھا۔ روایت ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ سیّد جلال الدّین مشہور اسلامی فاتح محمود غزنوی کی فوج میں جرنیل کے عہدے پر فائز تھے۔ محمود غزنوی نے انھیں بھرتپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جس جگہ انھوں نے ڈیرے ڈالے اور پھر فتح حاصل کی، وہ بعد کو "پہرسر" کے نام سے موسوم ہوئی کیونکہ یہ جنگ دوپہر سے قبل سر ہوئی تھی۔ جلال الدّین پھر اسی جگہ بس گئے، اور یہی جگہ ان کے خاندان کا مسکن قرار پائی۔

سیّد محمد جعفری پہرسر (بھرتپور) ہی میں ۲۷ دسمبر ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد علی جعفری کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اسلامیہ کالج، لاہور کے پہلے پرنسپل تھے؛ اس سے قبل وہ وہیں اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب اسکول سے کالج بنا، تو انھیں اس کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ وہ اس عہدہ سے ۱۹۱۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ وہ مولانا شبلی (ف: نومبر ۱۹۱۴) اور علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء) کے ملنے والوں میں تھے۔ انھوں نے بہت لمبی عمر پائی؛ ۱۹۷۳ء میں ۱۰۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

گھر کا ماحول علمی اور تعلیمی تھا۔ سیّد محمد جعفری نے فارسی کی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل کا امتحان ۱۴ برس کی عمر میں پاس کیا تھا۔ انگریزی دسویں کی سند اس کے بعد لی۔ پھر تو تعلیمی میدان میں انھوں نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں۔ گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے

ماخذ: شمشاد حسین رضوی، کراچی؛ روزنامہ جنگ، کراچی؛ اُردو کی مزاحیہ شاعری (عرش ملسیانی)

لیا اور یکے بعد دیگرے اوّل یہاں سے بی ایس سی (آنرز کیمسٹری)، اورا ورنٹیل کالج، لاہور سے ایم اے (فارسی) اور ایم، او، ایل، کی اسنادیں۔ پھر ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے (اردو) سنٹرل ٹریننگ کالج سے بی ٹی (۱۹۳۴ء) اور سب سے آخر ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے (انگریزی) کے امتحان پاس کیے۔

کسبِ معاش کا مسئلہ سامنے آیا، تو اپنی تعلیمی تربیت کے صدقے اولاً چندے صحافت سے شوق کیا۔ اس زمانے میں زمیندار اور مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۹) کا طوطی بولتا تھا۔ یہ بھی زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جہلم کے ایک اسکول کی دعوت پر وہاں مدرسی قبول کر لی پھر گورنمنٹ کالج، لائل پور میں جگہ مل گئی۔ ۱۹۴۰ء میں وہ حکومتِ ہند میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہو گئے۔ جب ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، تو بقول ان کے جہیز میں شامل ہو کر یہ بھی پاکستان چلے گئے۔ وہاں ۱۹۵۰ء میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر وہ مدتوں رہے۔ ۱۹۶۴ء میں سفارتخانۂ پاکستان، تہران (ایران) میں ان کا بطور پریس و کلچرل اتاشی تقرر ہوا تھا۔ دو سال بعد (۱۹۶۶ء میں) اسی جگہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

شاعری کی روایت گھر میں موجود تھی۔ ان کے پردادا سید کرامت علی کرامت شعر کہتے تھے۔ زندگی بھر کہتے رہے۔ لیکن نہیں معلوم کیا خیال آیا کہ مرنے سے کچھ دن پہلے اپنے بیٹے (یعنی سید محمد جعفری کے دادا) کو حکم دیا کہ اس دفتر ہمیمی کو ضائع کر دو۔ فرمانبردار بیٹے نے حکم کی تعمیل کی، اور دیوان دریا بُرد کر دیا۔ دادا بھی شعر کہتے تھے۔ والد (سید محمد علی) غالباً شعر تو نہیں کہتے تھے، البتہ فارسی اور اردو کے فاضل اور علم دوست بزرگ تھے۔

سید محمد کی شاعری کے آغاز کا قصّہ بھی پُرلطف ہے۔ ۱۹۲۰ء میں انھیں آرٹ

سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میو اسکول آف آرٹ، لاہور اپنے عہد کا مشہور ادارہ تھا۔ وہاں داخلہ لے لیا، اور تصویریں اور مٹی کے ماڈل بنانے لگے۔ تھوڑے دن بعد والد کو پتا چلا، تو فرمایا: بیٹا یہ کام سیّدوں کو زیب نہیں دیتا۔ اب کیا کرتے، وہاں سے نام کٹوا لیا اور فیصلہ کیا کہ اچھا، آج سے لفظوں کی تصویریں بنائیںگے۔ چنانچہ شعر کہنے لگے، مگر اس طرح کہ مدّتوں والد یا گھر کے کسی فرد کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ لیکن تابکے! کوئی شخص شعر کہے، دوستوں کی محفلوں میں پڑھے مشاعروں میں شریک ہو، اور یہ خیال کرے کہ میرے گھر والوں تک اس کی خبر نہیں پہنچےگی، تو یہ خیال خام سے زیادہ نہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ یہ شروع سے مزاحیہ کہتے تھے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ شہر بھر میں اس حیثیت سے ان کی شہرت عام ہوگئی۔

انجمنِ حمایتِ اسلام کا مشاعرہ تھا۔ یہ بھی اپنے والد سیّد محمد علی صاحب کے ساتھ مشاعرے میں موجود تھے۔ ان کا نام پکارا گیا، تو یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے، جیسے ان کا نہیں کسی اور کا نام پکارا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ان کے والد اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ سیّد محمد جعفری نے خیال کیا کہ اب وہ واپس نہیں آئیںگے۔ اس لیے میدان صاف دیکھ کر منتظمین سے کہہ دیا کہ اب وہ نظم سنائیںگے۔ چنانچہ فوراً بلا لیے گئے۔ یہ نظم پڑھ ہی رہے تھے کہ والد صاحب پھر پنڈال میں داخل ہوئے، اور اب کے ان کے دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ تھے۔ سیّد محمد جعفری نے انھیں آتے دیکھا، تو حواس باختہ ہوگئے اور اگلا مصرع تک بھول گئے۔ خیر، جوں توں کر کے انھوں نے ایک آدھ مصرع پڑھا اور نظم ختم کردی۔ اب یہ وہاں سے سر پر پانو رکھ کے بھاگے، اور گھر پہنچ کے دم لیا۔ والدہ سے سارا قصّہ بیان کیا اور ان کی سفارش پر ان کی یہ شعر خوانی معاف ہوئی۔

اگلے دن کالج کے قدیم طلبہ کا ڈنر تھا۔ سر سکندر حیات خان صدرِ محفل تھے۔ جب سیّد محمد جعفری پہنچے، تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ یہ سمجھے کہ کسی اور کا استقبال ہو رہا

ہے ہرسکندر نے انھیں بتایا کہ کسی اور کا نہیں، بلکہ حاضرین خود اُن کے آنے پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ چپکے سے اپنے والد کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہرسکندر نے ان سے شعر پڑھنے کی فرمایش کی۔ انھوں نے کچھ جھینپ کر والد کی طرف دیکھا۔ انھوں نے فرمایا: میاں، جب شعر کہتے ہو تو پڑھنے میں کیا حرج ہے۔ اب چھپانے سے کیا حاصل! اس کے بعد گویا بندھ ٹوٹ گیا، اور وہ علانیہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔

اگرچہ وہ کبھی کبھی غزل سے بھی شوق کرتے تھے، لیکن بیشتر کلام مزاحیہ ہے۔ افسوس کہ دیوان ان کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ آخری ایام میں وہ اسے مرتب کر رہے تھے؛ لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ہی بلاوا آگیا۔ مزاحیہ شاعری سے متعلق ان کا یہ نظریہ تھا کہ اسے ایسا صاف ستھرا ہونا چاہیے کہ آپ اسے مستورات اور بچوں کے سامنے بھی پڑھ سکیں، اور دوسرے، اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

وہ "عطارد" کے قلمی نام سے فکاہیہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ انھیں بھی جمع کر کے محفوظ کر دینا چاہیے۔ وہ حد درجہ ہنسوڑ ہونے کے باوجود ہمیشہ سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے۔ اگر ان کے لطائف اور برجستہ گوئی کے نمونے بھی جمع کر دیے جائیں، تو یہ بھی ادب کی کچھ کم خدمت نہیں ہو گی۔ ایک آپ بھی سُن لیجیے:

جلیل قدوائی انھیں کے محکمہ میں ملازم اور ان کے ہمکار تھے۔ جلیل کی دوسری بیگم کا نام ہرمزی ہے؛ وہ اچھی تعلیمیافتہ اور سخن شناس خاتون ہیں۔ جلیل کا دوسرا مجموعۂ کلام انھیں نے جمع کر کے شائع کیا ہے؛ شروع میں دیباچہ بھی انھیں کے قلم سے ہے۔ انھیں خوبیوں کے باعث جلیل اکثر ان کا ذکر کرتے ہیں؛ بلکہ انھوں نے کراچی میں اپنا مکان تعمیر کرایا، تو اس کا نام بھی "ہرمزی محل" رکھا۔ سیّد محمد جعفری نے ان سے متعلق شعر کہا:

کس قدر مرتب ہے لف و نشر رسوائی　　　　یعنی ہرمزی بیگم اور جلیل قدوائی

مسلم مہاجرین نے کراچی پہنچنے پر جو مکان خالی دیکھا، اس پر قبضہ جما لیا اور باہر لکھوا دیا: ہٰذا من فضل ربّی،

جعفری نے اپنا مکان سوسائٹی سے قرض لے کر بنوایا تھا، اس لیے انھوں نے اس کا نام "بیت المقروض" رکھا۔
جعفری صاحب کا انتقال چہار شنبہ ۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو حرکت قلب بند ہونے سے کراچی میں ہوا۔ پاکستان امپلائز کو اپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (P.E.C.H.S) کے جو عرف عام میں "سوسائٹی" کہلاتی ہے، قطعے "باغ خراسان" میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔ اس حصے میں صرف اثنا عشری حضرات دفن ہوتے ہیں۔ رئیس امروہوی کا قطعۂ تاریخ وفات ہے:-

مرگ سید محمد مرحوم	کیا قیامت ہے اے دل رنجور
جعفری، شمع محفل احباب	لطف و طنز و مزاح میں مشہور
نکتہ دان رموز شعر و سخن	ادب و شعر کا منارۂ نور
جنتی تھا، وہ سید ذیجاہ	اے رئیس آہ ناجی مغفور

(۱۳۹۶)

ان کی شادی ۱۹۴۰ء میں بھرتپور میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔
سید محمد جعفری کا مزاحیہ اور طنزیہ شاعری میں جواب نہیں۔ چونکہ ان کی تربیت کلاسیکی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے وہ ادبی روایات سے انحراف نہیں کرتے۔ ان کے یہاں الفاظ کے استعمال میں بہت رکھ رکھاؤ ہے۔ طنزیہ اور خاص کر مزاحیہ کلام میں اگر شاعر بے قابو ہو جائے، تو اس میں رکاکت اور سوقیت پیدا ہو جاتی ہے جعفری ان عیوب سے دامن صاف بچا کے نکل گئے ہیں۔ پرانے اساتذہ کی پیروڈی اور تضمین نے ان کے کلام کو ایسی بلند سطح پر لا کھڑا کیا ہے کہ نہ صرف عام قاری بلکہ خود وہ شخص بھی جو ہدف طنز و مزاح ہے، اس سے لطف اندوز ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔
ان کی بعض نظموں کے چند اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

وزیروں کی نماز:

عیدِ اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر ۔۔۔ جب کہ اللہ کے دربار میں تھے ایک وزیر
وہ مصلّوں پہ مسلّط تھے بحسنِ تقدیر ۔۔۔ تھے بہ زیرِ رو، اُن کے مصلّے بہ مساواتِ کبیر

آج کل یہ ہے نماز اور کبھی وہ تھی نماز
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

صفِ اوّل میں کھڑے تھے جو خدایانِ مجاز ۔۔۔ یہ امیر اور یہ غریب، اور یہ نشیب اور یہ فراز
تجھ سے اے خالقِ کل، چھپ نہیں سکتا یہ راز ۔۔۔ تو حقیقی، وہ مجازی، مجھے دونوں سے نیاز

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
کبھی رکھتے ہی نہیں، اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے ۔۔۔ ساتھ لائے تھے مصلّیٰ، وہ بچھایا ہم نے
دور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے ۔۔۔ ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
کون کہتا ہے کہ ہم لائقِ دربار نہیں

ذکر خطبے میں وزیروں کا جو پایا ہم نے ۔۔۔ آسمانوں کو زمینوں سے ملایا ہم نے
کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہم نے ۔۔۔ سامری کی طرح بچھڑوں کو سجایا ہم نے

"خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر
مان لیتا کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر"

پُرانا کوٹ:

خرید جاڑے میں نیلام سے پرانا کوٹ ۔۔۔ کہ مفلسی ہو، تو پتلون سے سوا ہے لنگوٹ
بنا ہے کوٹ یہ نیلام کی دکاں کے لیے ۔۔۔ "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"
بڑا بزرگ ہے، اور آزمودہ کار ہے یہ ۔۔۔ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ
نہ دیکھ کہنیوں پر اس کی خستہ سامانی ۔۔۔ پہن چکے ہیں اسے ترک اور ایرانی

جگہ جگہ یہ پھرا مثل مار کو پولو — یہ کوٹ کوٹوں کا لیڈر رہے، اس کی جے بولو

جو قدرداں ہیں، وہی جانتے ہیں قیمت کو — کہ آفتاب حُرالے گیا ہے رنگت کو

بڑا بزرگ ہے یہ، گو قلیل قیمت ہے — میاں! بزرگوں کا سایہ بہت غنیمت ہے

گزشتہ صدیوں کی تاریخ کا ورق ہے یہ کوٹ
خریدو اس کو کہ عبرت کا اک سبق ہے یہ کوٹ

جب لاد چلیگا بنجارا

جب وفد بنا کر چودھریوں کا لے جاتا ہے طیارا
کچھ اس میں افسر جاتے ہیں، کچھ بیوپاری، کچھ ناکارا
کھینچ انھیں دے دیتا ہے، یہ ملک ہمارا بیچارا
ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں! مت دیس بدیس پھرے مارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا، جب لاد چلیگا بنجارا

جس محفل میں تو جاتا ہے، وہ اہلِ خرد کی محفل ہے
تو صرفِ وزارت کرتا ہے، اور صرف اسی کے قابل ہے
جو بس کا تیرے کام نہیں، اس کام کے اوپر مائل ہے
دورانِ سفر گر ٹوٹ گئی کابینہ، جس میں تو شامل ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا، جب لاد چلیگا بنجارا

مانا کہ تو بڑا ہی شاطر ہے، اور اس سے بڑا بیوپاری ہے
پر دیکھ تو تیرے ملک میں کیا افلاس ہے، کیا ناداری ہے
اور تو ہے ذخیرہ اندوز بڑا، لالچ کی تجھے بیماری ہے
چیزوں کی جو قیمت اونچی ہے، سب تیری صنعت کاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا، جب لاد چلیگا بنجارا

اس نفع خوری کے چکر میں تو حج کرنے جب جائیگا
پیتل جو پہن کر جائیگا، سونے سے بدل کر لائیگا

کسثم سے بھی بچ کر نکلیگا، اور حاجی بھی کہلائیگا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گرائیگا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلیگا بنجارا

آزاد ممالک کی وہ فضا! دراچھا بترا چال چلن
بدنام ہوئی ہے قوم تری، رسوائے جہاں ہے تیرا وطن
یہ دھن کہ کراچی میں ہو مکاں اک راس نہیں اک پرس کی لگن
کیا مندر، مسجد، تال، کنواں کیا گھاٹ سرا، کیا باغ چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا، جب لاد چلیگا بنجارا

بھنگیوں کی ہڑتال:

بھنگیوں کی آج کل ہڑتال ہے
گردش دوراں نے ثابت کر دیا
ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی
پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں سیٹھ جی
آگیا، روکے سے رک سکتا نہیں
ہر گلی کوچے کی اپنی جھیل ہے

کھتر و مہتر کا پتلا حال ہے
رفع حاجت بھی بڑا جنجال ہے
سانس کھینچے ہیں، مگر منہ لال ہے
جیسے دھوتی میں بہت سامال ہے
اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے
ہر جگہ دہلی میں نینی تال ہے

جوش ملسیانی، لبھو رام (پنڈت)

پنجاب کے ضلع جالندھر میں ایک مختصر سا قصبہ ملسیان نام کا ہے جس زمانے کا میں ذکر کرنے والا ہوں، اس دور میں یہاں کی خصوصیت یہ تھی کہ پورے قصبے میں کسی کو پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا، لے دے کے چند آدمی دستخط کرنا جانتے تھے، باقی وقت ضرورت انگوٹھا استعمال کرتے تھے۔ نصف صدی بعد خود جوش صاحب نے ایک شعر اپنے وطنِ عزیز کی شان میں کہا تھا:

کیا کروگے جوش! تم جاکر وہاں
ملسیاں اب بھی خراب آباد ہے

جوش صاحب اسی ملسیان کے ایک برہمن گھرانے میں یکم فروری ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان کسی وقت خاصا کھاتا پیتا اور خوشحال خاندان تھا۔ ان کے دادا پنڈت نہال چند گُڑ کا کاروبار کرتے تھے۔ جالندھر کا علاقہ (دوآبہ ستلج و بیاس) گنے کی کاشت اور اعلیٰ قسم کے گُڑ اور شکر کے لیے مشہور رہا ہے؛ آج بھی ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے گُڑ کی بہت بڑی کھیپ کشتیوں سے مغربی پنجاب کے اضلاع کو بھیجی۔ دریا میں سیلاب آگیا اور بدقسمتی سے سب کشتیاں بہاولپور کے قریب غرقاب ہوگئیں۔ یہ نقصان ان کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا! اس کے بعد عُسرت و ادبار نے گھر میں ڈیرا ڈال دیا۔

جوش صاحب کے والد پنڈت موتی رام بھی اَن پڑھ تھے۔ ان کی پشاور کے قصہ خوانی بازار میں حلوائی کی دکان تھی۔ ان کے تین بچے ہوئے: رُلیا رام، لبھو رام، ایک بیٹی۔

ماخذ: عرش ملسیانی، تحریر (جوش ملسیانی نمبر) یادگار جوش (ساحر ہوشیار پوری)

یہی لبھورام ہمارے جوش ملسیانی ہیں۔
پنڈت موتی رام کے اوضاع و اطوار ایسے نہیں تھے کہ انھیں اپنی فکر ہوتی، یا اولاد کی تعلیم و تربیت کی۔ جو کمایا، کھانے پینے میں اڑا دیا، کھانے میں کم، پینے میں زیادہ۔ بڑا لڑکا ڈرلیارام، ان کے پاس پشاور میں رہتا تھا، اور چھوٹے دونوں بچے اپنی والدہ کے ساتھ ملسیان میں۔ لبھورام جب سنِ شعور کو پہنچے، تو ان کی والدہ نے انھیں قصبے کے پرائمری اسکول میں بٹھا دیا۔ یہاں سے فارغ ہوئے، تو شاہکوٹ کے ورنیکلر مڈل اسکول بھیج دیے گئے، جو ملسیان سے کوئی پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر اس سے ذرا بڑا قصبہ ہے۔ اس زمانے میں ان کی والدہ نے جس محنت و مشقت سے ان کی تعلیم کا بار اٹھایا، وہ کچھ اس حوصلہ مند اور دور اندیش خاتون ہی کے بس کی بات تھی۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ میرے بچوں کو اپنے والد کے ترکے میں کچھ ملنے کا نہیں؛ بڑا لڑکا تو باپ کے ساتھ دکان پر تھا ہی؛ چھوٹا (لبھورام) اگر کچھ پڑھ لکھ گیا، تو شاید اپنی روزی کمانے بھر کا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خود کڑی جھیلی؛ لیکن بیٹے کو کسی نہ کسی طرح مڈل تک تعلیم دلوا دی۔ جوش صاحب جب کبھی بڑھاپے میں بھی اپنی والدہ کا ذکر کرتے، تو اس زمانے کی ان کی تکلیف کی زندگی اور محبت اور قربانیوں کو یاد کر کے وفورِ جذبات سے ان کی آواز بھرا جاتی تھی۔ انھوں نے ۱۸۹۷ء میں ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے پاس پشاور گئے کہ شاید وہاں کوئی کام نکل آئے۔ کوئی سال بھر وہاں رہے ہوں گے کہ بدقسمتی سے پنڈت موتی رام بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ دونوں بھائی انھیں ساتھ لے کر ۱۸۹۹ء میں وطن چلے آئے۔ تھوڑے دن بعد اسی بیماری میں ان کا ۵۲ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ جوش صاحب اس وقت صرف پندرہ برس کے تھے۔
اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ مدرسی کا پیشہ اختیار کیا جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے نارمل اسکول، جالندھر میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۰۱ء میں نارمل کی سند حاصل کی۔ وہ اس امتحان میں قسمت سے جالندھر میں اوّل آئے تھے۔ اس کے بعد

ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول، جالندھر میں مدرس مقرر ہو گئے۔ دس روپے تنخواہ مقرر ہوئی جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔
چونکہ انھوں نے تدریس کو اپنا پیشہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس لیے اس کی تکمیل کے لیے سال بھر بعد سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور کی ایس، وی کلاس میں داخل ہو گئے، جہاں سے انھوں نے ۱۹۰۳ء میں یہ سند بھی حاصل کر لی۔
اس کے بعد وہ ضلع جالندھر کے کئی اسکولوں میں مدرس رہے۔ مختلف مقامات پر کام کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں نکودر میں تقرری ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں دوبارہ ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول، نکودر میں جگہ نکل آئی، جہاں وہ فارسی کے مدرس اول مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں محکمانہ ضرورت کے پیش نظر منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان امتیاز سے پاس کر لیے۔ بالآخر ۱۹۳۶ء میں یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس دوران میں انھوں نے یہاں اپنا مکان بھی تعمیر کرا لیا تھا۔ چنانچہ بقیہ زندگی وہ یہیں مقیم رہے۔
ابتدائے عمر کی جانفشانی اور محنت کی عادت نے ان کی صحت کی بنیاد مضبوط بنا دی تھی۔ اسی لیے وہ ہمیشہ تندرست اور رچاق چوبند رہے۔ ۱۹۷۳ء کے جاڑوں میں گر جانے سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ چلنے پھرنے میں تکلف محسوس کرنے لگے تھے، لیکن باقی قوا حسب معمول ٹھیک تھے۔ عمر کے ساتھ باہر جانا آنا یوں بھی کم ہو گیا تھا؛ دوست احباب ملاقات کے لیے گھر پر آ جاتے۔ شطرنج کے وہ ساری عمر رسیا رہے اور اس میں انھیں استادانہ مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ اپنے پرانے ہجولیوں کے ساتھ شطرنج کھیلتے، اور خوش و خرم رہتے۔ صحت آخر تک تسلی بخش رہی۔ منگل ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء صبح حسب معمول اٹھے، حوائج ضروریہ سے فارغ ہوئے۔ یکایک سر درد اور چکروں کی شکایت کی اور اسی میں چند منٹ بعد جان بحق ہو گئے۔
جنازہ اگلے دن (۲۸ جنوری ۱۹۷۶ء) بدھ کو اٹھا، جب اُن کے جسدِ خاکی کو سپردِ آتش

کیا گیا۔ تعزیتی قراردادیں اور مختلف اصحاب کے خراجِ عقیدت ایک کتابچے "سیلِ ماتم" میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

بہت لوگوں نے تاریخِ وفات کہی۔ مفتون کوٹوی کا قطعہ عیسوی میں ہے:

وہ مرجعِ شرف بھی رہے "نغز گو" بھی تھے

(۸۹۳ + ۱۰۸۴ = ۱۹۷۷ء)

ان دونوں خوبیوں کے تھے پیکر جنابِ جوش

ان دونوں خوبیوں سے بنا سالِ ارتحال

پائیں فیوضِ رحمتِ داور جنابِ جوش

ہجری میں جناب ساحر امرتسری کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے:

جوش کا سالِ مرگ، اے ساحر!

کہہ دے بے باک "جانشینِ داغ"

(۱۴۱۹ - ۲۳ = ۱۳۹۶)

انھوں نے شعر گوئی طالبعلمی کے زمانے میں شروع کر دی تھی، لیکن مدتوں کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ جن دنوں وکٹر ہائی اسکول جالندھر میں پڑھاتے تھے، کہیں سے داغ کے مشہور شاگرد سید شبیر حسن نسیم بھرتپوری (ف: ۱۹۰۹ء) کا دیوان ہاتھ لگ گیا، بہت پسند آیا۔ اس کے بعد زبان اور فن کے بارے میں کوئی حل طلب بات ہوتی، تو خط کے ذریعے انھیں پوچھ لیتے۔ جب تھوڑی مدت بعد فیصلہ کیا کہ داغ کی شاگردی اختیار کی جائے تو نسیم بھرتپوری ہی کی وساطت سے یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا؛ یہ اوائل ۱۹۰۲ء کا واقعہ ہے۔ لیکن اصلاح کا یہ سلسلہ بھی تین برس سے زیادہ نہیں رہا کہ داغ کا فروری ۱۹۰۵ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد کسی سے مشورہ نہیں کیا۔

بہت سا ابتدائی کلام ان کی بے احتیاطی سے ضائع ہو گیا۔ ان کی سب سے پہلی کتاب جو میری نظر سے گزری ہے، "وہ نشترِ غیب" معروف بہ "سیلِ ماتمِ برکت علی" ہے؛ پہلے سے تاریخ ۱۹۶۲ بکرمی اور دوسرے سے ۱۳۱۳ فصلی نکلتی ہے) یہ دراصل رثائی منظومات

ہیں، جو انھوں نے ایک دوست غلام علی کے بیٹے برکت علی کی وفات حسرت آیات پر کہی تھیں؛ ۳۲ صفحات کا یہ مختصر کتابچہ ۱۹۰۸ء میں کارخانہ ہلالی سٹیم پریس، ساڈھورہ میں چھپا تھا۔ بادۂ سرجوش (نکودر: ۱۹۴۰ء) اور جنون و ہوش (دلّی: ۱۹۵۲ء) اور فردوسِ گوش (نکودر: ۱۹۶۳ء) منظومات و غزلیات کے تین مجموعے ہیں۔ سب سے آخری کتاب نغمۂ سروش رباعیوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ نثر میں سب سے اہم تصنیف "دیوانِ غالب مع شرح" ہے جس کا پہلا اڈیشن نکودر سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ چار مرتبہ چھپ چکی ہے۔ "آئینۂ اصلاح" میں اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں جمع کی ہیں، اس کے بھی دو اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ایک زمانے میں انھوں نے اقبال کے کلام پر ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا، جو "جرّاح" کے قلمی نام سے ہفتہ وار "پارس"، لاہور میں چھپا۔ بعد کو یہ "اقبال کی خامیاں" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ "دستور القواعد فارسی" میں طلبہ کے لیے فارسی کے صرف و نحو کے اصول بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد دو کتابیں شائع ہوئیں: (۱) مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا مرتبہ کالی داس گپتا رضا (بمبئی: ۱۹۷۶ء)؛ اور (۲) منشوراتِ جوش ملسیانی (بمبئی ۱۹۷۷ء) اس میں جوش کے ۱۸ مضمون شامل ہیں۔ ان میں زیادہ مضمون اُردو زبان کے مسائل پر ہیں، اور چند اپنے ہمعصروں کے بارے میں۔ ابھی کم از کم اتنے ہی اور مضمون غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ انھیں بھی شائع کر کے محفوظ کر دینا چاہیے۔

انھوں نے ساری عمر اردو کی خدمت کی۔ علمی دنیا نے بھی ان کی کما حقہٗ قدر کی۔ ادبی حلقوں نے ۱۹۵۷ء میں ایک جلسۂ عام میں "ابھی نندن گرنتھ" ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت وزیر امور داخلیہ پنڈت گووند بلبھ پنت نے کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے دو شعر کا یہ قطعہ فی البدیہہ کہا تھا:

پوچھا کسی نے مجھ سے کہ یہ شاعری کی قدر
مسندِ امام کی ہے کہ گدی مہنت کی

میں نے کہا: یہ دونوں ہی باتیں ہیں نادرست
جو کچھ بھی قدر ہے، وہ عنایت ہے پنت کی

مرکزی حکومت نے ان کی خدمات کا اعتراف یومِ جمہوریۂ ہند جنوری ۱۹۷۱ء کے موقع پر "پدم شری" کے اعزاز سے کیا۔

اُردو کے مشہور شاعر پنڈت بال مکند عرش ملسیانی جوش مرحوم کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھیں کے بارے میں ان کا شعر ہے:

عرش پر اے جوش! تم کو ناز کرنا چاہیے
ایک ہو ایسا پسر، تو ایک بھی کچھ کم نہیں

جوش ملسیانی مرحوم کو زبان پر حیرتناک قدرت حاصل تھی۔ وہ عروض کے مسلمہ استاد تھے اور اس میدان میں سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص جو کبھی اُردو کے مراکز، دلّی اور لکھنؤ میں نہیں رہا؛ جس کی ساری عمر پنجاب کے دیہات میں گزری؛ جہاں اُردو سیکھنے کے مواقع تو درکنار، اُردو بولنے تک کے مواقع ناپید تھے، اسے زبان اور محاورہ اور روزمرّہ پر ایسی قدرت کیونکر حاصل ہو گئی! انھوں نے کم و بیش ۷۰ برس اُردو کی خدمت میں بسر کیے؛ اور ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کی ایک بڑی جماعت جو ان کے قدم بقدم یہ کام کر رہی ہے، اس سے ان کی یہ خدمت صدقۂ جاریہ کا مقام حاصل کر گئی ہے۔

اب ان کی پختہ کلامی اور مضمون آفرینی کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو:

اے دل! یہ کہیں آہ تری جرم نہ بن جائے — خاموش ہو، کمبخت! زمانے کی ہوا دیکھ
پھول کیوں خاموش ہیں، یہ راز میں کیونکر کہوں — مجھ کو ڈر ہے، میرے سر سارا چمن ہو جائیگا
پھل اسے آئے نہ آئے، یہ مقدر کی ہے بات — چھاؤں تو نخلِ تمنا کی گھنی ہوتی ہے
اس قدر غیر ہے کیوں حال تمھارا، اے جوش! — کبھی دل پر تو کبھی دم پہ بنی ہوتی ہے
بجلی نے کیا خاکِ چمن جس کو جلا کر — آندھی بھی اسی سوختہ ساماں کے لیے ہے
ناخدا غافل، ہوائیں تند، موجیں ہولناک — وہ تو قسمت تھی کہ ساحل پر سفینہ آ گیا
تمنا خود تمنا کا ثمر ہے — اسے کہیے نہالِ بے ثمر کیوں!
جب سنا سکتے تھے حالِ دل، تو وہ سنتے نہ تھے — اب وہ سنتے ہیں، تو ہم ان کو سنا سکتے نہیں

میری آنکھوں سے بھی تو نے اسے دیکھا ہوتا
اپنی آنکھوں ہی سے دیکھا ہے جسے اے ناصح!
تجھے دیر میں کوئی نہ پا سکا، نہ حرم میں تو نظر آ سکا

رہے سب سے اچھے وہی بشر، جو ادھر گئے نہ اُدھر گئے
جنھیں تجھ سے ملنے کی تھی لگن، وہ بڑھے گئے تری راہ میں
جنھیں دل لگی کا خیال تھا، وہ بہشت ہی میں ٹھہر گئے
تجھے شوق راہِ طلب کا ہے، تو رُکے ہوؤں پہ نظر نہ کر
جو ٹھہر گئے، وہ ٹھہر گئے، جو گزر گئے، وہ گزر گئے

مرغِ چمن اب بھی ہے فریاد خواں
آپ تو کہتے تھے، بہار آ گئی
آپ رہے جس سے بہت بے خبر
لیجیے، آج اس کی خبر آ گئی
ہیں تو کر دیا خاموش تم نے
مگر روکو گے کس کس کو زباں کو!

کیوں انتظارِ حشر ہو آپس کی بات پر
کیوں فیصلہ ہمارا تمھارا یہیں نہ ہو!
کوئی چمن میں، کوئی بیاباں میں جا رہا
وہ کیا کرے کہ جس کا ٹھکانا کہیں نہ ہو!

قسمت کے بگڑنے سے تمھیں تو نہیں بگڑے
بگڑا ہے زمانہ بھی، زمانے کی ہوا بھی

یاس میں لب پر اب فغاں بھی نہیں
آگ ایسی لگی، دھواں بھی نہیں
کیوں کیا دیر سے حرم کا سفر
تو یہاں بھی نہ تھا، وہاں بھی نہیں

شیخ کیوں ایسی بات کہہ جائے!
محترم ہی سہی، خدا تو نہیں
حسن ہو مہرباں، یہ ممکن ہے
مگر ایسا کبھی ہوا تو نہیں
رنج و غم میں بھی خوش رہو اے جوش!
زیست انعام ہے، سزا تو نہیں

قدامت پسندوں پہ کیوں ہنس رہے ہو، خدا کی قدامت پسندی تو دیکھو
ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں برس سے، وہی کہکشاں ہے، وہی چاند تارے
نہ غم مجھ کو گردابِ رنج و بلا کا، نہ محتاج ہوں میں کسی نا خدا کا
سفینے کو موجوں کی زد سے بچا کر، چلا جا رہا ہوں کنارے کنارے

داغِ غم، داغِ الم، داغِ تمنا دل میں ہے
انہی شمعوں سے بھی رہتا ہے اندھیرا دل میں

سیاہیِ شامِ غم کا شکوہ نہیں ہے راہِ طلب میں واجب
یہی اندھیرا بنیگا رہبر، اسی سے کچھ روشنی ملیگی

کہا تم نے، سنا ہیں نے، اب اور اتنا بنا جاؤ
یہ وعدے ہیں کہ باتیں ہیں، یہ فقرے ہیں کہ گھاتیں ہیں

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائیگی

تمہیں جوش، ہم خوب پہچانتے ہیں، تمہاری بلا نوشیاں جانتے ہیں
کہاں تم، کہاں پارسائی کا جامہ، کبھی ہم نے ایسا دکھاوا نہ دیکھا

جنابِ شیخ کی میراث اس میں چل نہیں سکتی
ابھی تو گلشنِ جنت کے ہم حقدار بیٹھے ہیں

کوئی پتھر نہ پڑے غیب سے، اے حضرتِ جوش
آپ نکلے تو ہیں آئینۂ دعویٰ لے کر

میرے نغمے سن کے بتخانے کی ہر مورت ہے مست
پھول برساتے ہیں مجھ پر سینکڑوں پتھر کے ہاتھ

راحت میں جو گزرے، وہ زمانہ اچھا
غم کا جانا، خوشی کا آنا اچھا
لیکن دلِ مضطر کا ہے عالم ہی کچھ اور
آنا اچھا، نہ اس کا جانا اچھا

کیف مرادآبادی، متین الحق (قاضی)

یوم جمعہ ۲۴ مئی ۱۹۰۷ء مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی منظہرالحق عمائد خطّہ میں سے تھے۔ خاندان میں علم کی روایت قدیم سے چلی آرہی تھی۔ مشہور صحافی اور ادیب قاضی عبدالغفار (ف جنوری ۱۹۵۶ء) جو تقسیم ملک کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سکریٹری بنے، ان کے چچا تھے؛ قاضی جلال الدین (علیگڈھ مسلم یونیورسٹی) ان کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ اس ماحول میں قدرتاً ان کی تعلیم پر مناسب توجہ ہوئی۔ نجی طور پر ابتدائی اور قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھوپال سے ہائی اسکول کی سندلی اور پھر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۲۹ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے، تو اب کسب معاش کا مسئلہ پیش آیا۔ بلند شہر پہنچے اور وہاں سرکاری گزٹ کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۳ء تک رہے۔ اس کے بعد بیشتر زمانہ صحافت میں گزرا۔ چنانچہ وہ مختلف اوقات میں ماہنامہ ایشیا، میرٹھ؛ روزنامہ جنگ، دلی؛ ہفت روزہ نگارخانہ، دلی؛ ماہنامہ مشہور، دلی کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔

وہ نثر میں بھی مقالات، افسانے، انشائیے، سب کچھ لکھتے رہے۔ نظم میں مختلف اصناف سخن سے مزاولت رہی۔ کسی سے اصلاح کا تعلق نہیں رہا؛ خود ہی کہا، خود ہی اپنے ذوق کی رہنمائی میں اس پر اصلاح کرلی۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں مجموعۂ کلام شائع نہ ہو سکا۔ ان کی وفات سے سال بھر پہلے ۱۹۷۵ء میں ان کے شاگردوں نے "بزم کیف" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اسی ادارے سے ان کو رحلت کے بعد ان کے شاگردوں

ماخذ: خطوط جناب محمد عزیز حسن، مرادآباد

کیفی کے مرتبہ قطعات "کیا دیکھا ، کیا سمجھا" کے عنوان سے شائع ہوئے۔
کیف مرحوم کی شادی قاضی احمدالدین انسپکٹر پولیس (بجنور) کی صاحبزادی انیسہ خاتون سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے چار لڑکیاں (نسیم فاطمہ ، فاخرہ ، شاہدہ ، راشدہ) اور لڑکا تسکین الحق ہوئے۔ فاخرہ کے سوائے سب لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے تسکین الحق پہلے کمپاؤنڈر تھے ؛ اب انھوں نے اپنا مطب قائم کر لیا ہے۔
کیف کی وفات اچانک ہوئی۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کی شام کو ان پر دفعتاً قلب کا شدید دورہ پڑا۔ علاج معالجہ ہونا ہی چاہیے تھا، لیکن پوری کوشش کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا۔ وہ ۲۸ جنوری کے ابتدائی وقت میں راہی ملکِ بقا ہو گئے۔ ان کے مسکن دلال باغ سے متصل کوئی نصف فرلانگ پر قبرستان ہے، وہیں دفن ہوئے۔
کیف کا دیوانِ غزلیات آج تک شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں چند شعر بطورِ نمونہ درج ہیں، جو جناب محمد عزیز حسن، مرادآباد نے عنایت فرمائے ہیں:

مرنا نہیں فرض عاشقی میں — جینے سے بھی کام ہو رہا ہے
اب چاہے کسی سے گفتگو ہو — ان ہی سے کلام ہو رہا ہے
ذلت نہیں راہِ دوست میں کیفؔ — تاروں پہ خرام ہو رہا ہے

یہ حالت ہے کہ برسوں ہو گئے نوبت نہیں آتی
ذرا سی بات کہنا چاہتا ہوں مضطرب دل سے

اظہارِ محبت کا کیا ذکر محبت میں — احساس محبت بھی اک لغزش پنہاں ہے
یہ فرقِ ہوس پرور رندوں نے کیا ورنہ — ساقی کے لیے کوئی کافر، نہ مسلماں ہے

خیال ان کا کسے نہیں ہے ، جمال ان کا کہاں نہیں ہے
مگر نظام عمل تو دیکھو ، کہیں کوئی رازداں نہیں ہے

مری طلب سے ہے سارا عالم ، تو میں کسی سے طلب کروں کیا !
غبار کو کارواں سے سمجھو ، غبار سے کارواں نہیں ہے

جنونِ غم کم نہیں ہے اب بھی، جنونِ اظہار کم ہے یعنی
جب آگ کم تھی دھواں بہت تھا، اب آگ ہے اور دھواں نہیں ہے

یہ انساں اور یوں تنظیم کرتا بزمِ امکاں کی
کرم دردِ محبت کا، نوازش ذوقِ عرفاں کی
بس اتنی سی خطا پر خاک میں ملنا پڑا گل کو
کہ بیرونِ گلستاں لے گیا باتیں گلستاں کی

بنانے کو یوں داستانیں بنا لو
یہی چشمِ تر ہے، یہی آستیں ہے
حقیقت میں دیکھیں بھی کیا، اہلِ ظاہر
نگاہیں کہیں ہیں، تجلّی کہیں ہے

جھکی ہوئی ہیں جبینیں جہاں ملائک کی
وہیں کی خاک سے اُٹھا ہوا غبار ہوں میں
جہاں نہیں ہے تلوّن، وہاں حیات کہاں!
یہ میرا رازِ بقا ہے کہ بیقرار ہوں میں

فریبِ رنگ و بو دیتا ہے ہر نقشِ جہاں مجھ کو
ارے توبہ تری آواز لے آئی کہاں مجھ کو
شکستِ قطرہ، رازِ قوتِ دریا ہے، اے غافل!
فنا دیتی ہے پیغامِ حیاتِ جاوداں مجھ کو

دل غم سے بھی بیزار ہے، معلوم نہیں کیوں
یہ عیش بھی اب بار سا ہے، معلوم نہیں کیوں
ساقی! تری دانست میں اب خواہشِ مے بھی
کم ظرفیِ میخوار ہے، معلوم نہیں کیوں
وہ عشق، جو ہر جلوۂ رنگیں پہ فدا تھا
خود اپنا طلبگار ہے، معلوم نہیں کیوں
کچھ روز سے وہ کیف، جو اک گوشہ نشیں تھا
رسوا سرِ بازار ہے، معلوم نہیں کیوں

عمل کیسا، عمل کی آرزو بھی بار ہو جائے
نہ ہو دیوانگی، تو زندگی دشوار ہو جائے
محبت میں مسرت بھی ہے، وسعت بھی عظمت بھی
مگر انسان پابندِ رضائے یار ہو جائے

ہزاروں غفلتوں پر رونق کون و مکاں یہ ہے
نہ جانے کیا کرے انساں، اگر بیدار ہو جائے
سلامت ذوقِ غم، حسنِ تصوّر، شوقِ بیتابی
کہ جس محفل میں جائے، جلوہ گاہِ یار ہو جائے

کیف مرحوم کے قطعات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے طبیعت

مضمون آفریں اور نگاہ فکر انگیز پائی تھی۔ ان کے قطعات میں یہ رجحان بہت نمایاں ہے۔

چند قطعات ملاحظہ ہوں:

چاہے کچھ بھی ہو کسی حال سے مایوس نہ ہو — شدتِ غم کا کسی وقت اثر بھی ہوگا
یوں نہ گھبرا اُو شبِ ہجر کی تاریکی سے — یہ اندھیرا ہی کبھی نورِ سحر بھی ہوگا

مآلِ زیست ہے کیا، حالِ زیست کچھ بھی نہیں — یہ سوچ وہ ہے کہ جس سے جنوں لرزتا ہے
میں جانتا تو ہوں جینا کچھ اور دن لیکن — دل اس خیال سے اب جانے کیوں لرزتا ہے

ہمیں تو کام محبت سے ہے، یہ فکر نہیں — کہ اس جنونِ محبت کی انتہا کیا ہے
بنا لیا ہے ترے غم کو مدعائے حیات — یہ کون سوچے ترے غم کا مدعا کیا ہے

سوچتا ہوں کہ کروں کیا، جو محبت نہ کروں — اور غم تو مری فطرت کو گوارا بھی نہیں
غمِ جاناں سے کبھی دل تو بہل جاتا ہے — غمِ دنیا کا تو اتنا سا سہارا بھی نہیں

کہاں کے انجم و خورشید، کیسے لالہ و گل — جمال ذروں میں، پتوں میں تازگی نہ رہی
بس ان کے جاتے ہی ارض و سماں کو دیکھا تو — یہ کیا ہوا کہ کہیں بھی تو روشنی نہ رہی

قدم قدم پہ ہیں اشجارِ باغِ عالم میں — تمھیں کسی کا نہ سایہ ملا، تو کس کا قصور!
ہر ایک سے تمھیں بیگانگی، ہر اک سے گریز — تمھارے سامنے آیا نہ ہو تمھارا غرور!

سحر اک موجِ دریا، سوئے ساحل — چلی کہتی ہوئی کس بیکسی سے
کہ ہے گر زندگانی نقش بر آب — تو موت اچھی ہے ایسی زندگی سے

پھول پر بھی اثرِ جبرِ مشیت ہے، مگر — نہ لبوں پر کبھی شکوہ ہے، نہ گھبراتا ہے
سینہ بھی چاک ہے، دامن بھی ہے ٹکڑے ٹکڑے — پھر بھی جب دیکھیے، ہنستا ہی نظر آتا ہے

دیکھنا ان کے پرستاروں کا اندازِ حیات — ہر تعین سے گزر جاتے ہیں ہنستے بولتے
ترکِ عیش و ترکِ غم، ترکِ تمنا، ترکِ ترک — کیسے کیسے کام کر جاتے ہیں ہنستے بولتے

گزر جا، کتنی ہی رنگیں ہو منزل — ٹھہرنا سدِّ راہِ ارتقا ہے
حریمِ عرش کے پردے اٹھا، کیف! — ستاروں میں کہاں الجھا ہوا ہے

شفیق کوٹی، شفیق اللہ خان

یوپی کے ضلع فتح پور میں ایک جگہ کوٹ ہے (یہ ریاست کوٹہ سے الگ مقام ہے)
وہیں ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد شہاب الدین محمد غوری کے
ساتھ کابل سے آئے اور کوٹ میں بس گئے تھے۔ سپہگری اور بعد کو زمینداری خاندانی
پیشہ رہا۔ چنانچہ شفیق کے والد منشی علی شیر خان بھی زمیندار تھے؛ نانا خان بہادر احمد
بخش آگرہ ہائی کورٹ میں وکیل تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں کئی انگریزوں
کی جان بچائی تھی؛ اس کے انعام میں مورد الطاف سرکار رہے۔ کامیاب زندگی بسر
کرنے کے بعد انھوں نے آخری حصۂ عمر اپنے وطن میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا جب
وہ آگرہ سے اپنے وطن کوٹ جانے والے تھے، انھوں نے آگرے کا مکان ایک
دوست کو تحفۃً دے دیا اور خود کوٹ پہنچ کر عبادت الٰہی میں لگ گئے۔

شفیق کی تعلیم و تربیت ان کے ماموں منشی فضل علی ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہوئی۔ ماموں کے اپنی
کوئی اولاد نہیں تھی؛ انھوں نے شفیق کو اپنے بیٹے کی طرح پرورش کیا۔ مختلف اسکولوں میں تعلیم
پانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ٹکنیکل اسکول، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا، اور تین سال بعد
وہاں سے سند کامیابی حاصل کر کے محکمۂ زراعت کے انجینیری شعبے میں ملازمت کر لی۔ پاکستان
بننے پر ہجرت کر کے وہاں چلے گئے۔ وہاں بھی اسی محکمہ سے منسلک رہے۔ بتدریج ترقی کر
کے محکمۂ سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ لاہور میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف انسپکشن کے عہدے
تک پہنچے، اور غالباً وہیں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

شاعری کا شوق زمانۂ قیام لکھنؤ کا ثمرہ تھا، اگرچہ اسے کبھی ہمہ وقتی علت نہیں

ماخذ: ماہنامہ شاعر (آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۷ء)؛ شعرستان: تذکرہ شعرائے پاکستان (مرتبہ نعمان تاثیر و مظہر صدیقی)؛
شفیق خواجہ، کراچی۔

بننے دیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کلام پر اصلاح سیماب اکبرآبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) سے لی۔ بدھوار ۱۱ فروری ۱۹۷۶ء لاہور میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام میں چند شعر پیش ہیں۔ افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ چند اشعار بعض رسائل سے لیے گئے ہیں۔ کلام پختہ اور بے عیب ہے:

کوئی تڑپا، تو یہ محسوس ہوا
ظلم مجھ پر ہی ہوا ہو جیسے
اجنبی شہر میں کیا قدر، شفیق!
پھول جنگل میں کھلا ہو جیسے

مرے نصیب میں بربادیاں یونہی تو نہیں
کسی کا اس میں اشارہ دکھائی دیتا ہے
تصورات کی دنیا عجیب شے ہے، شفیق!
بحدِ شوق نظارہ دکھائی دیتا ہے

مٹ گئے سیکڑوں اصنام، شفیق!
جو خدا تھا، وہ خدا ہے اب تک

درد نے اُٹھ کے مجھے ایسا بٹھا رکھا ہے
حشر کیا اُٹھیگا، اب حشر میں کیا رکھا ہے
ابر اٹھا ہے، فضا نم ہے، ہوائیں مدہوش
شورِ جنگل میں پپیہے نے مچا رکھا ہے
میری آنکھوں کو نہ دیکھو، مرے دل کو دیکھو
تیری تصویر کو شیشے میں سجا رکھا ہے

اس احتیاطِ رازِ محبت کے میں نثار
لیتے ہیں میرا نام، مگر کم، بہت ہی کم
جن راستوں کے موڑ پہ ہوں بیوفائیاں
ان راستوں سے ہم سے گزر کم، بہت ہی کم
ساقی کی کم نگاہی سے دل بجھ گیا مرا
ہوتا ہے میکدے میں گزر کم، بہت ہی کم

سرِ مژگان جو ستارے ہیں
زندگی کے یہی سہارے ہیں

وقت کا سیلِ رواں، ہجر کا پابند نہیں
میں جیوں یا نہ جیوں، رات گزر جائیگی
شورشِ ہجر عبارت ہے قیامِ غم سے
دل کا ہو جائیگا خوں، رات گزر جائیگی

سامنے تم بھی جو آجاؤ، نہ دیکھے تم کو
اور ہی رنگ ہے اب چشمِ تماشائی کا

طعنہ زن غیر ہیں دریوزہ گری پر اپنی
دورِ تخریبِ گلستاں نہیں دیکھا جاتا
ان کو اب اپنی جفاؤں کا ہے احساس، مگر
حسن کو سربگریباں نہیں دیکھا جاتا

بزم میں ان کی، میں کیا عرض تمنا کرتا
دل کے جذبات تو آنکھوں سے بیاں ہوتے ہیں

تری نگاہ، ترا حسن، تری رعنائی
یہ رنگ و بو تو ہیں، لیکن یہ رنگ و بو کیا ہے

یہ مسکراتی ہوئی چشم کی فسوں کاری
بغیر نطق یہ اعجازِ گفتگو کیا ہے

تمہاری مست نگاہی کے سامنے اے دوست!
سرورِ جام ہے کیا؟ مینا و سبو کیا ہے

تمہاری راہ میں گم ہو کے، یہ ہوا معلوم
تمہاری راہ میں منزل کی جستجو کیا ہے

اس طرح گزرتی ہے میری زندگی تنہا
ہو خزاں کی راتوں میں جیسے چاندنی تنہا

جو بہار بھی تنہا، شاخسار بھی تنہا
تم نہیں، تو گلشن میں ہے کلی کلی تنہا

یہ ترے تصوّر کی ہے طلسم آرائی
ہو گئے ہیں محفل میں ہم کبھی کبھی تنہا

دنیا تو، شفیق! ایسی کی ایسی ہی رہے گی
اس بزم سے اُٹھ جائیے، دل پر جو گراں ہو

دنیا کا بھی غم ہے مجھے عقبیٰ کا بھی غم ہے
سب کچھ ہے، مگر پھر بھی تری یاد سے کم ہے

پروانہ بھٹک جائے جو اب بھی، تو ستم ہے
جو شمع کلیسا ہے، وہی شمع حرم ہے

یہ نقش جو رہِ الفت میں پائے جاتے ہیں
قدم ہی سے نہیں، سر سے بنائے جاتے ہیں

میں کسی پھول کو چھولوں، تو بنے سوکھ کے خار
تم بھی کانٹے جو اٹھا لو، تو گلستاں ہو جائے

پہلے جاں دینے کی رسوائی سے گھبراتے تھے
اب جیتے جانے کے الزام سے ڈر لگتا ہے

کس سے کہوں کہ میرا نشیمن اجڑ گیا
کس کو نہیں یہ رنج پریشاں کیے ہوئے

تھا تری راہ میں کعبہ بھی، صنم خانہ بھی
ہم اُدھر سے کبھی گذرے، نہ اِدھر سے گذرے

ہم نے اے دوست! نگاہوں ہی سے کھائے ہیں فریب
اپنا کہیے کسے، اور کس کو پرایا کہیے!

کشفی ملتانی، فقیر اللہ بخش

ضلع ملتان (پاکستان) کی فقر و تصوف کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہاں کے قریے قریے اور چپے چپے پر کسی صاحبِ دل یا ولی اللہ کا مزار یا خانقاہ ہے۔ اسی زمرے کے ایک بزرگ سید عبدالوہاب عرف "دین پناہ" تھے۔ انھوں نے ضلع ملتان کے قریب مظفر گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی، جس سے یہ جگہ ان کے عرف کے باعث "تکیہ دین پناہ" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ انھیں سید عبدالوہاب کے اخلاف میں اللہ بخش تھے، جو تکیہ دین پناہ میں ۱۵ جون ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے؛ اسی لیے بعض لوگ ان کے نام کے ساتھ پیرزادہ بھی لکھتے تھے۔ سید عبدالوہاب سے نسبت کے باعث خود انھوں نے اپنے نام میں "فقیر" کا اضافہ کر لیا تھا، جو گویا ان کے علم کا حصہ بن گیا۔ کبھی کبھی اسی تعلق سے "قلندر دین پناہی" کے قلمی نام سے بھی لکھتے تھے، ایک آدھ جگہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اظہارِ عقیدت کے لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "اسدی" بھی لکھا ہے۔ لیکن عام طور پر وہ "کشفی ملتانی" ہی کے نام سے معروف تھے۔

تعلیم بوجوہ محدود رہی۔ اس زمانے میں ان اطراف میں تعلیم و تدریس کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ گھر کے حالات بھی ایسے نہیں تھے کہ کہیں دور دراز جا کر تعلیم حاصل کر سکیں۔ ہشتم دسویں درجے کی سند ڈیرہ غازی خان کے اسکول سے ۱۹۲۱ء میں حاصل کی، اور اسی سال اسلامیہ اسکول انارکلی لاہور میں تیس روپے مشاہرے پر ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد دورانِ ملازمت ہی میں پڑھانے کا کورس پورا کر کے ۱۹۲۸ء میں ایس وی (ٹیچرز ٹریننگ) کی سند لے لی اور اب کسبِ معاش کے لیے مستقلاً معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چند گورنمنٹ دستکاری اسکول، ملتان میں بھی پڑھایا۔ قصہ کوتاہ، بالآخر ۱۹۴۴ء میں قبل از وقت پنشن

ماخذ: شجر سایہ دار صحرا کا (طاہر تونسوی)؛ شفیق خواجہ، کراچی

لے کر اپنے وطن مظفر گڑھ چلے گئے، اور یہاں سیاست و صحافت میں دلچسپی لینے لگے۔
صحافت سے انھیں طالب علمی سے شغف تھا۔ ایس وی کی تعلیم کے زمانے میں، نارمل اسکول کے ماہانہ جریدے "نخلستان" کے ادارۂ تحریر میں کام کرتے رہے۔ وہ اور بھی کئی جریدوں سے "بلیک ایڈیٹر" کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۲۷ء میں ملتان ہی سے انھوں نے "ساقی" اور ۱۹۳۳ء میں "ملتان پنچ" نام کے دو پرچے خود بھی جاری کیے تھے۔ وہاں کے پرچے "باغ و بہار" سے بھی کچھ تعلق تھا۔
جب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے، تو اوائل ۱۹۴۸ء میں ایک دستی پریس قائم کیا۔ (یہ چھاپہ خانہ اب ان کے صاحبزادے جاوید کشفی چلا رہے ہیں) ۱۹۵۱ء میں یہیں سے انھوں نے اپنا ہفتہ وار "بشارت" جاری کیا جسے وہ آخر تک شائع کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد یہ اب ان کے بیٹے جاوید کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ ان کی وفات طویل علالت کے بعد ہفتے کے دن ۲۱ فروری ۱۹۷۶ء سہ پہر کو مظفر گڑھ میں ہوئی۔ میت دائرہ دین پناہ (تحصیل کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ) گئی، جہاں اگلے دن اتوار (۲۲ فروری ۱۹۷۶ء) خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔
انھوں نے بہت کمسنی میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے کچھ دن تخلص تبلا کیا؛ بعد کو ایک خواب کی بنا پر اسے کشفی سے بدل دیا۔ آغاز میں چندے مشورہ فخر الدین ناطق جالندھری سے رہا، لیکن کسی وجہ سے یہ سلسلہ جلد ہی منقطع ہو گیا۔ پھر عمر بھر کسی کی باقاعدہ شاگردی اختیار نہیں کی۔ اگر کبھی ضرورت محسوس کرتے، تو اپنے بڑے بھائی غلام حسین نفر سے اپنی مشکلات حل کر لیتے۔ شروع کے زمانے میں منجملہ اور اصحاب کے شاید راجہ عبد اللہ نیاز اور محمد اسد خان اسد ملتانی (اف: نومبر ۱۹۵۹ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔
ان کی پہلی غزل ۱۹۱۹ء میں مدینہ، بجنور میں چھپی، جب وہ نویں درجے کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں "شباب اردو" (ماہنامہ) لاہور کی بہت شہرت تھی، اس میں بھی ان کا کلام باقاعدہ چھپتا رہا۔ افسوس کہ ان کا کلام جمع ہو کر شائع نہ ہو سکا۔ کتابی شکل میں خواجہ غلام فرید کی کافیوں کے مختصر انتخاب کا منظوم ترجمہ "نغمۂ صحرا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ایک اور کتاب "روح اسلام" شائع ہوئی جس میں واقعاتِ کربلا کی منظوم تاریخ ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں قرآن کا منظوم

ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن اسے مکمّل نہ کر سکے، پانچ پاروں کا ترجمہ ہو گیا تھا، اسے انھوں نے اپنے پرچے "بشارت" میں شائع کر دیا تھا (۱۹۶۵ء) بہت کلامِ نظم و نثر غیر مطبوعہ رہ گیا۔ اس میں دو دیوانِ غزلیات "بیرونِ میکدہ" اور "درونِ میکدہ" کے علاوہ راماین، مہابھارت اور گیتا کے تراجم بھی تھے۔ کلام صاف ستھرا، بے عیب اور برجستہ ہے۔ پڑھتے بھی خوب تھے۔ مشاعروں میں ہمیشہ کامیاب رہے، خود بھی مشاعرے کرتے رہتے تھے۔

کہنا تھا بہت، آپ ان کو نہ چاہیں
اب اٹھتے ہیں نالے نکلتی ہیں آہیں

نہ چاہو، تو کوئی طریقہ نہیں ہے
جو چاہو، تو ملنے کی ہیں لاکھ راہیں

فقیروں کے تکیے ہیں شاید سکوں ہو
امیروں کی تو دیکھ لیں بارگاہیں

جسے تو نے ٹھکرا دیا اپنے در سے
نہیں دیں زمانے نے اس کو پناہیں

چلو، ہم بھی، کشفی! زیارت تو کر لیں
سنا ہے کہ آباد ہیں خانقاہیں

لکھ لکھ کے جتنے گیت سناتا رہا ہوں میں
موضوعِ شعر تجھ کو بناتا رہا ہوں میں

پُر نور دل رہا ترے ذکرِ جمیل سے
شمعِ حرم سے شمع جلاتا رہا ہوں میں

شاباش دو کہ کی تو ہے تکمیل عشق کی
ہر چند اپنے کام سے جاتا رہا ہوں میں

شور ہے ہر طرف: سحاب سحاب
ساقیا! ساقیا! شراب، شراب

آبِ حیواں کو مے سے کیا نسبت!
پانی پانی ہے، اور شراب، شراب

رند بخشے گئے قیامت میں
شیخ کہتا رہا: حساب، حساب

اک وہی مست باخبر نکلا
جس کو کہتے تھے سب: خراب، خراب

جام گرنے لگا، تو بہکا شیخ
تھامنا، تھامنا: کتاب، کتاب

میں مانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا
ترا خیال مگر دل سے جا نہیں سکتا

خبر نہیں ترے جلووں نے کیا طلسم کیا
مری نظر میں کوئی اب سما نہیں سکتا

میں کر رہا ہوں فقط تجربہ محبت کا
اب ایسی آگ لگی ہے، بجھا نہیں سکتا

اس احتیاط سے کشفی کہ راز فاش نہ ہو
میں رو تو سکتا ہوں، آنسو بہا نہیں سکتا

جھوٹی ہے کہ سچّی، تری ہر بات برابر
اِس پر بھی یقیں ہے مجھے، اُس پر بھی یقیں ہے

تھک تھک کے تری راہ میں یوں بیٹھ گیا ہوں — جس طرح کہ اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا
ہر بوند لہو کی کبھی بنتی نہیں آنسو — جس طرح کہ ہر قطرہ گُہر ہو نہیں سکتا

زاہد تو رند، رند کہیں پارسا مجھے — کیا جانے، آپ لوگ سمجھتے ہیں کیا مجھے
آیا نہ اُس کو میری محبت پہ اعتبار — حالاں کہ آزما بھی چکا بار ہا مجھے
حاصل ہوئی ہے اس بُتِ کافر سے مل کے آج — اتنی خوشی کہ مل نہ گیا ہو خدا مجھے

لغزشیں ہو گئیں مجھ سے، تو چلو جانے دو — میں خطا کار سہی، کوئی فرشتہ تو نہیں
یار! کشفی کے سمجھنے کی ذرا کوشش کر — تو جسے ایسا سمجھتا ہے، وہ ایسا تو نہیں

روشنی کے دیکھنے کو دل کی آنکھیں چاہییں — مہر و مہ دیکھے ہیں تو نے، روشنی دیکھی نہیں

صرفِ حرم کبھی، تو کبھی رہنِ میکدہ — پگڑی جنابِ شیخ کی دیکھی کہاں کہاں

• فکرِ دنیا، رنجِ ماضی اور غمِ تدبیرِ حال — ہائے کتنا چار دن کے میہماں پر بوجھ ہے
مفت کی پینے کی لت ایسی پڑی ہے شیخ کو — اب سراپا حضرتِ پیرِ مغاں پر بوجھ ہے

حسن کہتے ہیں جسے شمع کا ہے سوز و گداز — عشق کہتے ہیں جسے جرأتِ پروانہ ہے

ساغر کے عوض ایماں، ایماں کے عوض ساغر — کیا شیخ نے بیچا ہے، کیا میں نے خریدا ہے

جب طبیعت جوان ہوتی ہے — دل میں کیف و سرور ہوتا ہے

ناصح کی باتیں اچھی ہیں، لیکن — کب مانتا ہوں حضرت کی باتیں

ہائے، مجبوریِ الفت کہ بوقتِ دیدار — دیکھ لیتا ہوں، کوئی دیکھنے والا تو نہیں
میرا پوچھا جو کسی نے، تو جھجک کر بولے — نام ہم نے بھی سُنا ہے، کبھی دیکھا تو نہیں

آنے لگی تھی اس کی جبیں پر ذرا شکن — اظہارِ عشق کر کے مُکرنا پڑا مجھے
جنت کی آرزو کہیں دل میں چھپی نہ ہو — کرتے ہوئے گناہ جو ڈرنا پڑا مجھے
سن آئے ہیں، لو حضرتِ واعظ کا بھی ہم وعظ — جس طرح کہ سویا ہوا، سوتوں کو پکارے
دن فکر میں، شب فکر کے بہلانے میں گذری — اس طرح بھی کچھ زیست کے ایام گزارے
جس طرح کہ منزل کا مسافر کو یقیں ہے — بیٹھا ہوں تری راہ میں یوں پاؤں پسارے

شہاب مالیرکوٹلوی، مہر محمد خان (مولانا)

قوم کے شروانی پٹھان تھے۔ بہلول لودھی کے زمانے (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۹ء) میں ان کے مورثِ اعلیٰ صدر الدین (صدر جہان) درابن سے نقلِ مکان کر کے ہندستان آئے۔ روایت تو یہ ہے کہ ان کی صورت اور سیرت کے محاسن سے متاثر ہو کر بادشاہ نے اپنی ایک بیٹی (تاج مرصع) ان کے عقدِ نکاح میں دے دی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھیں ایک وسیع علاقہ جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ یہی جاگیر بعد کو مالیرکوٹلہ ریاست کہلائی۔ اس کا ایک حصہ مستقل ریاست کی شکل میں قائم رہا، اور بقیہ اخوان و برادران میں تقسیم ہوتا چلا گیا، اس کا ایک حصہ مولانا شہاب مرحوم کے گھرانے کو بھی ترکے میں ملا۔ یہ صورتِ حال ریاست کے انضمام تک قائم رہی۔

مولانا شہاب کے خاندان کا ذریعۂ معاش یہ جاگیر تھی، یا فوج میں ملازمت۔ ان کے والد فضل محمد خان (ف ۱۹۳۲ء) اور دادا رکن الدین خان بھی مدۃ العمر فوج میں ملازم رہے۔ اس پیشے میں زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں تھی، معمولی نوشت و خواند روزمرّہ کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔ البتہ ان اصحاب کی دین و دنیا کی (خاص طور پر دین کی) معلومات بہت وسیع تھیں، اور وہ دینی اور اخلاقی قواعد و ضوابط کے سختی سے پابند تھے۔

شہاب صاحب ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء - ۱۸۹۳ء) میں مالیرکوٹلہ میں پیدا ہوئے؛ مہینا اور ٹھیک دن خود انھیں بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ان سے چھوٹی صرف ایک بہن تھیں۔ ان کا نام مہر محمد خان ان کے والد کا رکھا ہوا ہے لیکن

مآخذ: خود نوشت سوانح عمری (قلمی)؛ حبیب احمد خان (دلبر مرحوم)؛ ذاتی معلومات

ان کے ماموں مولانا محمّد نواب خان ثاقب نے ان کا تاریخی نام "سرفراز علی خان" رکھا تھا، جو مشہور نہ ہوا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ممکن ہے، بعض لوگ یہ خیال کرتے کہ "سر" کا جزو حکومت انگریزی کی طرف سے خطاب ہے۔

ان کے یہ ماموں مولانا محمّد نواب خان ثاقب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ان کے والد (یعنی شہاب صاحب کے نانا) قادر بخش خان بڑی شان و شوکت اور دبدبے کے مالک تھے۔ کچھ ایسے زیادہ تعلیمیافتہ تو نہیں تھے، لیکن علما اور صلحا کی صحبت کے بہت دلدادہ اور متدین طبیعت کے آدمی تھے۔ انھوں نے بیٹے (محمد نواب خان) کو عربی اور فارسی کی اچھی تعلیم دلوائی۔ محمّد نواب خان نے پہلے قدیم اورنٹیل کالج، لاہور سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحان پاس کیے، جو اس زمانے میں ان علوم کی معراج خیال کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد عربی کی تکمیل دیوبندی عالم پیرجی محمد صدّیق انیٹھوی، مفتیِ مالیر کوٹلہ سے کی۔ طب میں مولانا حکیم نورالدین بھیروی (خلیفۂ اول میرزا غلام احمد قادیانی مرحوم) کے شاگرد تھے۔ شعر بھی کہتے اور ثاقب تخلص کرتے تھے؛ اس میں زانوے تلمذ حکیم ضامن علی جلال لکھنوی (ف: ستمبر ۱۹۰۹ء) کے سامنے تہ کیا؛ اور یہ خط و کتابت سے نہیں، بلکہ وہ لکھنؤ گئے اور ایک اشرفی اور ایک رباعی استاد کی خدمت میں نذر پیش کی اور باقاعدہ شاگردی اختیار کی۔ خطاطی لاہور کے مشہور خوشنویس استادِ عصر حافظ نور احمد سے سیکھی۔ غرض بڑے صاحبِ صلاحیّت اور ہرفن مولا شخص تھے۔ زندگی ریاست کے ہائی اسکول میں اردو فارسی کی صدر مدرسی سے شروع کی اور ترقی کرتے کرتے نظامت اور عدالت کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔ نواب احمد علی خان والیِ مالیر کوٹلہ فنِ شعر میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔[۵]

شہاب صاحب کی بیشتر تعلیم نجی طور پر ہوئی۔ چندے اسکول میں بھی پڑھے، لیکن دسویں درجے تک نہیں پہنچے تھے کہ یہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہوگیا۔ بیکار آدمی

[۵] اس سلسلے میں خمخانۂ جاوید (۲: ۱۷۸) کی روایت ٹھیک نہیں ہے

شیطان کا چرخا۔ ماموں نے اس اندیشے سے کہ کہیں لڑکا گمراہ نہ ہو جائے، انھیں قادیان پہنچا دیا کہ وہاں علم بھی حاصل کرے اور وہاں کے اخباروں، رسالوں میں کام کر کے کچھ تجربہ بھی پائے، جو آیندہ زندگی میں مفید ثابت ہو۔

محمد نواب خان بلحاظ عقیدہ احمدی تھے، جس زمانے میں انھوں نے حکیم مولانا نورالدین مرحوم سے طب کی تعلیم پائی تھی، موصوف کے علم و تقویٰ واخلاق سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اب دیکھیے حسن اتفاق کا ایک کرشمہ! شہاب صاحب کی والدہ ان کے بچپن میں رحلت کر گئی تھیں۔ اس کے بعد ان کی بڑی خالہ نے انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا؛ ان کی اپنی اولاد صرف ایک بیٹی تھی، جو خاندان ہی کے ایک شخص محمد امراؤ علی خان سے منسوب تھیں۔ خان صاحب موصوف، نواب محمد علی خان رئیس مالیر کوٹلہ کے حقیقی ماموں تھے۔ نواب صاحب کی شادی میرزا غلام احمد قادیانی مرحوم (ف: مئی ۱۹۰۸ء) کی بڑی صاحبزادی مبارکہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے قادیان میں اپنی کوٹھی تعمیر کرا کے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ نواب صاحب موصوف کے ماموں محمد امراؤ علی خان بھی انھیں کے ساتھ رہتے تھے۔ شہاب صاحب قادیان پہنچے، تو اپنی خالہ کے تعلق سے یہ بھی محمد امراؤ علی خان کے ہاں مقیم ہو گئے۔ نواب صاحب مرحوم نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا؛ اور چونکہ یہ تعلیم کی غرض سے وہاں گئے تھے، انھیں اپنے استاد مولانا حافظ روشن علی کے سپرد کر دیا۔ مزید یہ کہ اپنا قیمتی کتابخانہ بھی ان کی تحویل میں دے دیا۔

اس عہد میں کئی چوٹی کے عالم قادیان میں جمع ہو گئے تھے۔ مولانا میر محمد اسحٰق دہلوی، قاضی سید امیر حسین محدث بھیروی، مولانا سید سرور شاہ کاشمیری، مولانا محمد اسمٰعیل فاضل، مولانا غلام رسول راجیکی وغیرہم وہیں مقیم تھے۔ حافظ روشن علی کا بھی اپنے علم و فضل کے باعث انھیں اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ خلیفۂ وقت حکیم مولانا نورالدین خود قرآن اور حدیث کے بڑے وسیع النظر عالم تھے۔ صبح و شام قرآن و حدیث کا

درس ہوتا تھا اور فضا سارا وقت قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گونجتی رہتی تھی۔ حافظ روشن علی کے قرب کی وجہ سے شہاب صاحب بھی بہت جلد ان اعلیٰ حلقوں میں پہنچ گئے اور انھوں نے ان سے پورا استفادہ کیا۔ یہ امر واقع ہے کہ ان کا قرآن اور حدیث کا سارا علم اور شوق اسی زمانے کی دین تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ساری عمر چھوٹے سائز کے قرآن کا ایک نسخہ ہمیشہ ان کی جیب میں رہا، جس سے وہ ضرورت کے وقت حوالہ اور سند پیش کر دیتے تھے۔

اپنے مخصوص حالات کے باعث احمدی جماعت مناظروں اور شاستراتھوں کے میدان میں بھی پیش پیش تھی۔ اس کے لیے قادیان میں خاص تعلیم و تربیت کا انتظام تھا، جس میں دوسرے مذاہب اور عقائد کی بنیادی کتابوں کے وسیع اور گہرے مطالعے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ شہاب صاحب نے اس شعبے میں بھی بہت ترقی کی۔ ہندی سیکھ لی اور جلد ہی اپنی محنت اور ذہانت کے صدقے اچھے مناظر بن گئے۔

میرزا غلام احمد قادیانی مرحوم کے بڑے صاحبزادے میرزا بشیر الدین محمود احمد مرحوم (ف: نومبر ۱۹۶۵ء) نے ۱۹۱۳ء میں الفضل جاری کیا تھا۔ مولانا حکیم نور الدین خلیفہ اول کی وفات پر مارچ ۱۹۱۴ء میں وہی دوسرے خلیفہ بھی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں انھیں الفضل کے لیے ایک ہوشیار اور مستعد معاون کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے نواب محمد علی خان سے درخواست کر کے شہاب صاحب کو اپنے ہاں لے لیا۔ انھوں نے نہ صرف شہاب صاحب کو صحافت کے اصول و قواعد کی تعلیم دی، بلکہ اپنے بیش بہا اور وسیع کتاب خانے سے استفادے کی بھی اجازت دے دی۔ نواب صاحب کا کتاب خانہ پہلے ہی سے ان پر کھلا تھا، اس دوسرے کتاب خانے سے متمتع ہونے کی اجازت مل جانے سے گویا وہ بحرِ علم میں پیراکی کرنے کے قابل ہو گئے۔

شہاب صاحب ۱۹۲۴ء تک ادارۂ الفضل سے منسلک رہے۔ اس سال ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کے نتیجے میں انھیں نہ صرف قادیان کی سکونت ترک کرنا پڑی،

بلکہ احمدیت ہی سے دست بردار ہونا پڑا۔
قادیان میں ایک صاحب کا جو صوبۂ سرحد کے تھے، بہائیت کی طرف میلان ہو گیا۔ ان کا شہاب صاحب کے یہاں بھی آنا جانا تھا، بلکہ دونوں کا اچھا خاصا دوستانہ تھا۔ انھیں کی ترغیب پر شہاب صاحب نے بھی بہائیت کا مطالعہ شروع کیا۔ اگر بات یہیں تک رہتی، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ دوسرے مذاہب و مسالک کا مطالعہ قادیان کے نصاب میں شامل تھا۔ ان دونوں حضرات نے مطالعہ سے تجاوز کر کے لوگوں سے بہاء اللہ کی صداقت اور فضیلت پر بحث کرنا شروع کر دی، حال آں کہ بہاء اللہ کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں؛ وہ اپنے آپ کو "قلمِ اعلیٰ" اور "ظہورِ الٰہی" کہتے ہیں اور ان کے نزدیک قرآن قصۂ ماضی اور شریعتِ منسوخہ کی ذیل میں آتا ہے۔ بعض احباب نے شہاب صاحب اور ان کے رفیق کو متنبہ کیا، لیکن بیکار؛ انھوں نے جوانی کے جوش میں سنی ان سنی کر دی۔ دریا میں رہ کر مگر سے بیر شیوۂ عقلمندی کیونکر ہو سکتا ہے! رفتہ رفتہ حالات ایسی شکل اختیار کر گئے کہ ان حضرات کو قادیان سے نکلنا پڑا۔ اب انھوں نے علانیہ بہائیت قبول کر لی اور اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے ایک ہفتہ وار پرچہ بھی جاری کیا، جس کا نام غالباً "کوکبِ ہند" تھا۔ لیکن یہ سب سرگرمیاں دودھ کا ابال ثابت ہوئیں اور وہ جلد ہی اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارنے کے بعد صراطِ مستقیم پر آ گئے۔
اب مسئلہ روزگار کا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے لاہور میں مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے ماہنامے ادبی دنیا میں کام کیا۔ مولانا تاجور کا لاہور کے مشہور ناشرین عطر چند کپور اینڈ سنز سے بڑا یارانہ تھا۔ اس فرم نے مولانا کی ترغیب پر ۱۹۲۴ء میں ایک ادارہ "اردو مرکز" کے نام سے قائم کیا۔ مقصود یہ تھا کہ اردو ادب کا ایک مبسوط انتخاب تیار کیا جائے، جو اسکولوں اور کالجوں میں بطورِ نصاب استعمال ہو سکے۔ اس کے لیے مطبوعہ ذخیرے کے علاوہ نئے مضامین لکھوانا بھی پروگرام میں شامل تھا۔ چنانچہ مولانا تاجور نے اس

کام کے لیے باہر سے بھی مشہور ادیبوں کو لاہور بلوایا تھا۔ ان میں اصغر گونڈوی، سیماب اکبرآبادی، یاس یگانہ لکھنوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مقامی حضرات میں اختر شیرانی اور شہاب صاحب شامل تھے۔
اردو مرکز کا کام ۱۹۲۶ء میں مکمل ہو گیا۔ شہاب صاحب نے اس کے بعد چندے روزنامہ سیاست، لاہور میں بحیثیت مترجم کام کیا، پھر دلی چلے آئے۔ یہاں سے آگرے گئے۔ سب جگہ کسی نہ کسی اخبار میں کام کیا، لیکن مستقل روزگار کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ ۱۹۲۹ء میں وہ بمبئی پہنچے، اور یہاں نیوایرا اسکول میں فارسی اور ہندی کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ وہ اس عہدے پر رُبع صدی تک متمکن رہے، اور ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔
اس کے بعد انھوں نے طلبہ کو نجی انتظام کے تحت پڑھانے (ٹیوشن) کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت دن تک وہ یہ کام ایک کرایے کے مکان میں کرتے رہے، لیکن دیکھا کہ اس طرح طلبہ کی کافی تعداد مہیا نہیں ہو سکتی، تو وہ طلبہ کے گھروں پر جانے لگے۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔
اگرچہ اپنی خاندانی خصوصیات کے برعکس وہ بہت مختصر جسم کے مالک تھے تاہم تندرستی بالعموم ہمیشہ اچھی رہی، یوں بھی طبیعت باقاعدگی، جفاکشی اور محنت کی عادی تھی، خوراک بہت کم تھی۔ وقت کی پابندی گویا فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ عمر کے تقاضوں سے تو مفر نہیں، لیکن میں نے آخری تیس برسوں میں انھیں مضمحل یا کسی عارضے کا شاکی نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنی روزمرہ کی مصروفیتوں کا جو پروگرام بنا رکھا تھا، گھڑی کی سوئی کی طرح اس پر عمل کرتے تھے۔ گرمی، سردی، برسات، آندھی، طوفان۔ موسم کی کوئی تبدیلی ان پر اثرانداز نہیں ہو سکتی تھی۔
فروری ۱۹۷۶ء کے شروع میں دو تین دن بخار آیا۔ علاج سے ٹھیک تو ہو گئے لیکن ڈاکٹر نے چند دن آرام کی ہدایت کی۔ اس کے بعد پھر اپنے معمولات شروع کر دیے۔ چہارشنبہ ۲۵ فروری ۱۹۷۶ء حسبِ معمول سب کام کیے، سہ پہر پانچ بجے پڑھا کر واپس

آئے۔ جن اصحاب سے ملنا تھا، ان سے ملے؛ جن سے پڑھنے کے لیے کتابیں لائے تھے، یہ انھیں واپس کیں؛ مغرب کی نماز پڑھی؛ کھانا کھایا؛ عشا کی نماز پڑھی؛ نو بجے ریڈیو سے خبریں خاص توجہ سے سنیں کیونکہ اس دن مہاراشٹر کی وزارت میں کچھ تبدیلیاں متوقع تھیں۔ اس کے بعد عام پروگرام سننے لگے۔ بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ گرمی اور گھبراہٹ کی شکایت کی۔ فوراً ڈاکٹر آیا۔ اس نے ہائی بلڈ پریشر تشخیص کیا۔ غرض اللہ اللہ کرتے ساڑھے دس بجے جاں بحق ہو گئے۔ فوری بہانۂ موت دماغ کی شریان پھٹ جانا قرار پایا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُونَ۔ جنازہ اگلے دن (۲۶ فروری) صبح کے وقت اٹھا اور انھیں قبرستان ناریل واڑی میں اسی قبر میں دفن کیا گیا، جس میں ۲۵ برس پہلے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے اقبال مصطفٰے دفن ہوئے تھے۔

شہاب صاحب کے والد فضل محمد خان کے ایک چھوٹے بھائی شیر علی خان تھے جن کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بدقسمتی سے بیٹا کمسنی میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد بڑی بیٹی کی شادی ہوئی اور وہ اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔ ان کے صرف ایک لڑکی تھی۔ شومیِ قسمت سے ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا، اور اس کے تھوڑے دن بعد وہ خود بھی چل بسیں۔ شیر علی خان اور ان کی بیگم (جنّت النسا) نے یتیم نواسی کو اپنی بیٹی کی طرح پرورش کیا۔ شیر علی خان کی چھوٹی بیٹی سردار بیگم کا نکاح شہاب صاحب سے ہوا۔ (یہ گویا ان کی بنتِ عم تھیں) شیر علی خان نے خاصی لمبی عمر پائی؛ ۱۹۶۶ء میں انتقال ہوا۔

شہاب صاحب کی اپنی اولاد چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ سب سے پہلے ایک لڑکا قیامِ آگرہ کے زمانے میں ہوا تھا؛ اس کا نام فیروز بخت تھا۔ لیکن چند مہینے بعد وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دوسرے بیٹے حبیب احمد خان بمبئی کے ایک چھاپے خانے میں کام کرتے ہیں۔ ان سے چھوٹے بھائی احمد مصطفٰے خان مالیر کوٹلہ میں مدرّس ہیں۔ سب سے چھوٹا بھائی اقبال مصطفٰے خان ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی صرف نو سال کی عمر تھی کہ ۱۹۴۱ء میں والدین کو داغِ مفارقت دے گیا۔ بہت ہوشیار اور ذہین اور ہونہار

بچہ تھا، اور انھیں خوبیوں اور صلاحیتوں کے باعث وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔
اس کی جدائی نے والدین کو بہت متاثر کیا۔ شہاب صاحب اسی کی قبر میں دفن ہوئے۔
سب سے چھوٹی بیٹی ہے منیرہ، یہ ایم۔ اے، بی ٹی ہے اور بمبئی ہی کے ایک اسکول
میں فارسی اور ہندی پڑھاتی ہے۔ خدائے کریم ان سب کا حامی و ناصر رہے۔ آمین!
جیسا کہ لکھ چکا ہوں، بچپن میں ان کا ماحول سراسر علمی رہا تھا۔ تعلیم و تربیت بھی تعلیمی
اور صحافتی انداز کی ہوئی۔ قادیان کے زمانہ قیام میں انھوں نے عربی اور فارسی
کے علاوہ ہندی میں بھی پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ جب بمبئی پہنچے، تو یہاں گجراتی
سیکھ لی۔ اگرچہ انگریزی کی تعلیم نامکمل رہ گئی تھی لیکن ذاتی محنت سے، اتنی قابلیت
پیدا کر لی تھی کہ انھیں کتابیں پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔
شعر گوئی کا شوق ہوا، تو ان کے ماموں نے تخلص شہاب تجویز کیا کہ ماموں ثاقب،
بھانجا شہاب۔ قادیان اور لاہور اور دوسرے شہروں میں اخباروں، رسالوں ہی
سے تعلق رہا۔ زمانہ قیام بمبئی میں (۱۹۳۵ء) اپنا ہفتہ دار "جوہر" بھی جاری کیا تھا۔
لیکن یہ چند مہینوں سے زیادہ نہیں چلا۔ پیسہ اخبار، لاہور کے مالک منشی محبوب عالم
(وفات: مئی ۱۹۳۷ء) کی صاحبزادی فاطمہ بیگم اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی میں مقیم تھیں۔
انھوں نے کسی زمانے میں وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار "خاتون" جاری کیا تھا۔
شہاب صاحب کچھ مدت اس کے مدیر بھی رہے۔ ان صحافتی اور اخباری سرگرمیوں
کے باعث وہ تصنیف و تالیف پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ میرے علم میں ان کی
صرف دو کتابیں چھپی ہیں: (۱) بشریت انبیا اور (۲) دین الٰہی اور اس کا پس منظر۔
البتہ مضامین کی بہت بڑی تعداد مختلف رسائل میں منتشر پڑی ہے۔
لیکن کتابوں اور مضامین کی تعداد ثانوی بات ہے۔ بحیثیت انسان ان کا جو بلند مرتبہ
تھا، اس کا اندازہ صرف ان کے ملنے والوں ہی کو ہو سکتا ہے۔ سراسر محبت و رافت،
تواضع و انکسار کا مجسمہ، بردباری و خردنوازی کا پتلا۔ غرض ان کی کون کون سی خوبی
بیان کی جائے۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ۔

جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، اوائل میں انھوں نے شعر بھی کہے اور شہاب تخلص کیا۔ بعد کو شعر گوئی ترک کر دی اور اپنی پوری توجہ نثر نگاری اور درس و تدریس پر مرکوز رکھی۔ ان کے ابتدائی زمانے کے کلام سے بہت تلاش کے بعد دو غزلیں ماہنامہ "ہمایوں" لاہور (شمارہ جولائی ۱۹۲۹ء و نومبر ۱۹۲۹ء) میں ملیں؛ انھیں کو بطورِ نمونہ یہاں درج کر رہا ہوں، تاکہ محفوظ ہو جائیں:

نہ ملا سکونِ خاطر مجھے، عمرِ جاوداں سے
جو ہوا بھی کچھ میسّر تو وہ مرگِ ناگہاں سے

مرے دل میں ہے وہ طوفاں، کہ خدا ہی جانتا ہے
یہ خیال، تو یہ تو ہے کہ بیان ہو زباں سے

اسے ڈھونڈتا ہوں جس کو ہر طور ڈھونڈتے تھے
اسی جستجو میں آیا ہوں مکانِ لامکاں سے

ترے چارہ ساز آئے ترے دلنواز آئے
دلِ مبتلا ٹھہر جا، وہ ہیں تجھ سے بدگماں سے

میں فدائے حسنِ مطلق، ہیں نثارِ حسنِ خوباں
میں شکارِ تیرِ جاناں، جو چھٹا نہیں کماں سے

جو خیال میں نہ آئے، نہ سما سکے نظر میں
اسی ذات کا ہوں شیدا، جو بلند ہے گماں سے

مجھے شعر و شاعری سے نہیں دور کی بھی نسبت
یہ لگی ہوئی ہے دل کی جو نکل گئی زباں سے

میں عمل کو چاہتا ہوں کہ عمل کا شیفتہ ہوں
کہ حیات ہے عمل سے، نہ زبان اور بیاں سے

ترے در پہ آ کے بیٹھا ہے شہاب شعلہ ساماں
وہ اٹھے تو مٹ کے اٹھے ترے سنگِ آستاں سے

بے اختیار چھیڑ دیا ان کو پیار میں
وہ کون ہے کہ جس کے ہو دل اختیار میں

بھر کر نگاہ دیکھنا ان کو مری مجال
"پنہاں تھا آفتاب حجابِ غبار میں" (طرح)

میں جانتا ہوں لذتِ خمرِ وصالِ دوست
یہ کیف وہ نہیں ہے، جو ہے انتظار میں

میں اور بزمِ غیر میں جاؤں، محال ہے
یہ جرم اگر ہوا، تو ہوا شوقِ یار میں

جمعیت و سکونِ دلِ مبتلا گیا
تم کیا گئے کہ جان گئی اضطرار میں

میدانِ شاعری کے نہیں مردِ ہم شہاب!
کچھ بات ہے کہ آ گئے اس کارزار میں

جگر بریلوی، شیام موہن لال

ان کے خاندان کا مسقط الرّاس قنوج تھا۔ جب راجہ نول رائے والیٔ قنوج پر زوال آیا
ر ۱۲ اگست ۱۹۵۰ / ۹ رمضان ۱۱۶۲ھ) تو قنوج کے متعدد کائستھ خاندانوں نے وطن سے
یوطن ہونے ہی میں عافیت دیکھی، جسے جہاں پناہ ملی، وہ وہاں کا ہو رہا۔ انھیں جلاوطنو
یں ایک خاندان بریلی پہنچا، جس کے ایک فرد منشی گوبند رام سکسینہ تھے۔ موصوف
کے خلف اکبر رائے بہادر منشی درگا پرشاد نے بہت نام اور دنیوی مال و منال پیدا
لیا۔ وہ ۱۸۵۵ء میں بعمر ۲۸ سال محکمۂ تعلیم کی ملازمت میں داخل ہوئے اور اپنی کارکردگی
ور فرض شناسی سے پندرہ برس کی قلیل مدّت میں انسپکٹر مدارس کے عہدے تک
نہیے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں وسیع جائداد پیدا کی۔ اس میں زمینداری کے کئی
ا نو، عالیشان مکان، بنگلے، دکانیں وغیرہ بہت کچھ تھا۔ اپنا مطبع بھی قائم کیا تھا۔
غرض رئیسانہ زندگی تھی۔ ان کا ۱۸۹۴ء میں انتقال ہوا۔

منشی درگا پرشاد کے سب سے بڑے بیٹے کنور کنھیا لال تھے۔ جو ۱۸۵۰ء میں پیدا
ہوئے۔ ان کی تعلیم اچھے پیمانے پر ہوئی تھی۔ اپنے والد کی طرح فارسی، اردو کے علاوہ
نگریزی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ وہ بھی محکمۂ تعلیم میں بحیثیت مدرّس شامل ہوئے۔
ندریج ترقی کرکے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے، لیکن بعض خانگی مجبوریوں کے
عث مستعفی ہو کر بریلی چلے آئے، اور اپنے والد (رائے بہادر درگا پرشاد) کی خدمت
و اپنا وظیفۂ حیات بنا لیا، جو اب کبرسنی کے باعث بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ یہ
ی خدمتگزاری اور فرمانبرداری کا نتیجہ تھا کہ رائے بہادر موصوف نے اپنی وفات سے

خذ: خودنوشت سوانح عمری (انگریزی، قلمی)؛ حدیثِ خودی: تحریر، دتی (جگر بریلوی نمبر)، شریمتی جے دیوی،
رٹھ، (بیگم جگر مرحوم)

پہلے وصیت میں اپنی تمام جاداد ان کے نام لکھ دی اور دونوں چھوٹے بیٹوں کے نام صرف رہنے کے مکان اور پچاس روپیہ ماہانہ گزارا مقرر کیا۔ ظاہر ہے کہ جاداد کی یہ تقسیم چھوٹے بھائیوں کو کسی عنوان منظور نہیں ہو سکتی تھی۔ رائے بہادر کی زندگی تک تو وہ خاموش رہے، لیکن ان کے آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ انھوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا حصہ طلب کیا۔ یہ مقدمہ بہت دن تک چلا۔ ابتدائی عدالت نے کنور کنھیا لال کے خلاف فیصلہ دیا۔ ان کی اپیل پر الہ آباد ہائی کورٹ سے ان کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اس پر فریق مخالف نے ولایت میں پریوی کونسل سے رجوع کیا کہ اس وقت یہی سب سے بڑی عدالت تھی۔ وہاں سے ۱۹۰۷ء میں آخری فیصلہ پھر کنور صاحب کے خلاف ہوا۔ لیکن اس دوران میں ساری جاداد خالصے لگ چکی تھی۔ وکیلوں کے گھر بھر گئے اور عدالتی اخراجات کی گرانی نے فریقین کو دیوالیہ بنا دیا۔

بہر حال شکست خوردہ حریف کی حیثیت سے کنور کنھیا لال بالکل تباہ ہو گئے۔ مادّی وسائل تو برباد ہونا ہی تھے، زندگی کی تلخیوں نے تندرستی کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ ۱۹۲۴ء میں بعارضۂ فالج جان بحق ہو گئے۔

رائے کنھیا لال کی شادی بریلی ہی کے ایک مقتدر خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے خسر بزرگوار منشی گنگا پرشاد مقامی کچہری میں صدر ناظر تھے۔ اس بیوی کے بعد انھوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ اور دوسری بیوی سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں۔ جگر صاحب پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور اپنے سگے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ والدین نے نام شیام موہن رکھا تھا، جسے بعد کو خود انھوں نے خفیف سی تبدیلی کر کے شیام موہن لال کر لیا۔ چند سال کی نجی تعلیم کے بعد ۱۹۰۳ء میں ڈبلیو آئی، ایم (Western Inglis Memorial) ہائی اسکول میں داخلہ[۵] لے لیا۔ یہ

---

۵ انگلس ۱۸۶۳ء تک بریلی میں کلکٹر تھا۔ یہ اسکول اسی کے نام پر قائم ہوا تھا۔ بریلی شہر کے

اب تک انٹر کالج کہلاتا ہے۔ یہاں سے ۱۹۱۱ء میں دسویں کی سند لی۔ ان کے بعد بریلی کالج میں پہنچے؛ وہاں سے ۱۹۱۶ء میں بی، اے پاس کیا۔ کالج میں ان کے مضامین انگریزی کے علاوہ فارسی اور فلسفہ تھے۔ بریلی میں بی، اے کے بعد تعلیم جاری رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور گھر کے جو حالات تھے، وہ کہیں باہر جاکر مزید تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ فوراً کوئی ملازمت تلاش کریں، جس سے گھر والوں کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔

سب سے پہلے مقامی مشن اسکول میں مدرّسی کا کام ملا۔ لیکن سال ہی بھر بعد (مئی ۱۹۱۸ء میں) نائب تحصیلدار منتخب ہو گئے۔ اس بلند بانگ عہدے کا صرف ساٹھ روپے مشاہرہ تھا۔ لیکن جگر صاحب کے سامنے اپنے خاندان کے عروج و زوال کی داستان تھی۔ انھوں نے اس تقرر کو لطیفۂ غیبی اور خاندان کی گزشتہ عظمت کی بحالی کے لیے پہلا زینہ تصوّر کیا۔ وہ جلد ہی تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ اس زمانے میں ڈپٹی کلکٹری بڑی چیز تھی اور ہندستانی اسے اپنی ملازمت کی معراج سمجھتے تھے۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جگر صاحب کو معلوم ہو گیا کہ بندگی بیچارگی جو کسی نے کہا ہے، سچ کہا ہے۔ اس زمانے کے انگریز حاکم فرعونِ بے سامان سے کم نہیں تھے۔ ادھر آزادیٔ ملک کی تحریک بھی شروع ہو چکی تھی اور روز بروز شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جگر صاحب حاشیہ برداری سے کوسوں دور؛ نہ انھیں خوشامد کا فن آتا تھا، نہ نذرانہ ڈالی دینے کا ہنر۔ اپنی تعلیم و تربیت کے طفیل وہ رعایا پر سختی بھی نہ کر سکے۔ ان حالات میں ان کے افسرانِ اعلیٰ ان سے خوش ہوتے، تو کیوں! ایسے میں بھلا ترقی کا کیا امکان تھا! لیکن رہی سہی کسر ایک انگریز کلکٹر نے پوری کر دی۔

(گزشتہ سے پیوستہ) مشرقی حصے میں ایک دوسرا اسکول بھی اس کے نام پر تھا؛ یہ ایسٹرن انگلس ہیموریل اسکول کہلاتا تھا (E.I.M) اب اس نام کا آزاد انٹر کالج ہو گیا ہے۔ ڈبلیو، آئی، ایم، اسکول کے نواح میں ایک محلہ بھی انگلس گنج ہے؛ یہ بھی اسی کے نام پر ہے۔ اب عوام میں یہ انگلش گنج کے نام سے مشہور ہے۔

یہ سہسوان (ضلع بدایوں) میں نائب تحصیلدار تھے۔ ان ایام میں جو صاحب تحصیلدار تھے، وہ ان کے قدر دان اور ان پر بیحد مہربان تھے۔ اُن کا تبادلہ کسی دوسری تحصیل میں ہوگیا۔ جب مقامی خزانے کا چارج لیا گیا، تو پتا چلا کہ نقد میں بھی کمی ہے اور اسٹامپ میں بھی۔ یہ کارستانی خزانچی کی تھی، جو پہلے ہی سے فرار ہوگیا تھا، لیکن قانوناً ذمّے داری تحصیلدار کی تھی۔ اس لیے اگر خزانچی کا غبن بھی ثابت ہو جاتا، تو لامحالہ تحصیلدار ناوہ بچ نہیں سکتے تھے، عتاب لامحالہ انھیں پر نازل ہوتا۔ نقد کی کمی تو تحصیلدار صاحب نے رخصت ہونے سے پہلے اپنے دوستوں سے قرض لے کر اپنی جیب سے پوری کر دی، لیکن اسٹامپ تو پورا نہیں ہو سکتا تھا! دوست دشمن سب کے ہوتے ہیں۔ سہسوان میں جو تحصیلدار کے مخالف تھے، انھوں نے اگلے ہی دن سارا معاملہ بڑھا چڑھا کر کلکٹر بدایوں (مسٹر نیدر سول) کے گوش گزار کر دیا۔ نیدر سول اپنے زمانے کا مشہور شقی القلب آئی سی ایس افسر تھا۔ اس کی تندیِ مزاج کی کیفیت کا کچھ اس سے اندازہ لگائیے کہ ۱۹۴۲ء کی گاندھی جی کی "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کے زمانے میں وہ بہار میں تعینات تھا، وہاں اس نے ضلع بلیا کے گانو کے گانو اس لیے جلوا دیے کہ وہاں کے باشندے قوم پرستوں کے حامی اور ہمدرد تھے۔

جب سہسوان تحصیل کی یہ رپوٹ نیدر سول کے پاس پہنچی، تو وہ خود عملہ دفعلہ سمیت آدھمکا۔ چونکہ تحصیلدار کی تبدیلی پر اس سے چارج بحیثیت نائب تحصیلدار جگر صاحب نے لیا تھا، اس لیے پوچھ گچھ انھیں سے شروع ہوئی۔ کلکٹر چاہتا تھا کہ یہ کہہ دیں، روپیہ کم تھا؛ تاکہ تحصیلدار کا غبن ثابت ہو جائے۔ یہ بات خلاف واقعہ تھی۔ نقد روپیہ تحصیلدار صاحب نے اپنی جیب سے پورا کر کے انھیں چارج دیا تھا؛ البتہ اسٹامپ کی کمی واقعی تھی۔ نیدر سول کے پوچھنے پر جگر صاحب نے یہی کہا کہ سیاہہ کے مطابق نقد رقم پوری تھی؛ ہاں اسٹامپ کم تھا۔ کلکٹر کی اس سے تسلّی کیسے ہوتی، وہ تو تحصیلدار کو معزول کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے سختی سے پھر کہا: نہیں، نقد بھی کم تھا۔ جگر صاحب نے پہلا جواب دُہرا یا کیونکہ قانونی طور پر انھیں صرف اسی بات

کا علم ہو سکتا تھا ،جو ان کے سامنے پیش آئی تھی ،سنی سنائی باتوں کی قانون کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ۔ نید رسول نے انھیں دھمکی دی کہ اگر تم چھپاؤ گے (دوسرے لفظوں میں ہماری خواہش کے مطابق بیان نہیں دو گے) تو ہم تمھیں برخاست کر دینگے ۔ یہ پھر بھی اپنی بات پر قائم رہے ۔ خیر تحصیلدار صاحب تو بچ گئے ، لیکن جگر صاحب کی آیندہ کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا ۔ نید رسول نے اُن کی ذاتی فائل پر رپوٹ لکھی کہ نائب تحصیلدار کا کام قابل اطمینان نہیں ۔جب موجودہ کام کی یہ صورت ہو، تو آیندہ ترقی کی کیا توقع ہو سکتی تھی ! یہ ستمبر ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے ۔
اس کے بعد جگر صاحب نے تقریباً ۲۰ برس مزید ملازمت کی ،لیکن بہت مجبوری اور دل گرفتگی کے عالم میں وہ اس سے چھٹکارا چاہتے تھے ، لیکن آٹھ بچے ،سب کے سب زیر تعلیم یا کمسن ، نوکری چھوڑ دیں تو کس آسرے پر ، اور گھر کا خرچ کیونکر چلے ! پس انداز کچھ تھا نہیں ۔ خاندان میں بھی کوئی کفالت کرنے والا نہیں تھا ۔ دل مسوس کر رہ جاتے تھے ۔
۱۹۴۲ء کے اواخر میں وہ سانحہ پیش آیا ،جس نے ان کی زندگی تو تلخ کر ہی دی ،لیکن اس سے نوکری کا جو ابھی اُن کے گلے سے اُتر گیا ۔
یہ ان دنوں کاسگنج (ضلع ایٹہ - یوپی) میں نائب تحصیلدار تھے ۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ان کا بڑا بیٹا گنگا موہن رائے نامی کالج کی بڑے دن کی چھٹیوں میں اپنی بڑی بہن (شانتا) کے پاس شمس آباد جاتے ہوئے ایک دن کے لیے رستے میں کاسگنج اتر گیا ۔ دوپہر کے وقت وہ پہنچا ۔ اسی شب میں تین بجے کے قریب اس کے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا اور دیکھتے دیکھتے چند گھنٹوں میں وہ جان بحق ہو گیا ۔ یہ کاسگنج میں اکیلے تھے ، بیوی بچے کانپور میں تھے ۔انیس سال کا ہونہار نوجوان ،جس پر مستقبل کی سب امیدوں کا انحصار تھا ،یوں آناً فاناً ہاتھ سے جاتا رہا ۔ غریب والدین پر جو گزر گئی ، اس کا اندازہ کوئی صاحب دل ہی لگا سکتا ہے ۔
جگر صاحب بیمار ہو گئے اور چھٹی پر وطن آ گئے ۔ بیماری نے طول کھینچا ، تو رخصت

ہیں تو سیع کرائی۔ لیکن صحت پھر بھی نہیں سنبھلی۔ طبّی بورڈ نے تصدیق کر دی کہ اب یہ کام کے قابل نہیں رہے۔ اس رپورٹ پر پانچ سال قبل از وقت پنشن ہو گئی۔ نیدرسول کی پرانی مخالفانہ رپوٹ کی بدولت یہ بھی تنخواہ کے نصف کی جگہ ایک تہائی یعنی اکیاون روپیہ پانچ آنے ماہانہ مقرر ہوئی۔
اب اور مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ ملازمت کے دوران میں کم از کم ڈیڑھ سو روپے تنخواہ کے تو آجاتے تھے۔ رقم کم سہی، لیکن شتم پشتم گزر بسر ہو رہی تھی۔ اب لے دے کے اکیاون روپے پنشن کے، جو اتنے بڑے خاندان کے مصارف کے لیے قطعاً ناکافی تھے بالخصوص جب کہ جنگ اور جنگ کے بعد کا زمانہ انتہائی گرانی کا زمانہ تھا۔ بارے ان کے ایک صاحبِ مقدرت دوست اور شاگرد نے کچھ خدمت کی۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں ایک مقامی انٹر کالج میں ساٹھ روپے ماہانہ پر پڑھانے کی عارضی ملازمت بھی مل گئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ صورتِ حال بہت تکلیف دِہ تھی۔ یہ تنگی ترشی کا زمانہ ۱۹۵۱ء تک ممتد رہا۔
جون ۱۹۵۲ء میں وہ میرٹھ آگئے، یہاں ان کا بڑا بیٹا یادو موہن رائے گرامی دیو ناگری انٹر کالج میں اور منجھلا مادھو موہن رائے جامی میرٹھ کالج میں مدرّس تھے۔ اس کے بعد وہ آخری دم تک میرٹھ ہی میں مقیم رہے۔ ۴ مارچ ۱۹۷۶ء کی سہ پہر کو گھبراہٹ اور اختلاج کا اظہار کیا اور کپڑے اتار پھینکے۔ انھیں اتنا پسینہ آیا کہ وہ نہا گئے۔ ڈاکٹر آئے۔ انھوں نے مسکّن اور خواب آور دوا دی، اور کہا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ اسی شب ساڑھے گیارہ بجے رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔
ان کی شادی ۱۹۱۳ء میں کانپور کے ایک معزز اور صاحب حیثیت خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کی بیگم (شریمتی جے دیوی) پرمٹ گھاٹ، کانپور کے منشی پرمیشور دیال کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ یہ ماشاء اللہ حیات ہیں۔ اولاد میں چار بیٹے دیا دو موہن رائے گرامی، مادھو موہن رائے جامی، جگت موہن رائے سامی، رادھے موہن رائے حامی) اور تین صاحبزادیاں (شیو کماری دیوی اور شانتی دیوی اور

ثمن ثنا) ان سے یادگار رہیں۔ بفضلہ سب بچے خوش وخرم اور عزت ووقار کے مالک ہیں۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، جگر مرحوم کے دادا محکمۂ تعلیم میں معزز عہدے پر فائز تھے؛ وہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ جگر کے والد منشی کنھیا لال فارسی میں منتہی اور اردو کے شاعر تھے؛ دل تخلص تھا اور اس میں مشورہ غالب کے مشہور شاگرد علامہ حسنین قدر بلگرامی (ف: ستمبر ۱۸۸۴ء) سے تھا۔ جگر کے نانا منشی گنگا پرشاد بھی اردو کے شاعر تھے؛ اوج تخلص تھا اور آتش (ف: جنوری ۱۸۴۷ء) کے شاگرد تھے۔ ایسے ماحول میں شیام موہن لال کا شعر گوئی کی طرف مائل ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس پر گھر کی مادی تباہی نے دل میں سوز و گداز اور تنہائی پسندی کی عادت پیدا کر دی تھی۔ یہ سب باتیں ایک حساس شخص کو اچھا شاعر بنانے کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ پہلا شعر اپنے حسبِ حال ۱۹۱۵ء میں کہا:

ناوک غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو
اشک کی نذر دل و جان و جگر ہونے دو

شروع میں مشورہ والد ہی سے رہا۔ جگر تخلص بھی انھیں نے تجویز کیا تھا کہ والد دل، بیٹا جگر۔ جب باقاعدہ شاعری پر توجہ کی، تو علم و ادب کی کتابوں کا غائر مطالعہ کیا۔ اور مشق سے ایسی استعداد بہم پہونچائی کہ بالآخر صف اول کے اساتذہ میں جگہ حاصل کر لی۔ مختلف اوقات میں کئی اساتذہ سے مشورہ رہا۔ ان میں منشی سوہن لال حقیر شاہجہانپوری، جلیل مانکپوری (ف: جنوری ۱۹۴۶ء) احمد حسن شوکت میرٹھی (ف: دسمبر ۱۹۲۲ء)، احمد علی شوق قدوائی (ف: اپریل ۱۹۲۵ء) مرزا واجد حسین یاس یگانہ لکھنوی (ف: فروری ۱۹۵۶ء) کے نام انھوں نے خود لکھے ہیں۔ سب سے آخر میں میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (ف: جولائی ۱۹۳۵ء) کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی وفات سے قبل چھ سات سال تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔

اگرچہ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ہے یہ کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر

ہیں۔ اور ان کے کلام پر کلاسیکیت کی چھاپ ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے اس میں کوئی سقم نہیں ملتا۔ افسوس، ان کا غزلیات کا دیوان ان کی زندگی میں نہیں چھپا۔ ۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اپنے سلسلۂ شعرا میں ان کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا تھا، جس میں کوئی پونے آٹھ سو اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں:

(۱) پپیہا اور پی کہاں: مسدس (بدایوں، ۱۹۲۵ء)؛ (۲) رنگ و بو: مثنوی (بدایوں ۱۹۵۲ء)؛ (۳) کاشتہ درین: مسدس (بدایوں، ۱۹۵۳ء)؛ (۴) پیام ساوتری: مثنوی (لکھنؤ، ۱۹۵۴ء)(۵) ترس: مجموعۂ رباعیات (لکھنؤ، ۱۹۶۰ء)؛ (۶) یادِ رفتگاں: تذکرہ (الہ آباد، ۱۹۴۳ء)؛ (۷) صحتِ زبان: زبان و بیان کی بحث (بدایوں، ۱۹۵۸ء) (۸) حدیثِ خودی: خود نوشت سوانحعمری (امرتسر، ۱۹۵۵ء)؛ (۹) یادگارِ نظر: منشی نوبت رائے نظر کی سوانح اور کلام پر تنقید (علیگڈھ، ۱۹۶۸ء)۔ لیکن بہت کچھ غیر مطبوعہ رہ گیا، جس میں کچھ ضائع بھی ہوگیا۔ مثلاً ایک کتاب "بہارِ جاوداں" تھی جس میں ہندو ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور کلام کا جائزہ لیا تھا۔ یہ الٰہ آبادی ناشر کی غفلت کے باعث تلف ہوگئی۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں ان کی انگریزی میں مفصل خود نوشت سوانحعمری (Mysteries of my mind) بھی ہے۔ یہ میری نظر سے گزری ہے۔

ان کے قلمی مجموعۂ غزلیات "سوزِ پروانہ" سے مختصر انتخاب ملاحظہ کیجیے!

تم نے پوچھا تو جی بھر آیا — کچھ کہہ نہ سکے تو رو دیے ہم
مر مر کے کٹی ہے زندگانی — یوں تو کہنے کو ہاں، جیے ہم

بات کرتا ہے اگر کوئی تو رو دیتا ہے — کچھ عجب حال ہوا ہے ترے سودائی کا
ہر ایک قطرہ ہے بیتاب، صورتِ سیماب — وہ جذبِ حسن سے بحرِ وجود میں ہے جوش

بندگی کرنے پہ جب آئے تو کیا — کہیں رکھ دی، جگر اجبینِ نیاز
لگ گیا جب خزاں سے دل اپنا — فصلِ گل آئی بھی، تو کیا آئی

آج کیا جانے کیا ہے ہونے کو جی بہت چاہتا ہے رونے کو
تیری رحمت سے نا امید نہیں اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

کیا شکوہ، کس کی شکایت، ظلم یہ دل نے ڈھائے ہیں
خود ہی دنیا بھر کے ہم نے جی کو روگ لگائے ہیں
خاک ہی ہو کر اب اٹھنا ہے، یوں اُٹھنا آسان نہیں
جب ہم نے سب دیکھ لیے گھر، تیرے در پر آئے ہیں

تم نہیں پاس، کوئی پاس نہیں اب مجھے زندگی کی آس نہیں
سانس لینے میں درد ہوتا ہے اب ہوا زندگی کی راس نہیں

تو دل میں ہے، تو منزلِ مقصود آپ ہوں
رکھتا ہوں جو قدم، وہ تری رہگزر میں ہے

پہلے جو دردِ دل کا تھا آزار اب وہی جانِ زندگانی ہے
ہے امینِ وقارِ عجز و نیاز وہ تمنا جو بر نہیں آتی
جس نے تیری نظر کو دیکھ لیا اس کو دنیا نظر نہیں آتی

نہ آرزو کوئی باقی ہے اب، نہ دل باقی مگر یہ کیا ہے کہ دردِ نہاں نہیں جاتا
چراغِ غمکدۂ زندگی سہی امید وہ کیا کرے جسے امید سازگار نہ ہو!
گلشن سے ہم کو شوق کبھی والہانہ تھا تھا چار روز ہی وہ، مگر کیا زمانہ تھا

کچھ ادائیں تھیں تری، ساقی! نہ صہبا تھی نہ جام
جانِ محفل بن گئیں، ایمانِ محفل ہو گئیں
حوصلے مٹ کر رسومِ دین و ملت بن گئے
پست ہو کر ہمتیں طوق و سلاسل ہو گئیں

مانا بہت جنوں نے سبکدوش کر دیا سر ہے تو سر کے ساتھ ہیں بارِ گراں کئی
ہر چند بر سبیل شکایت نہیں، مگر شکوے ہیں آپ سے مجھے اے مہرباں کئی
اب کیا کریں کہ جان و دل اس کے ہی ہو چکے نامہرباں اگر ہے وہ، نامہرباں سہی

کیوں پوچھتے ہو، بانیٔ بیداد کون ہے؟ تم آسماں کہتے ہو، تو آسماں سہی
گداگری کا بھرم بے نیازیوں سے رہا مرے سوال کو اہلِ کرم سمجھ نہ سکے
اب کے بھی آہ، یوں ہی گیا موسمِ بہار دامن کا چاک، چاکِ گریباں نہ ہو سکا
کیا دل کی کائنات ہے، کیا جان کی بساط!
کافر ہوں، گر ڈریں نہ ترے امتحاں سے ہم
حرماں نصیبیوں میں سب حال ہے برابر ایذا نہ موت میں ہے، راحت نہ زندگی میں
جو غم دیا تھا، تو اپنا ہی غم دیا ہوتا کہا یہ کس نے کہ غم سے نجات ہو جاتی
کسی رہگزر میں پڑے ہیں ہم، عبث آسماں کی ہیں رنجشیں
کوئی لاکھ اٹھائے، اٹھ سکے کیا، کبھی پاؤں کا بھی نشاں اٹھا!
ہے حجابِ حسن کا یہ اثر، کسی خود پرست کو کیا خبر
جو ازل سے سینے میں جوش تھا، وہی بن کے شورِ فغاں اٹھا
نگہِ التفات کے صدقے دلِ مردہ میں آج جان آئی
باتوں باتوں میں تم بگڑ بیٹھے ایسی کیا بات درمیان آئی
جنھیں اللہ کے بندوں سے ہے اُنس
وہی در اصل ہیں اللہ والے
چمن، مرغ و قفس، صیاد کہہ کر
ہزاروں راز ہم نے کھول ڈالے
چھپائے چھپ نہ سکے، گفتگو میں آ نہ سکے
عجیب راز محبت کا راز ہوتا ہے
غم سہتے سہتے مدت تک ایسی بھی حالت ہوتی ہے
آنکھوں میں اشک امڈتے ہیں، رونے سے نفرت ہوتی ہے
دوزخ کو بھی جنت کر دے، جنت کو بھی دوزخ کر دے
ہم تجھ کو بتائیں کیا، ہمدم! کیا چیز محبت ہوتی ہے

نہ ہمیں خدا کی ہے جستجو، نہ ہمیں نجات کی آرزو
ہیں قتیلِ شیوۂ دلبری، ہمیں دلستاں کی تلاش ہے

دلِ مضطرب کو سکوں تو ہو، کہیں ہو قرار بھی پاؤں کو
نہیں غم جو سجدہ ہو رائگاں، ہمیں آستاں کی تلاش ہے

روحِ رواں تمھیں ہو، تمھیں سے ہے زندگی
سینے میں سانس، دل میں حرارت تمھیں سے ہے

وابستہ ہے تمھاری نظر سے سزا جزا
جو کچھ غرض ہے دوزخ و جنت تمھیں سے ہے

درد ہو، دکھ ہو، تو دوا کیجے
پھٹ پڑے آسماں تو کیا کیجے

حال سن کر مرا وہ یوں بولے
اور دل دیجیے، وفا کیجے

عشق کو دیجیے جنوں میں فروغ
درد سے درد کی دوا کیجے!

راس آئے نہ گر کشاکشِ زیست
دلِ محزوں کو مبتلا کیجے!

عشق میں قدرِ خستگی کی امید
اے جگر! ہوش کی دوا کیجے!

خزاں کی رت بدل گئی، زمانہ بہار ہے
جو ہم کو انتظار تھا، وہ اب بھی انتظار ہے

اور سب کچھ ہوا زمانے میں
ہم جو چاہا کیے، وہی نہ ہوا

یہ اور بات ہے کہ نگاہِ کرم نہ ہو
غافل نہیں وہ ہم سے، ہمیں یہ یقیں تو ہے

دل کی بات نہ لب پر لانا
منھ سے نکلی، ہوئی پرائی

در پردہ کوئی بانیِ بیداد اور ہے
بیجا شکایتیں ستمِ آسماں کی ہیں

فسردہ ہو کے کئی بار اٹھے ترے در سے
پلٹ پلٹ پڑے ہم دو قدم بھی چل نہ سکے

کبھی ہم بھی تمھیں اپنا کہتے
عمر گزری، یہ تمنا کرتے

یاد آرہے ہیں ساتھ ترے، تیرے جور بھی
روتے ہیں دیکھ دیکھ کے تصویر اپنی ہم

ہونے لگی قدر زندگی کی
جب عمرِ عزیز کھو چکے ہم

پھر اسی آستانے پر سر ہے — اُف رے بیچارگی محبت کی
جب خوشی کے رہے نہیں ایام — غم کی بھی رات کٹ ہی جائیگی

قطعہ

بہت بلند ہے رتبہ ترا، دلِ آگاہ! — کشاکشِ غم و شادی سے بیقرار نہ ہو
خزاں اگر آئے، نہ ہو شکوہ سنجِ دورِ خزاں — بہار آئے، تو منّت کشِ بہار نہ ہو
نظر نہ آئے حقیقت، تو کور و کر بن جا — فریب خوردۂ نیرنگِ اعتبار نہ ہو
کوئی کہے تجھے اچھا، تو فخر و ناز نہ کر — بُرا کہے تجھے کوئی، تو ناگوار نہ ہو
علوِ مرتبہ و منزلت کی حرص نہ کر — گدائے مہر و مراعات بن کے خوار نہ ہو
فروغ ذات کو دے اپنی، منفرد بن جا — رہینِ منّتِ تقلید زینہار نہ ہو
عزیزِ خاطرِ احباب بن گلوں کی مثال — مگر ہے شرط کسی کے گلے کا ہار نہ ہو
بنانا ہے کوئی تعمیر اگر، تو آپ بنا — کسی کے لطف و تعاون کا خواستگار نہ ہو
نیاز و عجز ہے اچھا، مگر یہ یاد رہے — خود اپنی ذات میں کوتاہیِ وقار نہ ہو

رہے نگاہ میں ہر دم، جو مرتبہ ہے ترا
جگر کا قول فراموش زینہار نہ ہو

سالک لکھنوی، محمد حسن (سید)

مشہور شیعی ذاکر و خطیب و عالم شمس العلما، مولانا سید سبط حسن کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مدرسۂ ناظمیہ، لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہاں درجۂ قابل تک عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں قرآن حفظ کرنے کی طرف توجہ کی اور ۲۴ پارے تک حفظ کر لیے؛ لیکن افسوس، اسے مکمل نہ کر سکے۔

گھر کا ماحول سراسر شاعرانہ تھا۔ ان کے والد کا تخلّص فاطر تھا؛ منجھلے چچا سید ظفر مہدی (مدیر سہیل یمن، لکھنؤ) تھے اور چھوٹے چچا سید کامل حسین کامل (پرائیویٹ سکتر پرنس جعفر علی خاں اثر رامپوری)۔ سید منظر حسن منظر، جن کا جون ۱۹۷۵ء میں انتقال ہوا، ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ سالک نے شروع میں تخلّص شمیم کیا، لیکن بعض بزرگوں کے کہنے پر اسے ترک کر کے سالک اختیار کر لیا۔ ابتدا میں چندے اپنے والد سید سبط حسن سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ جو کہا، خود ہی نظرِ ثانی سے اس میں ردّ و بدل کر لیا۔ جلد ہی اس فن میں اتنی مہارت پیدا ہو گئی کہ مشاعروں میں مانگ اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ انجمن بہار ادب لکھنؤ اس عہد کی مشہور ادبی انجمن تھی اور اس عہد کے مشاہیر شعرا اس کے منتظمین اور اراکین میں شامل تھے: انھوں نے سالک کو اس کا اعزازی رکن بنایا۔

مآخذ: یہ حالات جناب کاظم علی خان (شیعہ کالج لکھنؤ) نے سالک مرحوم کے برادرِ خورد سید باسط حسن ماہر سے لے کر بھیجے؛ دونوں کا ممنونِ احسان ہوں۔

۱۹۴۵ء میں ہز ہائی نس مہاراجا چکر دھر سنگھ والیِ رائے گڑھ (ضلع چھتیس گڑھ۔ یو پی) نے سالک کو اپنا استاد مقرر کر کے ریاست میں ایک معزز عہدہ بھی ان کے تفویض کر دیا۔ لیکن یہاں ان کا مشکل سے سال بھر قیام رہا ہوگا؛ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ واپس چلے آئے۔ مہاراجا نے اسی زمانے میں ہزار لکھنوی (ف: نومبر ۱۹۷۵ء) کو بھی اپنے ہاں بلا لیا تھا۔ ممکن ہے سالک کے رائے گڑھ سے چلے آنے میں اس واقعے کا بھی کچھ دخل ہو!

ان کی زندگی میں مجموعۂ غزلیات شائع نہیں ہو سکا، البتہ سلاموں کے متعدد مجموعے (فغان، سلسبیل، پیاسوں کی یاد، اضطرابِ فرات) شائع ہوئے۔ بلکہ آخری زمانے میں تو ان کی تمام تر توجہ سلام اور نوحے تک محدود ہو گئی تھی۔

انھیں نفس کا عارضہ ایک زمانے سے تھا۔ اسی سے ۱۱ مارچ ۱۹۷۶ء کی شب میں ساڑھے آٹھ بجے انتقال ہوا۔ اگلے دن (۱۲ مارچ) تجہیز و تکفین ہوئی۔ انھیں حسینیۂ غفران مآب میں سپردِ خاک کیا گیا، جہاں ان کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد بھی محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

ساری عمر شادی نہیں کی؛ لاولد فوت ہوئے۔

سالک ایک لحاظ سے دبستانِ لکھنؤ کے آخری شاعر تھے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ خود انھیں کے ساتھ لکھنوی رنگ میں داخلیت جھلکنے لگی تھی۔ دراصل یہ اثر تھا ان کے حزن و ملال کا، جو نتیجہ تھا ان کی زندگی کی ناکامی کا، اور سلام اور نوحے سے غیر معمولی شغف کا۔

غزل کے چند شعر بعض رسائل میں شائع شدہ کلام سے پیش کیے جاتے ہیں:

جب بھی ملے دونوں سر را ہے ـــــ ہم ان سے، وہ ہم سے پشیماں

ہر ایک بزمِ تمنا سجائے بیٹھا ہے ـــــ کسی کو ہوش نہیں زندگی کہاں پہنچی

یوں ہے انسانوں کے شہروں میں اپنا وجود ـــــ کسی ویرانے میں اک پھول کھلا ہو جیسے

دھڑکنیں تیز ہیں رگ رگ میں ہے اک گرمیِ شوق ـــــ سرحدِ دل سے ابھی کوئی گیا ہو جیسے

تیرے در پر مرے سجدے کا وہی عالم ہے — راستے میں کوئی آئینہ پڑا ہو جیسے

نہ تھے جب تک نظر کے سامنے تم — تھا لطفِ منظرِ دیدار کیا کیا

تری آنکھوں کی شہ جب پا گئے ہیں — کھلے ہیں پھر لبِ اظہار کیا کیا

ترے ہی دستِ کرم سے ملے، جو ملنا ہے — میں کیا کروں گا یہ دامن اِدھر اُدھر بھر کے

کھنک جاتے ہیں جب ساغر تو پہروں کان بجتے ہیں

ارے توبہ، بڑی توبہ شکن آواز ہوتی ہے

نہیں پڑتی کمند اس پر، جسے اڑنا نہیں آتا

اسیری خود رہینِ منتِ پرواز ہوتی ہے

جا یا تھا، ٹھوکروں میں گزر جائے زندگی — لوگوں نے سنگِ راہ سمجھ کر ہٹا دیا

ڑا نازک طریقہ ہے یہ اظہارِ محبت کا — زباں خاموش رہتی ہے، نظر آواز ہوتی ہے

رہی ہیں سب قفس کی تیلیاں بکھری ہوئی

کل یہیں پر امتحانِ طاقتِ پرواز تھا

ے تلاشِ سالک اب آج کیوں، وہ تو انجمن سے چلا گیا

جسے لوگ کہتے تھے بے وفا، وہ وفا شعار نہیں رہا

مخمور اکبر آبادی، محمد محمود رضوی، سید

آگرے میں اپنے آبائی مکان (کٹرہ ہادی حسن) میں ۴ فروری ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد علی صاحب آگرے کی دیوانی عدالت میں منصرم تھے، بعد کو شاید ناظم ہو گئے تھے۔ مخمور ۱۴ سال کے تھے، جب مفید عام ہائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ تعلیم کے زمانے میں بہت ممتاز رہے۔ مختلف درجوں میں متعدد مواقع پر انعامات اور سونے چاندی کے تمغے حاصل کیے۔ پھر آگرہ کالج سے ال ال بی کر کے وکالت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ۱۸ سال تک آگرے میں وکالت کرتے رہے اور اس میں بھی خاصی کامیابی حاصل کی۔ اسی دوران میں حکومت نے آگرہ یونیورسٹی کی سینٹ کا رکن نامزد کیا، اور ۱۲ برس تک اس عہدے پر بھی فائز رہے۔

دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء ۱۹۴۵ء) کے دوران میں حکومت ہند نے انھیں آل انڈیا ریڈیو میں مترجم مقرر کر دیا؛ اور اسی سلسلے میں وہ ڈھاکے کے دفتر میں (جاپانی محاذ پر) متعین ہو گئے۔ اسی لیے جب ملک آزاد ہوا ہے تو وہ پاکستان ہی میں رہ گئے۔ اور اس کے بعد بھی بہت دن تک ریڈیو پاکستان میں ملازم رہے؛ اس طرح انھیں مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں طویل قیام کا اتفاق ہوا۔ جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اپنے اکلوتے بیٹے سید حسن محمود رضوی (سابق ڈپٹی کلکٹر، سینیر اکسائز کمشنر، پاکستان) کے پاس کراچی میں رہنے لگے۔ غالباً بعد کو ان سے کچھ اختلاف ہو گیا، اور انھیں گھر چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد بہت ہی بے بسی اور عسرت بلکہ خاصی تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ بالآخر کراچی سے نقل مکان کر کے اپنے بھانجے سید علی مظاہر جعفری ایڈووکیٹ، خیرپور میر کے ہاں چلے گئے۔ وہیں

ماخذ: شاعر (آگرہ) نمبر جون، جولائی ۱۹۳۶ء؛ خطوط مشفق خواجہ کراچی؛ خطوط مخمور مرحوم بنام مؤلف

بروزِ جمعہ ۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء صبح پانچ بجے ان کا انتقال ہوا، اور شیعوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا۔ ان کے گھرانے میں علمی روایت تھی۔ خان بہادر سید آلِ نبی مرحوم آپ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ ان کے نانا مولوی سید محمد تنزیہ الفرقان کے مصنف تھے۔ نیاز فتحپوری نے جن احباب کے تعاون سے ۱۹۲۲ء میں نگار جاری کیا تھا، انھوں نے ان کو "یارانِ نجد" کا نام دیا تھا؛ مخمور بھی ان میں شامل تھے، اور غالباً اس گروہ میں سب سے کم عمر تھے۔ خدا کی شان اس عقدِ جواہر کے سب موتی ایک ایک کر کے بکھر گئے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

جیسا کہ معلوم ہے، نگار جب شروع ہوا، تو نیاز اس زمانے میں ریاست بھوپال میں ملازم تھے، وہ پرچہ وہاں سے بھیج دیا کرتے، اور اس کی کتابت و طباعت کے جملہ مراحل طے ہو جانے کے بعد یہ آگرے ہی سے خریداروں کو بھیجا جاتا تھا۔ مخمور اس سے پہلے "نقاد" (آگرہ) کے مستقل معاونوں میں رہ چکے تھے، اور اس کے دونوں دوروں میں ان کی نظمیں شائع ہوتی رہی تھیں۔ اب وہ نیاز کے دست راست ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں وہ نگار کے لیے فوائد علمیہ کی ذیل میں چھوٹے چھوٹے شذرات لکھا کرتے تھے۔ چند تسنیم (ماہنامہ) کی ادارت سے بھی منسلک رہے۔

ان کی سب سے پہلی کتاب "روحِ نظیر" ہے، جو اوّل مرتبہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ (دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۹ء)۔ وفات سے پہلے انھوں نے اس پر نظرِ ثانی کی تھی۔ مسودہ ان کے صاحبزادے کے پاس کراچی میں ہے۔ (۲) ایک اور کتاب آلامِ حیات (تراجم اور افسانے) بھی اسی زمانے میں تصنیف کیے۔ اسی دور میں (۳) تاریخ انگلستان، (۴) شمیم اردو، (۵) نگارِ اردو، (۶) بوستانِ ادب، (۷) جواہرِ نثر، (۸) سلکِ نظم، (۹) دنیا کے آبشار" بھی شائع کیں، یہ سب طلبا کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر تالیف کی گئی تھیں، (۱۰) اردو زبان اور اسالیب (کراچی، ۱۹۶۱ء) اس میں اردو کے الفاظ، مرکبات، محاورات کے استعمال پر بحث کی ہے۔ (۱۱) مشرقِ تاباں (کراچی، ۱۹۶۷ء) اس مختصر

مجموعے میں مشرقی پاکستان سے متعلق کچھ نظمیں ہیں۔ (۱۲) سرو وصنوبر (کراچی، ۱۹۷۱ء)
غالب کے بارے میں مقالات کا مجموعہ۔ (۱۳) فانی: شخصیت اور حسنِ بیان (کراچی،
۱۹۷۱ء)؛ (۱۴) قاموس الفصاحت (کراچی، ۱۹۷۳ء) مقدمے میں اردو زبان کی بعض خصوصیات
پر روشنی ڈالنے کے بعد اس کی کہاوتیں، محاورے، روزمرہ، غیر مانوس الفاظ، تراکیب
وغیرہ جمع کی ہیں۔ غیر مطبوعہ ذخیرے میں ان کی ایک معرکے کی کتاب "غالب کی فطنت اور
صناعت" ہے؛ اس میں کوئی ۲۰۰۰ صفحات ہوں گے۔ اس کے (۲۲) ابواب میں سے صرف تین
"قومی زبان" اور "اردو" میں شائع ہوئے تھے۔ بہت دن ہوئے، انھوں نے اس کی
فہرست مضامین کی نقل مجھے بھیجی تھی۔ پوری کتاب کے چھپنے کا امکان کم ہے اور اس میں
غیر ضروری طوالت بھی ہے۔ ہاں، کوئی شخص محنت کر کے ان کا خلاصہ تیار کر دے،
تو یہ کتاب محفوظ ہو جائے۔ بعض اور مسودات بھی غیر مطبوعہ رہ گئے جن میں نظیر نامہ
صحیفہ، تاریخ اردو، عقلِ سلیم (نفسیات سے متعلق ترجمہ) زیادہ اہم ہیں۔
افسوس کہ زیادہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ذیل میں ایک غزل اور ایک نظم درج ہیں،
جو موقت الشیوع رسائل سے لی گئی ہیں۔

پیکرِ نغمہ

اے جنتِ نظارہ! اے نازشِ رعنائی!
اے حسنِ خمار آگیں، زیبائشِ یکتائی!
اے گوہرِ یک دانہ! مفتونِ خود آرائی!
اے کاش تجھے آتی، الفت کی پذیرائی!

کب ہجر سے واقف ہے وصلت کی تن آسانی
تو عشق کو ٹھکرا دے، اے درد سے بیگانی!

کیا سحر طرازوں کی جادو نظری ہے تو
باکیف مسرت کی غفلت اثری ہے تو
یا قوس کی اک دیوی، پردیس کی پری ہے تو
ہاں عالمِ الواں کی یا جلوہ گری ہے تو

سینے کی صباحت پر جاں سیم کی قرباں ہے
ساری میں تری پنہاں روحِ سمنستاں ہے

یہ گردن کی نزاکت پر کنٹھے کی سبک ساری
وہ طرفہ نگاروں کی ملبوس پہ زر کاری
منقش کے بوٹوں کی آنچل پہ وہ گلکاری
وہ ساعدِ سیمیں کی زیبا طرب آثاری
کس بات پہ آمادہ کس دُھن میں کھڑی ہے تو
عالم کو مٹا دے گی کیا اس پہ اڑی ہے تو
تصویر میں یوں ساکت، حیراں ہو تو کیا ہو گی؟
خاموش تو یہ عالم، خنداں ہو تو کیا ہو گی؟
اس چپ میں یہ سرشاری، شاداں ہو تو کیا ہو گی
قائم تو یہ عریانی، رقصاں ہو تو کیا ہو گی؟
چھپتی نہیں بے تابی افسونِ تبسم کی
لے کھیلتی پھرتی ہے ہونٹوں پہ ترنم کی

غزل:

نازاں ہوں کہ آخر کو کام آئی گنہ گاری
لائی درِ رحمت تک عصیاں کی فسوں کاری
احساسِ کرم گویا، برچھی کی انی نکلا
غمخواری کی شفقت میں پنہاں ہے دل آزاری
خبثِ دلِ دشمن کا احساس تو آساں تھا
رازِ دلِ محرم کو سمجھا ہوں بہ دشواری
فطرت نے بالآخر یوں ایماں کی اعانت کی
اقرار پہ خنداں ہے رسم و رہِ بدکاری
ہلکی ہے کہ بھاری ہے، مشکل ہے کہ آساں ہو
میزانِ معاصی میں تولوں گا نکوکاری
ہم کہنہ حقائق کو سمجھے تو مگر اتنا
نقشِ رہِ منزل ہے، تقویٰ ہو کہ عیاری
ہشیار سے ناداں کی غفلت کا گلہ سن کر
غفلت کے مراحم سے، بدلوں گا نہ ہشیاری
سرگشتۂ الفت ہے، واماندۂ منزل ہے
مخمور سے پیش آئیں، احباب بہ دلداری

رسا جالندھری، محمد کبیر خان

جالندھر (پنجاب) کے ارد گرد میل میل ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اسلامی عہد سے پٹھانوں کی بارہ بستیاں ہیں۔ ہر ایک میں کسی ایک قبیلے کے افراد آباد ہیں؛ اور یہ انھیں کے نام سے موسوم ہیں۔ رسا انھیں میں سے "بستی غزان" کے ایک صاحب حیثیت زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔

نجی اور اسکول کی تعلیم کے بعد علیگڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ شاعری اسکول کے دور ہی میں شروع کر دی تھی۔ جب یہاں کالج میں انھیں موافق ماحول ملا، تو اس میں خوب ترقی کی۔ اسی زمانے میں مولانا شبلی کا انتقال ہو گیا (ف: ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) تو رسا نے ۱۵۶ اشعار کا بڑے معرکے کا مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ بہت مقبول ہوا، اور اس پر انھیں کالج کی طرف سے حالی میڈل انعام میں ملا۔ لیکن ابھی تک انھوں نے کسی سے اصلاح کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ بعض دوستوں سے مشورے کے بعد ۱۹۱۷ء میں انھوں نے صفی لکھنوی سے اصلاح کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ یہ سلسلہ صفی کی وفات (ف: جون ۱۹۵۰ء) تک جاری رہا۔ رسا استاد کے چہیتے شاگرد تھے۔ ان سے متعلق صفی کا شعر ہے:

حلاوتِ سخن دلپذیر کیا کہنا!
صفی! رسا سے نظیری نظیر کیا کہنا

۱۹۱۷ء کے اواخر میں رسا کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لامحالہ خانگی ذمہ داریاں بڑھ گئیں،

ماخذ، شمشاد حسین رضوی، کراچی

اور انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے وطن واپس آنا پڑا۔ والد کا جاداد کی دیکھ بھال کے ساتھ دوسرا دلپسند مشغلہ مقدمہ بازی تھا۔ رسا کو یہ بھی ورثے میں ملا۔ اس لغو کام میں تضیع اوقات کے باعث انھیں شعر گوئی کے لیے بہت کم وقت ملتا۔ حسن اتفاق سے ۱۹۲۵ء میں پیرزادہ عبدالحمید ایڈوکیٹ غازی آباد سے جالندھر تشریف لے آئے۔ وہ شعر و سخن کے رسیا تھے۔ یہاں پہنچتے ہی انھوں نے اپنی کوٹھی پر باقاعدہ مشاعروں کی طرح ڈال دی۔ ان میں مولانا غلام قادر گرامی (ف: ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء) سید محمد علی آذر جالندھری، ابوالاثر حفیظ جالندھری، اصغر علی حسن، گل محمد نصیر، معراج الدین شاہ وغیرہ شریک ہوتے۔ رسا کو بھی دعوت دی گئی اور اس کے بعد وہ بھی باقاعدگی سے جانے لگے۔

ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ سب سے پہلی "بزمِ اقبال" علامہ کی زندگی میں جالندھر ہی میں قائم ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے۔ اس کے لیے علامہ سے استصواب کیا گیا تھا۔ محمود نظامی مرحوم نے خاص طور پر لاہور میں علامہ سے مل کر اجازت لی تھی، اور یوں یہ بزم وجود میں آئی۔ خان ذکا الدین ڈسٹرکٹ جج اس کے سرپرست تھے، ارشاد احمد خان، صدر؛ ممتاز پرویز، جنرل سکریٹری؛ اور ڈاکٹر عطا الرحمٰن، سکریٹری۔

رسا ان دونوں جگہوں کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اس سے انھیں جتنا فائدہ پہنچا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کلام کا مجموعہ "فکرِ رسا" چھپ چکا ہے۔ غزل کے علاوہ نظم پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ رباعی، قصیدہ، تاریخ گوئی کسی میں بند نہیں تھے۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ لاہور میں مقیم رہے۔ بیوی کا جوانی میں انتقال ہوگیا؛ اس کے بعد شادی نہیں کی۔ اپنی بہن کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پرورش

کیا۔ ۴ اپریل ۱۹۷۷ء کو لاہور ہی میں انتقال ہوا، اور وہیں دفن ہوئے۔
چند شعر ملاحظہ ہوں:

ایسی ہوا چلی کہ زمانہ بدل گیا
ہم پوچھتے ہی رہ گئے، کیا بات ہوگئی

جس زمیں، جس آسماں کا شوق لایا تھا یہاں
وہ زمیں پائی نہیں، وہ آسماں دیکھا نہیں

خوش نصیبی میں ہے یہی اک عیب
بدنصیبوں کے گھر نہیں آتی

سانس رکتے ہی آگئی منزل
کس قدر مختصر ہے راہ حیات

کمند پھینکی ہے انساں نے چاند تاروں پر
کسی مقام پہ محفوظ زندگی نہ رہی

جو بچھڑتا ہے، پھر نہیں ملتا
عمر رفتہ کو بار بار نہ ڈھونڈ

جلنا تھا جس کے ساتھ مجھے صبح تک مسا!
کیوں بجھ گئی وہ شمع سر شام کچھ نہ پوچھ

ہمیں پہ ختم ہوئے حادثے محبت کے
ہمارے بعد نہ پھر کوئی واردات ہوئی

کیا یہ لازم ہے کہ پہنچیں کشتیاں ساحل پہ سب
ناخدا انسان ہوتے ہیں، خدا ہوتے نہیں

جب ایک پھول کی تصویر کھینچی جاتی ہے
کئی چمن پس منظر دکھائے جاتے ہیں

لہو کی چار بوندیں وجہ طوفاں بن نہیں سکتیں
نہ جانے، کیا قیامت ہے، جسے ہم دل سمجھتے ہیں

زخمی ہیں جن سے پانو بیاباں کے ہیں وہ خار
جو دل میں چبھ رہے ہیں، یہ کانٹے کہاں کے ہیں

فارقلیط، محمد عثمان

دلّی سے ۴۰۔ ۵۰ کلومیٹر دور پلکھوہ (ضلع میرٹھ، یو۔پی) کے ایک معزّز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا مولوی نصر اللہ فارسی کے اچھے عالم تھے اور ان کا مقامی حلقوں میں اتنا وقار تھا کہ کبھی کبھی جامع مسجد میں خطبہ دینے کے لیے انھیں دعوت دی جاتی تھی۔ کسب معاش کے لیے وہ بندوقوں کی مرمت وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دنوں میں وہ دلّی میں موجود تھے۔ اس سے انگریزوں کو شبہہ ہوا کہ وہ دیسی فوج کو بندوقیں اور اسلحہ فراہم کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا جب دلّی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو نصر اللہ صاحب روپوش ہو گئے۔ بہت دن بعد جب ہر طرف سکون اور امن و امان ہو گیا، اور کسی طرح کا خطرہ باقی نہ رہا تو وہ پلکھوہ واپس آ گئے۔

محمد عثمان کے والد کا نام محمد احمد تھا۔ وہ بھی فارسی کے رسیا تھے۔ طبابت میں بھی کچھ شُدبُد تھی۔ پیشے کے لحاظ سے ٹھیکیدار تھے۔ اسی شغل کے سلسلے میں دلّی (کشمیری دروازہ) میں ایک مکان خرید کر یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ بعد کو اسے فروخت کر دیا اور کوچۂ استاد داغ (چاندنی چوک) میں دوسرا مکان خرید لیا۔ ۱۹۴۹ء میں پلکھوہ میں رحلت کی؛ اس وقت عمر ۸۰ برس کی تھی۔

محمد عثمان فارقلیط مئی ۱۸۹۷ء میں اسی کوچۂ استاد داغ والے مکان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو ابتدائی عربی اور دینی تعلیم حاجی علی جان والوں کے مدرسے (نئی سڑک، دلّی) میں پائی۔ اس کے بعد دلی کے مختلف علماء سے منطق، معانی و بیان، دینیات اور حدیث

ماخذ: الجمعیۃ کے متعدد شمارے؛ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی۔

کی تکمیل کی۔ گھر کا ماحول بھی علمی تھا۔ بہت جلد اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں عالمانہ استعداد حاصل ہو گئی۔ ۱۹۲۲ء میں وہ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ہر طرف مذہبی مناظروں اور مباحثوں کا بازار گرم تھا؛ خاص طور پر عیسائی مشنری اس میدان میں بہت سرگرم تھے۔ وہ مناظروں کے علاوہ اسلام اور بانیِ اسلام کے خلاف کتابیں بھی شائع کرتے رہتے تھے۔ انھیں انگریزی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی، جو ظاہر اتو اپنی غیر جانبداری ثابت کرنے کو ان مناقشوں میں دخل نہیں دیتی تھی، لیکن در پردہ ان اصحاب کی ہر طرح پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔ مسلمان علما تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مشنریوں کے ان اعتراضات کا جواب دیتے رہتے تھے؛ اور جب کبھی ممکن ہوتا، کسی بڑے شہر کے لوگ اپنے ہاں پبلک مناظرے کا بھی انتظام کرتے، جس کے لیے وہ باہر سے مشہور علما کو بلا لیتے تھے۔

مناظروں کا دوسرا محاذ آریہ سماج کی طرف سے تھا۔ حالات کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے مولانا احمد سعید دہلوی نے ۱۹۲۰ء میں "انجمن اصلاح المومنین" قائم کی، جس کا مقصد مسلمان علما کو فنِ تقریر اور مناظرہ میں تربیت دینا تھا۔ فارقلیط بھی اس انجمن میں شامل ہو گئے اور بہت جلد اپنی علمیت اور نکتہ آفرینی کی بدولت ان کا صفِ اول کے مناظروں میں شمار ہونے لگا۔

محمد عثمان فارقلیط صاحب ۱۹۲۲ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے، تو وہ اب پورے جوش و خروش سے مناظرے کے میدان میں کود پڑے۔ اسلام سے متعلق ان کا علم کامل تھا ہی؛ انھوں نے ہندو دھرم اور عیسائیت کا بھی وسیع مطالعہ کیا، اور یوں لیس ہو کر مخالفین کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ اس سلسلے میں انھیں یوپی، سندھ، آندھرا پردیش (جو اس وقت حیدر آباد دکن کہلاتا تھا)، بنگال تک کا سفر کرنا پڑا، بلکہ وہ برما اور ملایا تک گئے۔ ہر جگہ انھیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، اور لوگ ان کی وسعتِ علم اور حسنِ بیان اور حاضر جوابی سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے انگریزی، ہندی، سندھی بلکہ کچھ سنسکرت بھی سیکھ لی، تاکہ مختلف مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات

حاصل کر سکیں۔ مناظرہ بازی کا یہ سلسلہ ۱۹۲۶ء تک جاری رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ فارقلیط کا اضافہ کیا، جو عہد نامۂ قدیم میں رسول کریم صلعم کے نام کے یونانی ترجمے کا معرب کلمہ ہے، اور جس کے معنی ہیں "سچ اور جھوٹ کے درمیان فیصلہ کرنے والا"۔

جمعیۃ العلمأ ہند شروع سے تحریکِ آزادی میں کانگریس کی ہمنوا رہی تھی۔ اپنے خیالات کی ترویج کے لیے جمعیۃ نے ابتدائے ۱۹۲۵ء میں سہ روزہ الجمعیۃ جاری کیا۔ اس کے سب سے پہلے ایڈیٹر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی تھے (ف: ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء)۔ جب ۱۹۲۸ء میں وہ حیدرآباد چلے گئے تو ان کی جگہ بلال احمد زبیری نے لی۔ اس زمانے میں مولانا احمد سعید دہلوی (ف: دسمبر ۱۹۵۹ء) جمعیۃ العلما کے ناظم اور جملہ کاروبار کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ محمد عثمان فارقلیط کے قدردان اور سرپرست تھے۔ انھوں نے فارقلیط صاحب کو الجمعیۃ میں مترجم اور نائب مدیر مقرر کر دیا۔ یہ ان کا صحافت سے پہلا سابقہ تھا، جو مدۃ العمر کے لیے ان کا پیشہ بن گئی۔ جوہر قابل تھا؛ دل میں کام کرنے اور آگے بڑھنے کا ولولہ تھا؛ طبیعت میں بیخوفی اور اصول کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کی جرأت تھی۔ گویا کامیاب صحافی بننے کے تمام اجزا ان کے خمیر میں موجود تھے۔ بتدریج ترقی کرتے گئے اور بالآخر زبیری صاحب کے بعد الجمعیۃ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔

"مدینہ" بجنور کا نام بھی جہادِ آزادی میں بہت مشہور ہے۔ جب اس کے مدیر نصر اللہ خان عزیز (ف: ۱۹۷۶ء) حکومتِ وقت کی نگاہِ التفات کا شکار ہو گئے، تو مدینہ کے مالک مولوی مجید حسن (ف: نومبر ۱۹۶۶ء) دلی آئے اور مولانا احمد سعید کی اجازت سے فارقلیط صاحب کو بجنور لے گئے اور انھیں "مدینہ" کا مدیر مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے "فاران" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ادھر "الجمعیۃ" کی قوم پرورانہ پالیسی حکومت کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ نتیجے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حکومت نے اس سے ضمانت طلب کر لی، جو مہیا نہ ہو سکی، اور اخبار بند ہو گیا۔ گویا فارقلیط صاحب کے لیے اپنی جگہ پر واپس آنے کا امکان نہ رہا۔

"مدینہ" کے ایک کاتب تھے، منشی عبدالرحیم صاحب۔ وہ نقل مکان کرکے لاہور چلے گئے تھے۔ چونکہ مدتوں مدینہ سے وابستہ رہے تھے، اس لیے انھیں نہ صرف صحافت سے دلچسپی تھی، بلکہ ان کے خیالات بھی قوم پرورانہ اور حکومت وقت کے خلاف تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے "مدینہ" کی وضع کا ایک سہ روزہ پرچہ "زمزم" لاہور سے نکالا، اور اس کی ادارت کے لیے فارقلیط صاحب کو بلا لیا۔

"زمزم" کے مزاج کی مناسبت سے فارقلیط صاحب نے ایک موضوع تجویز کیا: "کیا اسلام جمہوریت اور سوشلزم کی تعلیم دیتا ہے، یا بادشاہت اور آمریت کی؟" سب سے پہلا مضمون ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا شائع ہوا تھا۔ اس کی تردید مشہور احراری لیڈر چودھری افضل حق نے کی تھی۔ اس بحث میں متعدد عالموں اور دانشوروں نے حصہ لیا تھا۔ مولانا فارقلیط ہر ایک مضمون کے ساتھ چند سطریں تمہید یا خاتمے میں لکھا کرتے تھے جس میں مضمون نگار کا تعارف اور مضمون کے اہم نکات کا خلاصہ ہوتا تھا۔ ان مضامین کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے بحث کو خالص علمی سطح پر رکھا اور اسے ذاتی جدل ومخالفت کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ یہ بحث کوئی ڈیڑھ دو برس ۱۹۳۸ء تک چلی۔ بعد کو ان مضامین کا مجموعہ لاہور اور بجنور سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۸ء ہی میں انھوں نے "زمزم" کی ادارت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ مولانا فارقلیط تقسیم ملک کے مخالف تھے، وہ جہاں کہیں بھی رہے اور جب بھی انھیں کوئی موقع ملا، لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ جب ۱۹۴۷ء میں حکومت نے تقسیم کا اعلان کیا، تو وہ لاہور سے دلی چلے آئے۔ اسی سال دسمبر میں جمعیۃ العلماء ہند نے اخبار "الجمعیۃ" کے دوبارہ اجرا کا فیصلہ کیا اور اب کے اسے روزنامہ کی شکل دے دی۔ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی (ف: اگست ۱۹۶۲ء) اس وقت جمعیۃ العلماء کے ناظمِ عمومی تھے؛ انھوں نے اس کی ادارت مولانا فارقلیط کے سپرد کردی۔

تقسیم ملک کے بعد یہاں کے مسلمان بہت ہراساں اور بددل تھے۔ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے تھے۔ مولانا فارقلیط نے اس زمانے میں تاریخی اور سنجیدہ اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے "الجمعیۃ" کے اداریوں اور مضامین کے ذریعے سے ان کی ڈھارس بندھائی

اور انھیں مشورہ دیا کہ انھیں ثابت قدمی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ترکِ وطن کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ بحمد اللہ ان کے مدلّل مضامین، موثر اسلوب بیان اور مخلصانہ مشوروں سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے، اور لوگوں کے دلوں میں خود اعتمادی عود کر آئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اصحاب مجاز پر بھی اسی بیخوفی اور جرأت سے کڑی نکتہ چینی کی، جس سے انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا۔ اس میں انھیں قید و بند کی منزل سے بھی گزرنا پڑا، لیکن اس ابتلا میں بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے اور وہ بدستور اپنی انتخاب کردہ راہ پر گامزن رہے۔

"الجمعیۃ" کے دور ثانی میں ربع صدی تک اس کی ادارت مولانا فارقلیط کے ہاتھ میں رہی۔ اب ان کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تھی۔ عمر کے ساتھ کمزور بھی بہت ہو گئے تھے۔ آخر کار انھوں نے اس بار سے سبکدوش ہونے کی خواہش ظاہر کی اور مارچ ۱۹۷۳ء میں ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ اگرچہ وہ اس کے بعد بھی گاہے ماہے اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے، لیکن اب ان کا اخبار سے باقاعدہ تعلق منقطع ہو گیا تھا۔ آخری ایام میں صحت بہت سقیم ہو گئی تھی۔ بار بار بیمار رہنے لگے تھے۔ جون ۱۹۷۶ء کے شروع میں فالج کا حملہ ہوا، جو تندرستی کی اس حالت میں مہلک ثابت ہوا۔ بروز ہفتہ ۱۲ جون ۱۹۷۶ء فجر سے کچھ پہلے خالق حقیقی سے جا ملے۔ گیارہ بجے کے قریب نماز جنازہ جامع مسجد، دلّی میں پڑھی گئی۔ اس کے بعد لاش ان کے وطن ملیح آباد لے جائی گئی، وہاں دوبارہ نماز جنازہ ہوئی اور قریب عصر انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔

بشیر صدیقی انبالوی نے تاریخ کہی:

کس کے غم میں ہیں صحافی اشکبار	موت سے ہے کون ہارے، ہمکنار
آہ، مدیرِ الجمعیتہ، فارقلیط	اٹھ گیا: "مقبول وہ مضمون نگار"

(۱۳۹۶)

چونکہ ساری عمر صحافت کی جان لیوا ذمہ داریوں میں گزری، اس لیے تصنیف و تالیف کے لیے وقت کم ملا۔ انھوں نے سہ روزہ "الجمعیۃ" کی ادارت کے دور میں ایک افسانہ "ازلا

کے عنوان سے لکھا تھا، جو بالاقساط اسی اخبار میں مدتوں چھپتا رہا؛ بعد کو یہ کتابی شکل میں شائع ہو گیا تھا۔ اس میں انھوں نے عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی صداقت پر دلائل فراہم کیے ہیں۔ افسانے کا پلاٹ اسپین میں اسلام کی صداقت۔ یہ ایک عیسائی لڑکی اِزبلا کی قبولِ اسلام کی داستان ہے، جس میں اسلام کی عیسائیت پر فوقیت ثابت کی گئی ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ بعد کو رنگون (برما) سے اس کا انگریزی ترجمہ اور کلکتے سے بنگالی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ ایک مختصر کتاب "رہنمائے عقل" ادارۂ زمزم، لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی؛ اس میں معاملاتِ دین و دنیا میں عقل کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک رسالہ "کلید خود شناسی" کے نام سے علمی نفسیات پر ہے؛ یہ بھی ادارۂ زمزم نے شائع کیا تھا۔ فارقلیط مرحوم کل ہند مدیرانِ اردو کانفرنس کے اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ (نومبر ۱۹۷۳ء) کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبۂ صدارت دیا تھا، وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔

مبارز الدین رفعتؔ سید

سہ شنبہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں پشتوں سے دین و دنیا کا خوشگوار اجتماع چلا آرہا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ عادل شاہی دور میں بیجاپور پہنچے تھے۔ حضرت سید شاہ حبیب اللہ ان کے جدِ اعلیٰ تھے، جن کا مزار "موتی گنبد" آج بھی بیجاپور میں ان کی برگزیدگی کا نشان موجود ہے۔ بیجاپور کے زوال کے بعد یہ لوگ یہاں سے نکلے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر حیدرآباد پہنچے۔ جب سے یہی شہر اس خاندان کا ملجا و ماوا بن گیا۔

مبارز الدین رفعت کی ننھیال بھی کچھ کم ممتاز نہیں تھی۔ ان کی والدہ حضرت سید محمود مکی (مکی میاں) کی صاحبزادی تھیں۔ پشتوں کی روایت کے تحت مدتوں مشرقی علوم اور دینیات خاندان کا طرۂ امتیاز رہا۔ اس گھرانے میں سب سے پہلے جس شخص نے انگریزی پڑھی، وہ سید زین العابدین تھے، جو بعد کو ریاست نظام میں انجینیر مقرر ہوئے تھے۔ یہی رفعت صاحب کے دادا تھے۔

سید زین العابدین کے سب کے چھوٹے صاحبزادے کا نام سید نظام الدین تھا، جو رفعت کے والد تھے۔ وہ ریاست کے محکمۂ جنگلات میں خاصے اہم عہدے پر فائز تھے، اور رئیسانہ ٹھاٹ سے اپنے عالیشان مکان میں رہتے تھے۔ بفضلہ تعالیٰ ہر طرح کی آسایش میسر تھی۔ معقول تنخواہ تھی۔ خدا نے اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ غرض نے غمِ دزدونے غم کالا۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! دورانِ ملازمت میں جن دنوں

ماخذ: گورنمنٹ کالج گلبرگہ میگزین (مبارز الدین رفعت نمبر)، بیگم رفعت

وہ نظام آباد میں مقیم تھے، وہاں ایک دن ان کی ایک درویش کریم اللہ شاہ سے مڈبھیڑ ہوگئی طبیعت پہلے سے زہد و ورع کی طرف مائل تھی اور اپنے خاندانی پس منظر کی بدولت اہل اللہ کی صحبت کے جویا رہتے تھے۔ لہٰذا کریم اللہ شاہ کی تلقین نے ان پر خاص اثر کیا، اور یہ ان کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ اس سے ان کی سلامت روی کی روش اور راسخ ہوگئی۔

اتفاق دیکھیے۔ اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ سید نظام الدین کے افسرِ اعلیٰ کو کسی زمیندار نے رشوت دی کہ وہ ایک غریب کسان کی تھوڑی سی زمین کا داخل خارج اس کے نام کر دیں، تاکہ ان کی جاداد کا کھانچا پورا ہو جائے۔ افسر اعلیٰ کے لیے اس وقت تک کوئی اقدام ممکن نہ تھا جب تک نیچے سے سید نظام الدین اس زمیندار کے حق میں اور اس کسان کے خلاف اپنی رپوٹ لکھ کر مناسب تجویز نہ پیش کریں۔ چنانچہ افسر مذکور نے ان سے یہ رپوٹ لکھنے کو کہا۔ سید نظام الدین پر خشیت اللہ کا رنگ چڑھ چکا تھا، اس کے ہوتے ہوئے بھلا وہ اس صریح بددیانتی کا ارتکاب کیوں کرنے لگے تھے! انھوں نے اس ظلم کی تائید کرنے سے انکار کر دیا، اور جب افسر نے زیادہ اصرار کیا، تو انھوں نے ملازمت ہی سے استعفا دے دیا، اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر حیدر آباد چلے آئے۔

اب انھوں نے تجارت کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنایا، مرشد نے بھی یہی مشورہ دیا کہ تجارت سنت ہے۔ چنانچہ سید نظام الدین نے اپنی بہت سی جاداد فروخت کر دی اور اس روپے سے "اقبال برادرس" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی، جو ٹھیکیداری کا کام کرتی تھی اور اس میں مکانوں کی تعمیر بھی شامل تھی۔ خدا کے فضل اور سید نظام الدین کی دیانتداری اور اخلاص کی بدولت یہ تجربہ کامیاب رہا اور اس کمپنی نے خوب کمایا۔

۵؎ روایت ہے کہ کریم اللہ شاہ سکھ سے مسلمان ہوئے تھے، اس کے بعد انکی عبادت اور ریاضت کی کہ برگزیدگانِ الٰہی میں شمار ہونے لگا۔

سید نظام الدین کا ۱۹۳۸ء میں اچانک دل کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ ان کے خاندان کے لیے دورِ ابتلا کا آغاز ثابت ہوا۔ مرحوم نے کنبہ پروری کے خیال سے خاندان کے بہت سے اصحاب کو کمپنی میں شامل کر لیا تھا۔ ان کی وفات پر ان لوگوں نے پورے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور مرحوم کے بیوی بچوں کو ایک حبہ تک نہ دیا۔

مبارز الدین کا بچپن اپنے والد کے پاس گزرا۔ چونکہ وہ محکمۂ جنگلات میں ملازم تھے، اس لیے ان کا بیشتر وقت دوروں میں کٹتا تھا، مبارز الدین بھی ان کے ساتھ رہتے۔ لامحالہ ایسے ماحول میں ان کی تعلیم میں باقاعدگی پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ جب والد کو فرصت ہوتی، تو ان سے کچھ پڑھ لیتے؛ لیکن وہ بھی اپنے فرائضِ منصبی سے مجبور، پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ مبارز الدین کے ایک ماموں سید محمد صدیق محمودی پربھنی (ریاست حیدر آباد) کے سرکاری اسکول میں مدرس تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے بہنوئی سے ملنے کو آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بچے کی تعلیم خراب ہورہی ہے؛ وہ سید نظام الدین کی اجازت سے بھانجے کو اپنے ساتھ پربھنی لے گئے، اور گھر پر خود ہی انھیں پڑھانے لگے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے، جب مبارز الدین کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ سال بھر میں انھوں نے اتنی استعداد پیدا کر لی کہ ماموں نے انھیں اپنے ہی اسکول کے چھٹے درجے میں داخلہ دلوا دیا۔ جب سال کے آخر میں انھوں نے اس درجے کا امتحان پاس کر لیا، تو اب حیدر آباد چلے آئے۔ یہاں بھی کئی اسکول بدلے اور آخر کار ۱۹۳۶ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی پہنچے۔ یہیں وہ بی، اے کے طالبعلم تھے، جب ان کے والد سید نظام الدین کا ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوگیا۔ ان سے چھوٹے تین بھائی اور دو بہنیں اور تھیں؛ سب سے چھوٹے بھائی کی عمر اس وقت صرف نو مہینے کی تھی۔ اس پورے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری رفعت کے کمزور کندھوں پر آپڑی۔ "اقبال برادرس" کی تجارت سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ بند ہوگئی، اور خود طالبعلم تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غریب کے دل پر کیا گزرتی ہوگی! بہر حال

انھوں نے تعلیم جاری رکھی ۔ کچھ جاداد فروخت کردی اور تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی رہی ۔
انھوں نے ۱۹۴۳ء میں ایم ، اے (فارسی) کی سند حاصل کی ۔ اس کے بعد وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے ، لیکن اپنے نگراں کے عدمِ تعاون ، بلکہ عدمِ توجّہی کے باعث ڈیڑھ برس اس میں ضائع کرنے کے بعد بھی کوئی قابلِ لحاظ پیشرفت نہ ہوئی ، تو اس بھاری پتھر کو چوم کے چھوڑ دیا ، اور وہیں ۱۹۴۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ملحقہ سٹی کالج میں فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے ۔ اگلے برس (دسمبر ۱۹۴۶ء میں) اسی عہدے پر اورنگ آباد کالج تبادلہ ہو گیا ۔ وہ ۱۹۵۴ء تک آٹھ برس یہاں رہے ۔ اورنگ آباد کے قیام کے دوران میں انھوں نے ۱۹۵۰ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم ، اے اردو کی سند لی ۔ اورنگ آباد کے بعد وہ گورنمنٹ کالج ، گلبرگہ[ؐ] (حال ریاست کرناٹک) میں اردو اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے ۔ قیامِ گلبرگہ کے زمانے میں "آستانہ حضرت گیسو دراز بندہ نواز سے شائع ہونے والے "ماہنامہ "شہباز" کے نگران بھی رہے ۔ وہ گلبرگہ میں ۹ برس (۱۹۵۴ - ۱۹۶۳ء) اور پھر مہارانی کالج ، میسور کی پرنسپلی پر دس برس فائز رہنے کے بعد بعمرِ ۵۵ سال ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے ۔ اس کے بعد بھی وہ میسور ہی میں مقیم رہے ۔
رفعت کو لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا ۔ انوار العلوم ہائی اسکول کے دور میں وہ اس کے قلمی میگزین کے اور پھر سٹی کالج کے میگزین "الموسیٰ" کے اور اخیر میں مجلۂ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایڈیٹر رہے ۔ وطن سے باہر ان کا سب سے پہلا مضمون "معاشیات پر ابن خلدون کے خیالات" معارف (جولائی ، اگست ۱۹۳۷ء) میں چھپا ، جب ان کی عمر صرف ۱۸ - ۱۹ برس کی تھی ۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ، اس سے ظاہر

ؐ لطیفہ یہ ہے کہ گلبرگہ گورنمنٹ کالج کی عمارت ان کے دادا سید زین العابدین نے بنوائی تھی ، جب وہ ریاست کے انجینیر تھے ۔ رفعت بڑی مسرت سے کہا کرتے تھے کہ دادا جان کو کیا معلوم تھا کہ آج جو عمارت میں تعمیر کرا رہا ہوں ، ایک دن میرا پوتا اسی جگہ آکر پڑھائیگا ۔

ہے کہ ان کی خداداد صلاحیت کس پایے کی تھی ۔ ان کی کوئی ۳۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں تصنیفات، تالیفات، تراجم سبھی کچھ ہے ۔ انھیں ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس باب میں ان کی دو کتابیں: فلپ حتی کی "عرب اور اسلام" انگریزی سے اور "تاریخ ادبیاتِ ایران" از رضا زادہ شفق فارسی سے، بہت مقبول ہوئیں۔ کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین کی بھی خاصی تعداد رسالوں میں منتشر پڑی ہے۔
وہ ابھی بی اے کے طالب علم تھے کہ ۱۹۳۷ء میں (ان کے والد کے انتقال سے کوئی چھ مہینے قبل) ان کا نکاح ہو گیا، رخصتی ۴ سال بعد ۱۹۴۰ء میں ہوئی، جب وہ ایم اے کے درجہ میں تھے ۔ ان کی بیوی (معین النسا بیگم) میر حسین علی مرحوم (ف: ۱۷ اگست ۱۹۷۶ء) سابق نائب معتمد تعلیمات کی صاحبزادی ہیں۔ رفعت نے ان کا عرف اقبال سلطانہ رکھ لیا تھا، اور بالعموم انھیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ رفعت بھی خود ان کا عرف تھا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔
صحت شروع میں تو ماشاء اللہ تسلی بخش رہی، لیکن کثرتِ کار اور سگرٹ نوشی میں بے اعتدالی نے فشارِ دم (بلڈ پریشر) کا عارضہ پیدا کر دیا۔ یہ قیامِ گلبرگہ کے اوائل یعنی ۱۹۵۴ء کی بات ہے ۔ ۱۹۷۰ء میں جسم کے بائیں حصے پر فالج کا حملہ ہوا۔ بارے دوا دوش سے افاقہ ہو گیا۔ لیکن ہے یہ کہ اس کے بعد پوری صحت کا ایک دن نصیب نہ ہوا۔ جمعہ ۱۸ جون ۱۹۷۶ء نصف شب کے چند منٹ بعد اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے میسور میں انتقال ہوا۔ وہیں اگلے دن (سنیچر) بعد نمازِ عشا بنی منٹپ کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے ۔ اِنّا للہِ وَ اِنّا اِلیہِ راجِعُون ۔ اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں ۔

عزیز، نصر اللہ خان، ملک

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں، مدینہ (بجنور) اور اس کے مدیر شہیر نصر اللہ خان عزیز کے نام سے کون واقف نہیں ہوگا! لیکن ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ بدلے ہوئے حالات میں مدینہ کی وہ اہمیت نہ رہی اور جب خبر آئی کہ نصر اللہ خان عزیز کا بھی لاہور میں انتقال ہوگیا، تو کئی بھولی بسری یادیں تازہ ہوگئیں۔

نصر اللہ خان ۱۸ فروری ۱۸۹۷ء کو گوجرانوالہ (پنجاب، پاکستان) کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ دسویں تک تعلیم گوجرانوالہ ہی میں پائی۔ اس کے بعد انھوں نے زندگی میں پہلی ملازمت بحیثیت مدرس کی۔ سیاسی تحریک کے آغاز میں ترکِ موالات حکومت کے خلاف ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے پروگرام میں ایک شق سرکاری تعلیمگاہوں کے بائیکاٹ کی بھی تھی؛ جس کا لازمی نتیجہ قومی اسکولوں کا قیام تھا۔ چنانچہ جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ اسی زمانے میں وجود میں آئی۔ اسی طرح مشہور شعلہ زبان مقرر سید عطا اللہ شاہ بخاری (ف: اگست ۱۹۶۱ء) نے جو بعد کو مدتوں جماعتِ احرار کا نفسِ ناطقہ بنے رہے، ۱۹۲۰ء میں مولانا ابو الکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کے نام پر گجرات (پاکستان) میں ایک آزاد ہائی اسکول قائم کیا تھا۔ اس کے ہیڈ ماسٹر چودھری فیض محمد ایم اے مقرر ہوئے اور سکنڈ ماسٹر ملک نصر اللہ خان عزیز۔ اس اسکول کا افتتاح مولانا آزاد ہی نے کیا تھا۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ سیاسی سرگرمیوں کے سرد پڑ جانے کے بعد اسکول کا یہ نام ترک کرکے اس کی جگہ اسلامیہ ہائی اسکول رکھ دیا گیا؛ یہ آج تک چل رہا ہے۔

ابھی وہ کالج کے درجوں میں تھے کہ الہلال اور ہمدرد اور زمیندار کی ولولہ انگیز، اور شعلہ بار اور قوم پرورانہ نگارشات کا جادو ان پر چل گیا ۔ چنانچہ جب کالج سے نکلے، تو اس عزم کے ساتھ کہ صحافت کو اپنا وظیفہ حیات بنائینگے ۔ آزاد ہائی اسکول کی ملازمت چھوڑنے کے بعد انھوں نے اپنے صحافت کے خواب کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا ۔ لیکن اس کام کا نہ انھیں کوئی علم تھا، نہ تجربہ ۔ لہذا لاہور کے مختلف رسالوں میں کام کا آغاز کیا اور تربیت حاصل کی ۔

۱۹۲۸ء میں اپنے زمانے کے مشہور ہفتہ وار "مدینہ" (بجنور) کے مدیر مقرر ہوئے ۔ کانگریس اور خلافت کی تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی اور صحافتی محاذ پر "مدینہ" بھی صف اول کے اخباروں کے شانہ بشانہ کام کر رہا تھا ۔ ایسے اہم اخبار کی ادارت ان کے لیے بجا طور پر وجہ امتیاز و افتخار تھی ۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کیا اور نمک سازی کی تحریک شروع ہوئی ۔ شہر شہر چوراہوں پر عوام نے انگیٹھیوں پر کڑھائیاں چڑھا دیں اور ان میں نمک بنا کر علامتی قانون شکنی میں حصہ لیا ۔ ع ۔ ہ ۔ صاحب نے بھی "مدینہ" میں تابڑ توڑ تحریک کی تائید میں اداریے لکھے ۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی توقع کی جاسکتی تھی ۔ گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا اور ایک سال کی سزائے قید ہوگئی ۔ قید کا زمانہ بجنور اور گونڈہ جیلوں میں کٹا ۔

۱۹۳۶ء میں وہ لاہور واپس آگئے ۔ مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) نے انھیں زمیندار کے شعبۂ ادارت میں شرکت کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کرلی ۔ سال بھر یہاں رہنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۷ء میں اپنا ذاتی ہفت روزہ "پاسبان" جاری کیا ۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث پرچہ جاری نہ رہ سکا ۔

۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ "زمزم" کے مدیر مقرر ہوگئے، جسے ان کے "مدینہ" کے زمانے کے ایک ہمکار منشی عبدالرحیم نے لاہور سے جاری کیا تھا ۔ دو سال بعد ۱۹۴۰ء میں انھوں نے ہفتہ وار "مسلمان" اور پھر ۱۹۴۴ء میں "کوثر" (ہفت روزہ) جاری کیے ۔ لیکن

روپے کی کمی ہمیشہ سدِ راہ رہی اور ان کی مساعی پروان نہ چڑھ سکیں
تقسیم ملک کے بعد وہ لاہور ہی میں مقیم ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جماعتِ اسلامی نے اپنا روزنامہ "تسنیم" جاری کیا تھا۔ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے پرانے دوستوں میں سے تھے اور جماعتِ اسلامی کے رکن تھے۔ چنانچہ وہ "تسنیم" کے ایڈیٹر منتخب کیے گئے، اور اس عہدے پر ۱۹۵۵ء تک فائز رہے۔ اس اثنا میں ۱۹۵۳ء میں جیل بھی جانا پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے پھر اپنا ہفتہ وار "ایشیا" جاری کیا۔ وہ آخر تک اس کے مدیر رہے، اگرچہ ایک زمانے سے اس کی ملکیت دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی۔
مرحوم شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے دو مجموعے "نیتر و نشتر" اور "کاروانِ شوق" شائع ہو چکے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی۔ متعدد نثری تخلیقات بھی ان سے یادگار ہیں؛ ان میں "سیرتِ امام احمد بن حنبل" اور "اسلامی زندگی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں
انھیں بہت دنوں سے عارضۂ قلب لاحق تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۴ء میں اس کا حملہ ہوا، جس کی انھوں نے پروا نہ کی۔ جون ۱۹۷۶ء کے آخر میں ان کے مثانے میں کچھ تکلیف پیدا ہوئی، تو اسپتال چلے گئے۔ وہیں جمعہ ۲ جولائی ۱۹۷۶ء صبحِ صادق ساڑھے تین بجے دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اسی دن جنازہ اٹھا اور انھیں قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنّا للہ و اِنّا اِلیہ راجعون۔
ذیل کے چند شعر ان کے مجموعہ "کاروانِ شوق" سے ماخوذ ہیں، جو جناب مشفق خواجہ نے مہیا کیے ہیں۔ روایتی انداز کا پختہ کلام ہے:

دل کی دنیا فنا نہ ہو جائے	اتنا جلووں کو بے نقاب نہ کر
دل کے گوشے میں دے جگہ ہم کو	بزم میں چاہے باریاب نہ کر
لطف تو لطف، اب جفا بھی نہیں	آہ! اتنا بھی انقلاب نہ کر

یہی جی چاہتا ہے اب کہ اک دن — گلے میں ڈال کر ہم ان کے باہیں
کہیں: اے جانِ جاں! دیکھو اِدھر تو — ملاؤ تو نگاہوں سے نگاہیں
یہ کب تک بےرخی ہم سے رہیگی — بھرینگے ہجر میں کب تک ہم آہیں
ترے جور و جفا کب تک سہیں ہم! — تغافل کو ترے کب تک سراہیں
تو ہی اے جانِ جاں! فرما کہ آخر — کہاں تک رسمِ الفت کو نباہیں
یہ کب تک گریۂ شب کی مصیبت — وفورِ کرب سے کب تک کراہیں

عزیز! ان کے قدم جن پر پڑے تھے
چلو، ہم چوم لیں وہ پاک راہیں

واقفِ راز کوئی ہے ہی نہیں — موت ڈرنے کی؛ ورنہ شے ہی نہیں
ہے محبت میں بھی عجیب سرور — نشہ اور جہاں میں، مے ہی نہیں

ایک بار اس رُوئے روشن کا تصور کیجیے — ہر طرف جلوے ہی جلوے پھر نمایاں دیکھیے
وہ نہ ہوں نزدیک تو دنیا کو ویراں جانیے — پاس آجائیں تو ہر جانب گلستاں دیکھیے
جی میں آتا ہے کہ اک دن چھیڑ کر ان کو عزیز! — وہ جبینِ قہر آگیں عنبر افشاں دیکھیے

اپنے لطف و کرم میں دیر نہ کر — قصۂ غم دراز ہے میرا
جس نے صبر و قرار چھینا ہے — خود وہی دلنواز ہے میرا
میری باتیں وہی سمجھتا ہے — جو شناسائے راز ہے میرا
میرے لفظوں کے پیرہن پہ نہ جا — اک حقیقت مجاز ہے میرا

معاذاللہ، مجبوری محبت کی بھی کیا شے ہے
بھلاتا ہوں ہزار ان کو، مگر یاد آ ہی جاتے ہیں

اس میں گزر نہیں ہے کسی کا ترے بغیر
یہ رہ گزارِ دل ہے، تری رہگزر نہیں

ہر چند ناروا ہے محبت میں اضطراب
لیکن بیانِ شوق میں اس سے مفر نہیں

پہلا سا مرے حال پہ اکرام نہیں ہے
یعنی وہ مری صبح نہیں، شام نہیں ہے

رسوا ہے وہی، جو نہیں رسوائے محبت
جو عشق میں ناکام ہے، ناکام نہیں ہے

اے ذوقِ جنوں! اور بڑھے جوشِ جنوں کا
دامن ہے مرا، جامۂ احرام نہیں ہے

ممکن نہیں، ابہام نہ ہو عرض و بیاں میں
لیکن نگہِ شوق میں ابہام نہیں ہے

جب دیکھو، عزیز اس کے ہی کوچے میں ہو بیٹھے
کیا اس کے سوا کوئی تمھیں کام نہیں ہے!

کیف بارہ بنکوی، حیدر حسین

ان کے والد محمد رضا صاحب پولیس میں ملازم تھے۔ کیف ۲۸ فروری ۱۹۱۲ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے، لیکن وطن مالوف نور پور (ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی) تھا۔ ان کی ایک ہمشیر کی شادی بارہ بنکی میں ہوئی تھی۔ سات برس کے تھے، جب بہن اور بہنوئی انھیں اپنے ساتھ بارہ بنکی لے گئے۔ اس لیے ان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم بارہ بنکی ہی میں ہوئی۔ دسویں کی سند لے کر انھوں نے فیض آباد میں نارمل ٹریننگ حاصل کی اور اس کے بعد ایک پرائمری اسکول میں مدرس کی اسامی حاصل کر لی۔ اسی ملازمت کے دوران میں انھوں نے انٹر کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد ہنلٹ اسلامیہ انٹر کالج میں ڈرائنگ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اس اثنا میں انھوں نے خط کتابت کے ذریعہ سے بمبئی آرٹ ڈپلوما بھی حاصل کر لیا۔ ملازمت کا پورا زمانہ ہنلٹ کالج میں گزرا، جہاں سے ۳۲ سال کی طویل خدمت کے بعد ۱۹۷۳ء میں سبکدوش ہوئے۔ شعر گوئی کی طرف میلان طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ بارہ بنکی میں قرار تخلص (خمار بارہ بنکوی کے چچا) صاحب فن استاد موجود تھے، مشورۂ سخن ان سے شروع کیا اور یہ تعلق استاد کی وفات تک قائم رہا۔ اس کے بعد انھوں نے خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔ شہر میں شاید ہی کبھی کوئی ادبی اور شعری نشست ہوتی ہو جس میں انھیں شرکت کی دعوت نہ ملے۔ خود بھی مشاعرے اور مجلسیں کرتے رہتے تھے بلکہ ایک "بزم افقر" قائم کی تھی، جس کے زیر اہتمام انھوں نے بعض معرکے کے مشاعرے کیے۔ اگرچہ خاص توجہ غزل کی طرف تھی، لیکن وہ کسی میدان میں بھی بند نہیں تھے۔

ماخذ: قومی آواز (روزنامہ) لکھنؤ

نعت و منقبت، مرثیہ و نوحہ، نظمیں بہت کچھ لکھا، مشکل سے مشکل زمینوں میں غزلیں کہیں اور ہمچشموں سے اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا لیا۔
افسوس کہ مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ معلوم ہوا ہے کہ اب "بزمِ افقر" انتخاب شائع کرنے والی ہے۔
تقریباً چھ مہینے کی علالت کے بعد ۶ اگست ۱۹۷۶ء کو رحلت کی۔
کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

وہ کیا نگاہ اُٹھائیگا سوئے دَیر و حرم — نَفَس نَفَس میں ہوں جس کے ہزار ہا عالم
جمال یہ ہے تصوّر بھی جگمگا اُٹھا — کمال یہ ہے کہ اک نقش بھی نہیں مبہم

آپ کے غم میں کیا فکرِ دنیا و دیں — آپ کا غم ہے خود حاصلِ دو جہاں

بقا کی فکر کرو خود ہی زندگی کے لیے — زمانہ کچھ نہیں کرتا کبھی کسی کے لیے
کمال جب ہے کہ اُس راہ میں چراغ جلاؤ — جو مدّتوں سے ترستی ہے روشنی کے لیے
فریبِ شوق، فریبِ نظر، فریبِ خیال — ہزار دام ہیں اک ذوقِ آگہی کے لیے
نہ جانے کتنی بہاروں کا خوں ہوا ہوگا — نگار خانۂ عالم کی دلکشی کے لیے

دل کے واسطے ان کا قہر بھی نوازش ہے — آئینہ نہیں کرتا فرقِ شعلہ و شبنم

بقدرِ ظرفِ طلبگار ہے عروج و زوال — زمیں پہ ہے وہی ذرّہ جو آفتاب نہیں

بہارِ لالہ و گل ہو کہ بزمِ شمس و قمر — جہاں ہے حسنِ حقیقت، کسی حجاب میں ہے

رہِ غم میں اک ایسی منزلِ عرفاں بھی آتی ہے — جہاں باطل میں بھی شانِ حقیقت پائی جاتی ہے

ہنین ریحانی لکھنوی، ریورنڈ شفاعت

ان کا خاندان یوپی کے مشہور شہر اعظم گڑھ کا تھا، جہاں سے ان کے والد سیّد یاد علی زیدی کسبِ معاش کے لیے مدرّس بن کر لکھنؤ چلے آئے اور پھر مدۃ العمر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ ریحانی بھی ۱۹ مئی ۱۹۱۲ء کو اعظم گڑھ ہی میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بہت کمسنی میں والد کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور چونکہ ان کی تعلیم و تربیت بھی لکھنؤ میں ہوئی اس لیے لکھنوی کہلائے۔

ریحانی صاحب نے دسویں درجہ کی سند لے کر مدرّسی کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی دوران میں سیّد اولاد حسین شاداں بلگرامی (ف: جنوری ۱۹۴۸ء) سے پرائیوٹ طور پر فارسی پڑھنا شروع کی۔ شاداں مرحوم فارسی کے استادِ شہیر تھے۔ وہ پہلے دارالعلوم، رامپور میں فارسی کے مدرّس رہے، اس کے بعد لاہور چلے گئے۔ میری ان سے ۱۹۲۶ء میں لاہور ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں بھی اورینٹل کالج میں طلبہ کو منشی فاضل کے امتحان کے لیے تیار کرتے۔ ریحانی نے بھی ان سے فارسی کی تکمیل کرنے کے بعد منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔

وہ ۱۹۳۰ء کا سال اگروال کالج الہ آباد میں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۸ء کریم نگر اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے! وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور سینٹ پیٹرک ہائی اسکول سکندرآباد میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ سات برس بعد اسی عہدے پر میتھوڈسٹ اسکول حیدرآباد میں کام کرنے لگے۔ انھوں نے الہ آباد کے دوران قیام میں بشپ جان بنرجی کی تحریک پر مسیحیت قبول کر لی تھی۔ اب انھوں نے پادری

ماخذ: پیغامِ حیات (ریحانی)، سیموئیل وی بھجن طالب شاہ آبادی، حیدرآباد؛ سوئی ہنین دیسپر ریحانی، حیدرآباد

بننے کا فیصلہ کرلیا، اور پانچ برس میں اس سلسلے کے تمام امتحانات کی سند حاصل کرلی۔ چونکہ یہ سارے امتحانات انگریزی میں ہوتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انگریزی میں بھی خاصی استعداد پیدا کرلی ہوگی۔ یوں بھی مطالعے کا شوق تھا اور ان کی معلومات عامہ حیرتناک حد تک وسیع اور متنوع تھیں۔

وہ ۱۹۵۳ء میں پادری بن گئے۔ اس کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر دیا، اور پینٹھوڈسٹ ہندستانی چرچ کے عملے میں بطور پاسٹر شامل ہوگئے۔ یہاں ان کا تعلق ادارۂ مراسلاتی نصاب بائبل (زندگی کا نور) سے تھا، جس کے وہ ڈائرکٹر تھے۔ وہ اپنی وفات تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔

لکھنؤ کے طویل قیام کے زمانے میں انھیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو کلام پر میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، (ف: جون ۱۹۶۷ء) سے اصلاح لی۔ وہ استاد کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے تھے اور خود اثر بھی انھیں اپنے لیے "باعث افتخار" سمجھتے تھے۔ فارسی میں مشورہ آقائے فرخ شیرازی سے رہا۔ ریحانی کا غزلیہ کلام "موج گل" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ (حیدرآباد، ۱۹۶۵ء) بعد کا بہت سا کلام رسائل میں منتشر پڑا ہے۔ ایک تذکرہ بھی "پیغام حیات" کے عنوان سے شائع کیا تھا (حیدرآباد، ۱۹۷۳ء)؛ اس میں ۴۴ مسیحی شعرا کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام کا نمونہ ہے۔ یہ سارا کلام مسیحی موضوعات سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ تین مختصر مجموعے اور ہیں، جن میں انھوں نے ہندستان کے بعض مسیحی شاعروں کے کلام کا انتخاب شامل کیا ہے۔ ان کے نام ہیں: زنگزار۔ (۱۹۶۸ء)؛ نوائے ازل (۱۹۶۹ء)؛ اور راز محبت (۱۹۷۰ء)۔ اسی طرح ایک اور مجموعے سوغات روح (۱۹۷۵ء) میں غیر مسیحی شعرا کے ایسے کلام کا انتخاب ہے، جس میں انھوں نے حضرت مریم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، یا اس میں کسی مسیحی عقیدے کا ذکر ہے۔

ریحانی نے سکندرآباد ہی میں شادی کی تھی۔ بیوی دو بچے اپنی یادگار چھوڑ کر مارچ

۱۹۴۷ء میں انتقال کر گئیں۔ بڑی ایک لڑکی ہے جس نے ایک مسلمان سے شادی کر کے اسلام قبول کر لیا؛ وہ آج کل شولا پور میں نرس کا کام کرتی ہے۔ ان سے چھوٹے لڑکے ہیں، موسیٰ ہنین۔ یہ حیدر آباد میں ایک انگریزی میڈیم اسکول چلاتے ہیں۔
ریحانی پر مارچ ۱۹۷۶ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد جو بستر سے لگے تو حالت رفتہ رفتہ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ جب گھر پر علاج معالجے سے کوئی افاقے کی صورت نظر نہ آئی، تو انھیں گاندھی اسپتال، سکندر آباد میں داخل کر دیا گیا۔ وہیں جمعرات ۱۲ اگست ۱۹۷۶ء کو دن کے ایک بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اگلے دن جمعہ ۱۳ اگست صبح کے وقت نارائن گوڑہ (حیدر آباد) کے مسیحی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔
"موجِ گل" میں ان کے ۱۹۶۳ء تک کے کلام کا انتخاب ہے۔ کلام میں پختگی اور سنجیدگی ایک ایک مصرعے سے نمایاں ہے، جس کی اثر کے سے استاد کے شاگرد سے توقع کی جا سکتی ہے۔ کہیں کہیں مضمون آفرینی کی کوشش بھی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمارے دل سے اے ساقی! زباں تک بات آپہنچی
کہاں سے تشنہ کامی میں کہاں تک بات آپہنچی
نہ جانے مجھ کو لے جاتا کہاں ذوقِ جبیں سائی
خدا کا شکر، ترے آستاں تک بات آپہنچی

اگر حق کو نہیں، کر خود کو سجدہ   ہو کوئی سنگِ در، ننگِ جبیں ہے

صحرا ابھی ہے متاعِ گلستاں لیے ہوئے   فطرت اگر ہو ذوقِ بہاراں لیے ہوئے

وہ بدنصیب کہ جس پر تری نگاہ نہیں   کہیں بھی دہر میں اس کے لیے پناہ نہیں

ہمارے ذوقِ نظر کا قصور ہے سارا — وگرنہ کونسی جا اس کی جلوہ گاہ نہیں
ہر ایک گام پہ ہوتا ہے امتحاں اے شیخ! — یہ بتکدے کا ہے رستا، حرم کی راہ نہیں

گھٹا ہے گھنگھور، رات اندھیری، رواں ہے منجدھار میں سفینہ
دکھائی دیتا نہیں ہے ساحل، نہ جانے کیا ناخدا کریں گے

آنکھ ملتے ہی چپ لگی ایسی — کہ بیاں دل کا ماجرا نہ ہوا

کیا کہیں، کیونکر کہیں، کس سے کہیں، اس دور میں
چشمِ نامحرم سے زخمِ دل چھپانا ہی پڑا

محبت تو ہماری کفر ٹھہری زہد والوں میں — مگر نفرت کو اپنی حاصلِ ایماں سمجھ بیٹھے

کہاں جا کے مقدر آزمائیں — اٹھایا ہاتھ اس نے امتحاں سے

ہر اک گام پر فتنہ دیر و حرم کا — کہاں آ گئے اُس گلی سے نکل کر

کیفِ نگاہ، سحرِ بیاں، مستیِ خرام — ہم آئے اُن کی بزم سے کیا کیا لیے ہوئے

کس کو ہوش رہتا ہے میکدے میں مستی کے — اُس دم آنکھ کھلتی ہے، جب نشے اترتے ہیں
شیخ اور برہمن کے ہتھکنڈے، ارے توبہ! — آدمی کو بیگانہ آدمی سے کرتے ہیں

ارباب ہنر کی یہ قسمت ہے زمانے میں — ہے صبحِ بقا آخر، اور شامِ فنا پہلے
اب خار ہیں اور گل میں تمیز ہوئی مشکل — اتنی تو نہ بگڑی تھی گلشن کی ہوا پہلے

خوب کیا اور زشت کیا اے دوست! ہے فقط پرتوِ خیال اپنا
رفتہ رفتہ یقیں کی منزل پر پہنچا ہر ایک احتمال اپنا

ابھی تو فاصلہ ہے دامن و گریباں میں کسی کے سامنے کیا عاشقی کی بات کریں

کچھ بھی اس اندھیر نگری میں نہ آئیگا نظر کیا خبر تھی تیز اتنی روشنی ہو جائیگی
اور جو چاہے سمجھ، لیکن نہ خود کو کم سمجھ جنسِ ہستی ورنہ داغِ نیستی ہو جائیگی

میں بےخبر ہمیشہ رہا جس کی یاد سے وہ میرے حال سے کبھی غافل نہیں رہا

ہم نے سمجھا تھا نظر آئیگا رُوئے آفتاب شام اور اک ہو گئی حائل سحر کے نام سے

اُجالا خلوتِ دل میں اگر ہوتا ہے اے رہرو! اندھیری رہگزر بھی ضَو فشاں معلوم ہوتی ہے
جسے روزِ ازل سے لکھ رہا ہے خامۂ دوراں ابھی تک نامکمل داستاں معلوم ہوتی ہے

ایں قدر بر گنہ احساسِ گنہ افزودہ است کو نہ از بابِ کرم دستِ دعا می بینم
حیرتی نیست کہ از کفر نہ کردم توبہ ہر درِ بتکدہ را قبلہ نما می بینم
پا بہم از حلقۂ زنجیر ندارد باکی زانکہ بر دوشِ خود آں زلفِ رسا می بینم

عقلِ صد گونہ مرا کرد مقیّد، اما بایک انداز جنوں وا درِ زنداں کردم
خرمنِ بیم و امیدم زیکے شعلہ بسوخت تا بدل آتشِ عشقِ تو فروزاں کردم

نالِ رنگ و بو دیدم بہ گلشن تو چشمت، اے گلِ ناچیدہ، یکتا

جان نثار اختر، جان نثار حسین رضوی، سید

ضلع سیتاپور (یوپی) میں خیر آباد کا قصبہ منجملہ اور باتوں کے اپنی علمی روایت کے لیے بھی مشہور رہا ہے۔ یہاں کے مولانا فضل حق آخری دور کے امام معقولات مانے جاتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے شمس العلما مولانا عبدالحق (ف: مارچ ۱۸۹۹ء) اس پایے کے عالم تھے کہ انھوں نے اپنے خاندان کی شاندار روایات کو بھی چار چاند لگا دیے۔ مولانا فضل حق (ف: اگست ۱۸۶۱ء) کے ایک بیٹی تھی سعیدۃ النسا بیگم؛ ان کی تعلیم بھی اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر ہوئی۔ وہ شعر بھی کہتی تھیں، حرماں تخلص تھا۔ حرماں کے دو بیٹے ہوئے: بڑے محمد حسین، چھوٹے محمد افتخار حسین۔ دونوں شاعر تھے: بڑے کا تخلص بسمل تھا اور چھوٹے کا مضطر؛ اپنے وطن کی نسبت سے بسمل خیر آبادی اور مضطر خیر آبادی کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔

مضطر ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام (افتخار) تاریخی ہے، جس سے ہجری سنۂ ولادت برآمد ہوتا ہے۔ مدتوں ٹونک، گوالیار، بھوپال، اندور میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ وہ والیِ ریاست ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کے اُستاد تھے اور ریاست کی طرف سے انھیں افتخار الشعرا، اعتبار الملک، اقتدار جنگ، خان بہادر خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ فنِ شعر میں اولاً بڑے بھائی بسمل سے مشورہ رہا۔ اس کے بعد امیر مینائی (ف: اکتوبر ۱۹۰۰ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ کسی زمانے میں کچھ کلام حمد و ثنا میں "نذرِ خدا" کے نام سے اور نعتیہ کلام "نعتِ مضطر" کے عنوان سے چھپا تھا؛ دونوں اب نہیں ملتے۔ افسوس کہ ان کی غزلیات کا مجموعہ

ماخذ: تذکرۂ شعرائے جدید (عبدالواحد)؛ رسالہ فکر و فن بمبئی (جان نثار اختر نمبر)؛ پروفیسر عبدالقوی دسنوی بھوپال

آج تک شائع نہیں ہوا، اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، یہ اندیشہ قوی تر ہو رہا ہے کہ اب یہ شائع نہیں ہوگا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔
یہ مشہور شعر انھیں کا ہے:

اسیر پنجۂ عہد شباب کرکے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

ان کا انتقال ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء (۱۶ رمضان ۱۳۴۵ھ) کو گوالیار میں ہوا، اور وہیں مزار بابا بھینگا شاہ کے احاطے میں دفن ہوئے۔ جان نثار اختر انھیں مضطر کے اکلوتے فرزند تھے۔
جان نثار اختر ۸ فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی گوالیار کے وکٹوریہ کالجیٹ ہائی اسکول میں پائی۔ ۱۹۳۰ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے اور وہاں سے بی اے آنرز کی سند لی۔ اس کے بعد ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ تھا: "اردو میں ناول نویسی" پر کام بھی شروع کر چکے تھے کہ ۱۹۴۰ء میں خانگی حالات نے مجبور کیا اور وہ اسے درمیان میں چھوڑ کر گوالیار واپس چلے گئے؛ وہاں وکٹوریہ کالج میں اُردو کی مدرّسی مل گئی۔ اگلے سات برس کسی میدانی نرم رَو ندی کی طرح گزرے، بے ہیجان، بے خلش۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ان کی شادی صفیہ سراج سے ہو گئی، جو ہمارے مشہور شاعر اسرار الحق مجاز ردولوی (ف: دسمبر ۱۹۵۵ء) کی حقیقی بہن تھیں۔ لطف یہ کہ اس شادی کی تحریک خود صفیہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں صفیہ نے کس کس طرح اختر کی ناز برداری کی ہوگی۔ غرض ان کی زندگی کا یہ دَور ہر پہلو سے اطمینان بخش اور مسرت کا دَور تھا۔ گھریلو ماحول مثالی، دو بیٹے (جاوید عرف جادو اور سلمان) ہمیشہ اپنی پسند کا اور وہ بھی راحت بخش؛ غرض راوی ہر طرح چین ہی چین لکھتا ہے، کا سماں تھا۔
۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور اپنے ساتھ شہر شہر، قصبے قصبے فسادات کا فتنہ لایا۔ گوالیار بھی اس وبا سے نہ بچ سکا۔ جب حالات بہت مخدوش ہو گئے، اور بات

گھر بار سے گزر کر جان و ناموس تک پہنچنے لگی، تو اختر نے گوالیار کی سکونت ترک کر کے پڑوس کی ریاست بھوپال میں پناہ لی۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لیے گئے؛ حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اردو و فارسی کی جگہ مل گئی۔ اس وقت تک صفیہ علی گڑھ میں پڑھاتی تھیں۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ بھی اسی کالج میں مدرّس (لکچرر) ہو گئیں اور یوں دونوں کا بھوپال کا قیام طربناک ہو گیا۔

ان دنوں ترقی پسندی کی تحریک اپنے شباب پر تھی؛ بھوپال میں بھی اس کی بدولت بہت گہما گہمی تھی۔ اختر اور صفیہ نے بھی کھلے بندوں اپنی جانبداری کا اعلان کر دیا اور اس کے علمبردار بن گئے؛ اختر ہی مقامی مجلس کے صدر چنے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے ترقی پسندوں کی کل ہند کانفرنس بھوپال میں منعقد کی۔ ملک بھر کے مصنّف اس میں شامل ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) نے کیا۔ افتتاحی اجلاس کے صدر کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء) لسانی مسائل کی بحث کے صدر پنڈت سندر لال (ف: ۹ مئی ۱۹۸۱ء) اور مشاعرے کے جوش ملیح آبادی (ف: ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء) غرض یہ اجتماع ہر پہلو سے کامیاب رہا۔

جون ۱۹۴۹ء میں ریاست بھوپال انڈین یونین میں ضم ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی آزاد حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ چند ماہ بعد حکومت ہند نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندیاں عائد کر دیں، اور ہر جگہ اس کے سرکردہ کارکن گرفتار ہونے لگے۔ چونکہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک بھی اسی پارٹی کی سرگرمیوں کا ایک رُخ تھا، اس لیے یہ اصحاب بھی پکڑ دھکڑ کی زد میں آ گئے، الّا یہ کہ کسی نے تحریک سے اپنی برأت کا اظہار کر دیا ہو۔ اختر کے کردار کی مضبوطی کی داد دینا پڑتی ہے کہ جہاں ان کے کئی ساتھیوں نے اس اجازت میں پناہ لی تھی، انھوں نے عزیمت کا مظاہرہ کیا؛ کالج کی نوکری سے مستعفی ہونا منظور کر لیا، ترقی پسند تحریک سے دست بردار نہ ہوئے۔ چونکہ اس کے بعد بھوپال کا قیام خطرے سے خالی بھی نہیں رہا تھا، لہٰذا انھوں نے بمبئی کی راہ لی۔ یہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے اواخر کی بات ہے۔

اگلے تقریباً دس برس بڑے ابتلا اور امتحان کا دور تھا۔ روزگار کی طرف سے بے اطمینانی، بلکہ پریشانی ہی کیا کم تھی کہ ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو محبوبۂ دلنواز بیوی صفیہ نے جوان کے بمبئی چلے جانے کے بعد بھی حمیدیہ کالج (بھوپال) ہی میں ملازم رہیں، بلکہ ان کی جگہ صدرِ شعبہ بھی ہو گئی تھیں، اختر کی جدائی اور عسرت میں کُڑھ کُڑھ کر اور گھُٹ گھُٹ کر لکھنؤ میں تپِ دق کے موذی مرض کی بدولت دنیا سے منھ موڑ کر عدم کی راہ لی۔ سب سے بڑی حسرت یہ تھی کہ اختر اپنی عسیر الحالی کی وجہ سے ان کا خاطر خواہ علاج تک نہ کرا سکے، بلکہ ان کے آخری وقت میں ان کے پاس موجود بھی نہیں تھے۔ صفیہ کے خطوط کے دو مجموعے "حرفِ آشنا" اور "زیرِ لب" چھپ چکے ہیں۔ ان خطوط سے جہاں اُن کی اختر سے شیفتگی اور والہانہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح قدم قدم پر اختر کا ساتھ دیا، اُن کا حوصلہ بڑھایا، کٹھن سے کٹھن مرحلے پر ان کی ہمت بڑھائی۔ اور ان سب باتوں پر مستزاد ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ایک کامیاب ادیب بننے کی کتنی صلاحیتیں اور امکانات موجود تھے، جو افسوس ان کی ناوقت بلکہ قبل از وقت موت کے باعث بروئے کار نہ آ سکے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک کے تین برس اختر کی زندگی کٹی پتنگ کی شکل میں گزری۔ اپنا کوئی مرکز تو تھا نہیں، جہاں وہ رہتے۔ دونوں بچوں کو خالہ کے حوالے کیا اور پھر قسمت آزمانے کو بمبئی پہنچے۔ بارے، ۱۷ ستمبر ۱۹۵۶ء کو انھیں خدیجہ طلعت کی ذات میں صفیہ کا بدل مل گیا۔ خدیجہ بھوپال کے ایک معزز خاندان کی فرد ہیں۔ خدیجہ کا بھی یہ دوسرا نکاح تھا۔[۵]

۵ ان کا پہلا نکاح بھوپال کے مشہور ہاکی کے کھلاڑی شمس اللطیف سے ہوا تھا۔ شمس اللطیف تقسیمِ ملک کے بعد چُپ چاپ پاکستان چلے گئے۔ نہ جانے سے پہلے بیوی سے مشورہ کیا، نہ وہاں پہنچنے کے بعد اس کی خبر لی۔ چند سال بعد آئے اور چاہا کہ خدیجہ ان کے ساتھ پاکستان ہجرت کر جائیں۔ یہ انھیں منظور نہ ہوا اور طلاق ہو گئی۔

یمن کے ایک فاضل تھے، شیخ حسین بن حسن انصاری؛ وہ نواب سکندر بیگم (ف: اکتوبر ۱۸۶۸ء) کے عہد میں بھوپال آئے، اور یہاں دو سال قیام کرنے کے بعد واپس وطن چلے گئے۔ وہ دوبارہ ۱۹۲۹ء میں آئے جب یہاں نواب شاہجہان بیگم (ف: جون ۱۹۰۱ء) برسرِ اقتدار تھیں۔ لیکن اب کے بھی وہ زیادہ دن نہیں ٹھہرے، اور واپس یمن چلے گئے۔ جب نواب والاجاہ صدیق حسن خان (ف: فروری ۱۸۹۰ء) حجاز گئے، تو وہاں ان کی ملاقات شیخ حسین سے ہوئی۔ نواب صاحب ان کے علم و فضل، غیر معمولی حافظے، علمِ حدیث میں رسوخ اور تبحّر کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ نہ صرف خود ان سے حدیث کی سندلی، بلکہ انھیں بھوپال آنے اور یہاں توطن اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اس پر موصوف ۱۸۷۹ء میں مستقلاً یہاں آ گئے۔
شیخ حسین کے دو صاحبزادے تھے: شیخ محمد اور شیخ عبداللہ۔ یہ بھی اپنے والدِ ماجد کے ہمراہ بھوپال آئے تھے۔ شیخ عبداللہ بھی بلند پایہ عالم تھے۔ وہ مدّتوں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عربی شعبے سے منسلک رہے۔
بڑے بھائی شیخ محمد کا بھی عربی ادب و شعر میں بڑا بلند مقام تھا۔ وہ ایک زمانے تک دارالعلوم ندوۃ العلما میں عربی کے مدرّس رہے۔ شیخ محمد کے چار صاحبزادے تھے: خلیل الرّحمٰن، عبدالرحمٰن، حبیب الرّحمان، مجیب الرّحمان (سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، حمیدیہ کالج بھوپال)
شیخ عبداللہ کے دو بیٹے ہوئے: ہارون عرب اور مامون عرب۔ خدیجہ انھیں شیخ ہارون عرب کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں۔ خدیجہ کی ننھیال کے بارے میں اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ ان کی والدہ شمس العلما سیّد علی بلگرامی کی نواسی اور سیّد حامد حسین بلگرامی کی صاحبزادی ہیں۔
بعض ہستیاں خود خوش قسمت ہوتی ہیں، اور ان کی بدولت دوسروں کی حالت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ خدیجہ بھی ایسی ہی ہستی ثابت ہوئیں۔ ان سے شادی کے بعد اختر کی مالی پریشانیوں میں کمی ہونے لگی۔ اب انھیں فلموں میں گیت لکھنے کا کام زیادہ

باقاعدگی سے ملنے لگا؛ اور ان کا نام بھی اتنا اہم خیال کیا جانے لگا کہ فلمساز ان سے فرمایش کر کے گیت لکھوانے لگے۔ اس سے آمدنی میں بھی اضافہ ہوا اور شہرت میں بھی۔ غرض زندگی نسبتاً آرام و آسایش سے بسر ہونے لگی؛ محبت کرنے والی بیوی، دو پھول جیسی بچیاں (عنیزہ اور البینا)، شہرت اور سر دلعزیزی۔ لیکن ہے یہ کہ وہ اپنی فلمی زندگی سے خوش اور مطمئن نہیں تھے۔ وہ بنیادی طور پر علمی و ادبی آدمی تھے؛ خاندانی روایات اور تکمیلِ تعلیم کے بعد ان کے ابتدائی تدریسی مشاغل بھی اسی کے مقتضی تھے کہ وہ اپنے آپ کو علم و ادب کے لیے وقف کر دیتے۔ لیکن معاشی مجبوریوں نے انھیں فلمی دنیا میں پہنچا دیا، جس سے زیادہ ادب کُش شاید ہی کوئی اور ماحول ہو!

انھوں نے ایک اور دوست کے ساتھ مل کر اس گردوپیش سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تجویز یہ تھی کہ ایک فلم تیار کی جائے۔ روپیہ دوست لگائیں؛ کہانی مکالمے وغیرہ اختر لکھیں۔ اس فلم کا نام "بہو بیگم" تھا۔ اس کے گانے اختر نے اپنے دوست (عبدالحی) ساحر لدھیانوی سے لکھوائے تھے۔ اختر کو توقع تھی کہ اگر منافع میں سے انھیں دو لاکھ بھی مل گئے، تو وہ فلموں سے قطع تعلق کر لیں گے اور بیوی بچوں کو لے کر لکھنؤ یا بھوپال میں جا رہینگے، اور کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرینگے۔ لیکن یہ خواب پورا نہ ہوا۔ فلم ناکام رہی، اور اس میں نفع تو درکنار، ڈیڑھ لاکھ کا خسارہ رہا۔

آخر متواتر محنت اور مالی مشکلات اور زندگی کی بد اعتدالیاں اپنا رنگ لائیں، اور انھیں عارضۂ قلب لاحق ہو گیا۔ دو حملوں سے تو وہ بچ نکلے، لیکن تیسرا جان لیوا ثابت ہوا۔ اسی میں چہار شنبہ ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کی سہ پہر میں جسلوک اسپتال، بمبئی میں جاں بحق ہو گئے۔ اسی شب ساڑھے دس بجے انھیں سانتا کروز قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

اعجاز صدیقی نے یہ قطعۂ تاریخِ وفات کہا، جس سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے:

چل بسا آہ دارِ فانی سے   شاعرِ عصر، جاں نثار اختر

آخری نقشِ خاکِ خیر آباد — خلفِ صدقِ حضرتِ مضطر
بدھ، اٹھارہ اگست، شام کے وقت — باندھ کر آخرت کا رختِ سفر
جا ملا خود مجاز و صفیہ سے — ان کی یادیں تھیں روح کا محور
تھی تریسٹھ برس کی عمر فقط — کر لیا زندگی سے قطعِ سفر
دورۂ قلب اور فالج سے — فرصتِ یک نفس ملی نہ مگر
حاملِ خوش دلی و خوش طبعی — حلم و اخلاص و خلق کا پیکر
آستیں کا نہ ہوش دامن کا — حرف ہونٹوں پہ جامِ کیف آور
"خاکِ دل"، "پچھلے پہر"، "گھر آنگن" — حسیت کے تمام تر مظہر
نرم الفاظ اور ترکیبیں — پھول کی پتیوں سے نازک تر
انتہا قادر الکلامی کی — صاحبِ طرزِ خاص و فکر و نظر

لکھ دو اعجاز! مصرعِ تاریخ
"چاک دامان خاکِ دل اختر" (۱۹۷۶ء)

جاں نثار اختر کی نشو و نما اور تربیت کلاسیکی تغزل کی فضا میں ہوئی تھی جیسا کہ اوپر لکھا گیا، ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا، تو اپنے بیشتر ہمعصروں کی طرح وہ بھی اس کے علمبردار بن گئے اور کمیونزم کی طرف مائل ہو گئے۔ جب ریاست بھوپال میں ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کی دار و گیر شروع ہوئی، تو انھیں بمبئی جانا پڑا۔ اگلے دس برس بہت تنگی ترشی اور عسرت میں کٹے۔ ان تمام حالات کا ان کے کلام میں پرتو ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اکتسابی خصوصیات سے قطع نظر حسن پرستی ان کے خمیر میں تھی، اور "مزاج ان کا لڑکپن سے عاشقانہ" تھا۔ چنانچہ ان کے اشعار میں جسدی حسن اور مادی عشق و محبت کی جو تصاویر ملتی ہیں، یہ محض سخن گسترانہ باتیں نہیں، بلکہ آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ انھوں نے جرأت اور مومن کی روایت کو تازہ کر دیا، اور "گھر آنگن" کے قطعات اور رباعیوں کے دوسرے حصے میں ریختی کو زیادہ مہذب شکل دے دی۔ وہ خود ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہر لفظ ترے جسم کی خوشبو سے ڈھلا ہے
یہ طرز، یہ انداز سخن ہم سے چلا ہے

ان کے آخری زمانے کے کلام میں زیادہ گہرائی ہے۔ اب انھیں سب حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ نومبر ۱۹۷۴ء میں انھیں "خاک دل" پر نہرو اوارڈ (ٹی) کا تین ہزار کا انعام ملا، اور وہ مئی ۱۹۷۵ء میں روس کی سیر کو گئے۔ یوپی حکومت نے بھی ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ جو ان کی وفات کے دن ہی ان کے نمایندے نے لکھنؤ میں وصول کیا تھا کیونکہ وہ خود بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کی وفات کے بعد وزیر اعظم نے اپنے فنڈ سے دس ہزار کا عطیہ ان کے خاندان کی امداد کے طور پر دیا؛ اور اتنی ہی رقم حکومتِ مہاراشٹر نے دی۔

ان کے کلام کے سات مجموعے شائع ہوئے: سلاسل (دلّی، ۱۹۴۲ء)؛ "نالۂ گریباں؛ نذرِ بتاں؛ جاوداں (بمبئی)؛ گھر آنگن (دلّی، ۱۹۷۱ء)؛ خاکِ دل (امروہہ ۱۹۷۴ء)؛ پچھلے پہر (نئی دلّی، ۱۹۷۵ء)۔ فلموں کے سینکڑوں گیت ان کے علاوہ ہیں کئی مشہور اور کامیاب فلموں مثلاً پکار، چندرگپت اور چانکیہ، رضیہ سلطان، آئینہ، کلپنا، ہم ہیں راہی پیار کے، شعلہ و شبنم، سندھیا، مٹھی بھر چاول، پیاسے دل، مجنوں وغیرہ کے گانے اختر نے لکھے ہیں۔ ۱۹۷۶ء کا ساہتیہ اکاڈیمی انعام بھی ان کی کتاب "خاکِ دل" پر موت کے بعد دیا گیا۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ فرمایئے:

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو!
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو!
اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو!

دل کو چھو جاتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو برا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لیے ہیں

آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن
شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں

حال کہنا ہے کسی سے، تو مخاطب ہے کوئی
کتنی دلچسپ ہوا کرتی ہیں باتیں اکثر

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں
آج ذرا للچائی نظر سے اس کو بس کیا دیکھ لیا
پگ پگ اس کے دل کی دھڑکن اتری آئے پائل میں
پیاسے پیاسے نیناں اس کے، جانے، پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جاوے، سوچے ندیا بھر لوں چھاگل میں
صبح نہانے جوڑا کھولے، ناگ بدن سے آ لپٹیں
اس کی رنگت، اس کی خوشبو کتنی ملتی صندل میں
کھڑکی کی باریک جھری سے، کون یہ مجھ تک آ جائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں
ہم بھی کیا ہیں، کل تک ہم کو فکر سکوں کی رہتی تھی
آج سکوں سے گھبراتے ہیں، چین ملے ہے ہلچل میں

اور بھی زخم ہوئے جاتے ہیں گہرے دل کے
ہم تو سمجھے تھے، تمہیں چارہ گری آوے ہے

کچھ سمجھ کر ہی خدا تجھ کو کہا ہے، ورنہ
کونسی بات کہی اتنے یقیں سے ہم نے

چلو کہ اپنی محبت سبھی کو بانٹ آئیں
ہر ایک پیار کا بھوکا دکھائی پڑتا ہے
نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

سوائے گردِ ملامت، ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

جو ایک سمت گماں ہے، تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یونہی درمیاں چلے ہے میاں
بدلتے رہتے ہیں بس نام، اور تو کیا ہے!
ہزاروں سال سے اک داستاں چلے ہے میاں

اچھا ہے ان سے کوئی تقاضا کیا نہ جائے
اپنی نظر میں آپ کو رسوا کیا نہ جائے
اٹھنے کو اٹھ تو جائیں تری انجمن سے ہم
پر تیری انجمن کو بھی سونا کیا نہ جائے

مار ہی ڈالے جو بے موت، یہ دنیا وہ ہے
ہم جو زندہ ہیں تو جینے کا ہنر رکھتے ہیں
رات ہی رات ہے، باہر کوئی جھانکے تو سہی
یوں تو آنکھوں میں سبھی خوابِ سحر رکھتے ہیں

لہجے کا کرشمہ ہے کہ آواز کا جادو
وہ بات بھی کہہ جائے مرا دل بھی دکھے نا
غم ہجر کا ہم ہجر کے ماروں سے تو پوچھو
دن چاہے گزر جائے، مگر رات کٹے نا
تو ہی مری آنکھوں کے لیے حدِ نظر ہے
دیکھا مری آنکھوں نے کبھی تجھ سے پرے نا

میں تم سے دور رہتا ہوں تو میرے ساتھ رہتی ہے
تمہارے پاس آتا ہوں، تو تنہا سا ہو جاتا ہوں

غمِ بہار و غمِ یار ہی نہیں سب کچھ — غمِ جہاں سے بھی دل کو لگا کے دیکھ ذرا
ہر ایک سمت سے اک آفتاب ابھرے گا — چراغِ دیر و حرم تو بجھا کے دیکھ ذرا

جینے کی ہر طرح سے تمنّا حسین ہے — ہر شے کے باوجود یہ دنیا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر — طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے، تو کیا! — جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
دہشت دلا رہی ہیں چٹانیں، تو کیا ہوا! — پتھر میں جو صنم ہے، وہ کتنا حسین ہے
ہوں لاکھ کوہسار بھی حائل، تو کیا ہوا! — پل پل چمک رہا ہے جو تیشا حسین ہے
در بند ہے جو صحنِ گلستاں کا، غم نہیں — خوشبو جو لے اڑا ہے، وہ جھونکا حسین ہے
لاکھوں صعوبتوں کا اگر سامنا بھی ہو — ہر عہد، ہر عمل کا تقاضا حسین ہے

ملاّ واحدی، سیّد محمد ارتضیٰ

ان کا خاندان "فوجدار خان والا" کہلاتا تھا۔ پہلے اس کی وجہ تسمیہ سن لیجیے:
جب شاہجہان نے آگرے سے دارالخلافہ تبدیل کر کے دلّی آنے کا فیصلہ کیا، تو سب
سے پہلے لال قلعہ اور جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ شہر تو پہلے ہی سے موجود تھا؛ شاہی
کے یہی دو نشان تھے، جو کسی دیندار بادشاہ کی نظر میں دارالخلافے کی نمایاں خصوصیات
ہو سکتے تھے۔ لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا، اور جامع مسجد ۱۶۵۶ء میں۔ اب سوال
پیدا ہوا کہ جامع مسجد اور عیدگاہ میں امامت کس کے سپرد کی جائے؛ اور جب حضرت
بادشاہ سلامت ہاتھی پر سوار ہوں، تو ان کے اور مہابت کے درمیان کون بیٹھے کیونکہ
کسی شخص کا حضرت ظلِ سبحانی کی طرف پشت کر کے کھڑے ہونا، یا بیٹھنا عظمت شاہی
اور آدابِ سلطنت کی رُو سے سخت ناروا اور احترام سلطانی کے منافی تھا۔ بہت
سوچ بچار کے بعد اس کا یہ حل نکالا گیا کہ بخارا سے تین مستند عالم اور کھرے سیّد بلائے
جائیں، جو یہ فرائض انجام دے سکیں۔ سادات آلِ رسول ہونے کے باعث سب
کے لیے قابل احترام اور پورے عالم اسلام کے مطاع ہیں؛ ان کے پیچھے بیٹھنے، یا
چلنے کو کوئی مسلمان کیوں باعثِ عار سمجھے گا! چنانچہ تین سیّد بلائے گئے؛ ایک جامع
مسجد میں امامت کے لیے، (سیّد عبداللہ بخاری۔۔ موجودہ امام جامع مسجد، دلّی، انھیں
بزرگوار (سید عبدالغفور شاہ بخاری) کی گیارھویں پشت میں ہیں)؛ دوسرے عیدگاہ
میں امامتِ نماز کرنے کے لیے؛ اور تیسرے ہاتھی پر مہاوت اور بادشاہِ وقت کے درمیان

ماخذ: میرا افسانہ (ملاّ واحدی)؛ سوانح عمری حضرت خواجہ سیّد حسن نظامی دہلوی (ملاّ واحدی)؛ میرے زمانے کی دلّی (ملاّ واحدی)؛ مشفق خواجہ، کراچی

جہاوت کی طرف پشت اور بادشاہ کی طرف مُنھ کرکے بیٹھنے کے لیے، یہ گویا جہاوت کی پیٹھ اور رُوئے مُبارک کے درمیان حجاب کا کام دیتے تھے۔ اس عہدے کو پیش نشینی کہتے تھے اور اس عہدے دار کا خطاب فوجدار خان تھا۔ تو یہ ہے وجہِ تسمیہ اس خاندان کی۔

ملّا واحدی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدارِ خاندانِ مغلیہ کے فوجدار خان میر نجف علی خان تھے۔ ان کی بیٹی ملّا واحدی صاحب کی پردادی تھیں، جو میر پناہ علی کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ میر پناہ علی، میر محمد اکبر معروف بہ حکیم سید شاہ ارزانی سے چوتھی پشت میں تھے، جن کا ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ (۲۴ جنوری ۱۷۲۲ء) کو عہدِ شاہ عالم ثانی میں وصال ہوا۔ میر محمد اکبر طبیب بھی تھے اور درویش بھی۔ انھوں نے طبِ یونانی کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور یوں طب کا علم عوام میں ارزاں کر دیا؛ اسی سے ان کا عرف ارزانی مشہور ہوگیا۔ ان کے والد میر محمد قاسم (ف: ۱۱ جمادی الاوّل ۱۰۹۷ھ/ ۲۶ مارچ ۱۶۸۶ء) حضرت مجدّد الف ثانی کے خلفِ رشید اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی نقشبندی (ف: ۱۷ اگست ۱۶۶۸ء) کے خلیفہ تھے۔

ملّا واحدی کا اصلی نام محمد ارتضیٰ تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ جب میں اینگلو عربک ہائی اسکول میں طالب علم تھا، تو میرے ایک ہم سبق ظہیر احمد زاہدی تھے۔ ایک دن ہنسی ہنسی میں محمد ارتضیٰ صاحب نے ان سے کہا: تم زاہدی، ہم واحدی۔ بس اسی دن سے یہ واحدی بن گئے۔ بعد کو خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کے مرید ہوئے، تو انھوں نے واحدی نام اپنا چمکایا اور اسے اپنی تحریروں میں اس تواتر سے استعمال کیا کہ لوگ ان کا اصلی نام محمد ارتضیٰ گویا بھول ہی گئے، اور ملّا واحدی ہی ان کا عَلَم ہوگیا۔ خواجہ صاحب موصوف ہی نے "واحدی" کے ساتھ لفظ "ملّا" کا سابقہ بھی جوڑا تھا۔

ملّا واحدی کے والدِ بزرگوار سید محمد مصطفےٰ محکمۂ انہار میں سب ڈویژنل افسر تھے۔ روڑا (ضلع کانپور) میں تعینات تھے، جب ان کا انتقال ہوا؛ وہیں دفن ہوئے۔

مُلّا واحدی ۱۷ مئی ۱۸۸۸ء (۶ رمضان ۱۳۰۵ھ[۵]) جمعرات کے دن اپنے آبائی مکان واقعہ کوچۂ چیلان، دلّی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سراسر نجی طور پر گھر پر ہوئی۔ قرآن ناظرہ ختم کیا اور اردو فارسی میں بھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ اب مرحلہ اسکول میں داخلے کا آیا۔ اس زمانے میں پرائمری درجوں کے بعد پانچویں کی بھی سند ملتی تھی، انسپکٹر مدارس کے دستخطوں سے اس لیے ضروری تھا کہ کسی اسکول سے باقاعدہ امتحان دیا جائے۔ یہ مہم یوں سر ہوئی کہ ضروری امتحان دینے کے بعد سان اسٹیفنز مشن ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخلہ مل گیا، جو اس زمانے میں یہاں کے انگریزی اسکولوں میں چوٹی کا اور بہترین اسکول شمار کیا جاتا تھا۔ اس وقت اس کی عمارت چاندنی چوک میں اس جگہ تھی، جہاں اب ٹاؤن ہال کے سامنے کپڑے کی منڈی ہے۔ بعد کو یہ عمارت مطبع مجتبائی کے مالک خان بہادر مولوی عبد الاحد نے خرید لی، تو اسکول یہاں سے اٹھ کر موری دروازے چلا گیا۔ خیر، آٹھویں درجے تک انھوں نے اسی مشن اسکول میں تعلیم پائی، اس کے بعد اینگلو عربک ہائی اسکول میں چلے گئے۔

لیکن پڑھنے لکھنے میں وہ بہت پھسڈی ثابت ہوئے۔ انٹرنس (دسویں درجے) کے امتحان میں تین بار بیٹھے اور ہر مرتبہ ناکام رہے۔ یہ تیسری مرتبہ کی ناکامی ہی تھی، جس نے انھیں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے اتنا قریب کر دیا کہ جب تک خواجہ صاحب مرحوم کا ذکر نہ آئے، مُلّا واحدی کی سوانح عمری مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

مُلّا واحدی خود لکھتے ہیں کہ میرے دل میں خواجہ صاحب سے ملنے کا خیال ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس سال امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان و النسراے کی دعوت پر ہندستان آئے۔ مخالفانہ پروپگنڈے کے باعث وہ علی گڑھ کالج کے اگر مخالف نہیں تو اس سے بدظن ضرور تھے۔ اس زمانے میں نواب محسن الملک مہدی علی خان (ف:

---

[۵] مُلّا واحدی نے ایک جگہ اپنی پیدائش ۱۳۰۴ھ کی لکھی ہے (سوانح عمری خواجہ سید حسن نظامی: ۵۰) یہ لغزش قلم ہے؛ صحیح سال ۱۳۰۵ھ ہی ہے۔

اکتوبر ۱۹۰۷ء) کالج کے سکریٹری تھے ۔ نواب صاحب موصوف نے شاہ افغانستان کو کالج آنے، اور وہاں کے حالات دیکھنے، اور اس سے متعلق اصحاب کو شرفِ ملاقات عطا فرمانے کی دعوت دی۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ علی گڑھ آ کر وہاں کے حالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، تو ان کی بدگمانی دور ہو جائیگی۔ نواب محسن الملک مرحوم بڑی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ انھوں نے خیال کیا، کہ امیر صاحب کی ساری مخالفت ہندستان کے طبقۂ علما کے غلط پراپگنڈے کی بنا پر ہے۔ اس کا توڑ انھوں نے یوں کیا کہ امیر موصوف کے وہاں پہنچنے پر جو لوگ ان کا استقبال کریں، ان میں ایک بڑی تعداد ملک کے بڑے بڑے علماء اور اصحابِ دین کی بھی ہونا چاہیے، تاکہ امیر موصوف کو معلوم ہو کہ جب ایسے ایسے جید علماء کا اتنا بڑا طبقہ کالج کا مؤید اور معاون ہے۔ تو پھر بھی مخالف لوگوں کا کالج کے خلاف باتیں کرنا معاندانہ پراپگنڈے، یا کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ان علماء نے امیر موصوف کو ایک ایڈریس بھی پیش کیا تھا، اور اس کے آخر میں ان سب کے نام مع القاب وغیرہ کے درج تھے۔ انھیں میں خواجہ حسن نظامی بھی تھے اور ان کا نام مع القاب اس طرح لکھا تھا: "مولانا سید حسن نظامی، خواجہ زادۂ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی"۔ واحدی دلّی والے تھے، بھلا کیسے ممکن تھا کہ ان کے نام سے واقف نہ ہوتے، لیکن اس خبر نے ان کے دل میں خواجہ صاحب سے ملاقات کا شوق پیدا کر دیا۔

اب سنیے ملاقات کی، جو کسی عجوبۂ روزگار سے کم نہیں ہے۔

لکھتے ہیں کہ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ اپنے مکان کے صحن میں لیٹا ہوں۔ رات کا وقت ہے اور چاند کا نظارہ کر رہا ہوں۔ یکایک چاند میں ایک سمندر نمودار ہوا۔ تھوڑی دیر میں سمندر میں سے ایک غوطہ خور کچھ چیزیں لے کر برآمد ہوا اور یہ سب فتوحات لے کر میرے گھر میں اتر آیا۔ اس کے چند دن بعد چاندنی چوک جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں ملّا واحدی شعر بھی کہتے اور ایک صاحب محمد مرزا مشتاق تخلص سے مشورہ کرتے تھے۔ مشتاق صاحب کی چاندنی چوک میں دکان تھی۔

ملا صاحب ان کی دکان پر ذرا ٹھیکی لینے کو رک گئے۔ برابر کی دکان غلام نظام الدین
عرف خاکسار کی تھی، جو خواجہ حسن نظامی کے مربی اور محسن اور ایک طرح سے استاد
بھی تھے۔ خواجہ صاحب اس وقت ان کی دکان پر موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد
خواجہ صاحب، خاکسار کے وہاں سے اٹھ کر کسی کام سے مشتاق صاحب کی دکان پر
آئے، جہاں ملا صاحب بیٹھے تھے۔ جونہی وہ دکان میں داخل ہوئے اور ملا صاحب
کی نظر ان پر پڑی، تو یہ چونکے۔ وہی قد و قامت، شکل و صورت، جسم کی ساخت جو اس
چاند کے سمندر میں غوطہ خور کی تھی، اور جو وہاں کا سامان لے کر ان کے مکان میں اترا
تھا۔ مشتاق صاحب نے تعارف کرایا کہ آپ خواجہ حسن نظامی ہیں۔ تو یہ تھی ابتدا اُس
مثالی تعلق اور قرب کی جو اس دن ان دونوں میں مدۃ العمر کے قائم ہو گیا۔
لیکن یہ صرف تعارف کا قصہ ہے، قرب کا واقعہ مئی ۱۹۰۸ء میں پیش آیا۔

ملا صاحب دسویں کے امتحان میں تیسری مرتبہ فیل ہو گئے۔ ملال ہونا ہی چاہیے تھا۔
اسی پریشانی کے عالم میں چاندنی چوک میں مرحوم گھنٹہ گھر کے نیچے کھڑے تھے کہ خواجہ
صاحب آنکلے۔ انھیں غمگین دیکھ کر رک گئے اور پوچھا: کچھ پریشان ہیں آپ، خیر
باشد؟ انھوں نے اپنے فیل ہو جانے کا قصہ بیان کیا، تو خواجہ صاحب نے تسلی کے
لہجے میں فرمایا: پھر کیا ہوا! گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ اگلے سال پھر امتحان
میں بیٹھ جانا۔ پاس ہو جاؤ گے۔ انھوں نے کہا: یہ تیسری مرتبہ بیٹھا تھا اور اب کی
بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ خواجہ صاحب نے پوچھا: اور اگر پاس ہو جاتے، تو
کیا کرتے؟ اس پر انھوں نے کہا: ولایت جاتا۔ انھوں نے پھر دریافت کیا: ولایت
جا کر کیا کرتے؟ بیرسٹر بنتا۔ اس پر خواجہ صاحب نے حضرت شیخ نجیب الدین متوکل
کے تتبع میں فرمایا: بیرسٹر مشو، چیزے دیگر شو۔ آؤ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں
بیرسٹری سے بہتر کام بتاتا ہوں۔ اور انھیں اپنے گھر لے گئے۔ راستے بھر اور پھر
مسکن پر پہنچنے کے بعد ان سے ایسی باتیں کیں کہ نہ صرف ان کا ملال دور ہو گیا، بلکہ یہ
ایسے مطمئن ہو گئے، جیسے انھیں دین و دنیا کی تمام نعمتیں مل گئی ہوں۔

۱۹۰۸ء میں خواجہ حسن نظامی مرحوم نے حلقۂ نظام المشائخ قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف خانقاہوں اور درگاہوں اور مذہبی اوقاف میں جو بدعنوانیاں ہوتی ہیں، اور ان کے منتظمین جس طرح ان مقامات کی آمدنی خود برد کرتے ہیں، اور خود ان مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کرتے ہیں، ان کی اصلاح کی جائے۔ خواجہ صاحب گوناگوں منصوبے بناتے اور انھیں چلانے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جتنی ان کی مخالفت ہوتی اتنی ہی ان کی سرگرمیاں تیز تر ہوجاتیں، اور وہ غیر متوقع اور نئے نئے وسائل اپنا مقصود حاصل کرنے کے لیے سوچتے۔ حلقۂ نظام المشائخ کی مخالفت ہونا ہی تھی۔ جن لوگوں نے ان اداروں پر قبضہ جما رکھا تھا اور ان کی آمدنی کو آج تک شیر مادر کی طرح بے غل وغش ہضم کر رہے تھے، وہ بھلا کسی شخص یا انجمن کی مداخلت کیونکر برداشت کر سکتے تھے! انھوں نے حلقۂ نظام المشائخ کے قیام کو دخل در معقولات قرار دیا اور کہنے لگے کہ خواجہ حسن نظامی اپنے بزرگوں کے مسلک سے رُوگرداں ہوگیا ہے اور وہابیت کی تقلید میں درگاہوں کی مخالفت کرنے لگا ہے۔ اس پر خواجہ صاحب نے اپنا نقطۂ نظر لوگوں تک پہنچانے کے لیے جولائی ۱۹۰۹ء میں ماہنامۂ نظام المشائخ جاری کر دیا تاکہ اس سے حلقے کے مقاصد کی تبلیغ و سیعتر ہو سکے۔ خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور مُلّا واحدی نائب ایڈیٹر۔ کم و بیش چھ مہینے تک اس کا دفتر خواجہ صاحب کے کمرے پر رہا۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء کے آخر یا ۱۹۱۰ء کے آغاز میں یہ مُلّا صاحب کے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ پرچہ دونوں کے سرمایے سے جاری ہوا تھا اور آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ صرف ڈیڑھ سو روپے سے، دونو نے پچھتر پچھتر روپے لگائے تھے۔ لیکن پہلے شمارے ہی سے پرچہ خود کفیل ہوگیا اور کسی کو نقصان نہیں رہا۔ ۱۹۱۲ء تک دونوں اس میں شریک رہے، یوں بھی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے پانچ برس خواجہ صاحب بیوی بچوں سمیت مُلّا صاحب ہی کے یہاں مقیم رہے تھے۔ کیونکہ حلقۂ نظام المشائخ کی سرگرمیوں کے باعث درگاہ حضرت سلطان اولیا میں ان کی بہت مخالفت تھی اور وہاں کا قیام خطرے سے خالی نہیں تھا۔

جب مخالفت فرو ہوگئی اور خواجہ صاحب نے درگاہ میں اپنے مکان پر واپس جانے کا فیصلہ کرلیا، تو وہ رسالہ نظام المشائخ کی ملکیت سے بھی دستبردار ہو گئے، اور اسے کاملاً ملا صاحب کے ہاتھ میں دے دیا کہ اب سے اس کے نفع نقصان کے آپ واحد ذمے دار ہیں۔

مئی ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب مصر و شام و حجاز کے سفر پر روانہ ہو گئے (ان کا سفرنامہ شائع ہو چکا ہے) خواجہ صاحب مختلف منازل سے سفر کے حالات و تاثرات باقاعدہ بھیجتے رہے، اور یہ نظام المشائخ میں شائع ہوتے رہے۔ اس سے پرچے کی سرکولیشن میں بہت اضافہ ہوا۔ خواجہ صاحب اس سفر سے چھ سات مہینے میں وطن واپس آئے۔

اب ملا صاحب نے نشر و اشاعت کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا۔ یوں بھی خدا کے فضل سے انھیں اپنے بزرگوں کے ترکے سے اتنا کچھ ملا تھا کہ نہ ملازمت کی ضرورت تھی، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حاجت۔ ادھر خواجہ صاحب کے منصوبہ خیز دماغ اور آئے دن کی اسکیموں نے ان کے کام کو خوب چمکایا۔ انھوں نے اپنا ذاتی مطبع قائم کرلیا جس میں وہ خواجہ صاحب کی کتابوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور دلّی کے دوسرے ادیبوں سے بھی کتابیں لکھوائیں۔ خدا نے بھی ان کی مساعی میں برکت دی، اور انھیں اس سے بہت منافع ہوا۔ کئی ماہنامے اور روزنامے جاری کیے، لیکن ایک نظام المشائخ کے سوائے باقی سب تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد بند ہو گئے۔

اب ان کا شہر کے معززین میں شمار تھا۔ وہ دلّی میونسپل کمیٹی کے رکن منتخب ہو گئے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس حیثیت میں دوسرے احباب کے ساتھ مل کر اہلِ شہر کی اور خاص کر اپنے علاقے کی بہت خدمت کی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور اس کے ساتھ ہی بد امنی بھی آئی۔ جب دلّی میں حالات بہت مخدوش ہو گئے، تو بادلِ ناخواستہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شب میں ہوائی جہاز سے بیوی بچوں سمیت ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ یہاں سے راول پنڈی پہنچے۔ وہاں سے ریل کے ذریعے لاہور ہوتے ہوئے کراچی گئے اور وہاں سے رختِ سفر کھول دیا۔

ہجرت کرنا آسان تھا، لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد روزگار کا مسئلہ بہت مشکل ثابت ہوا۔ خیال فرمایئے کہ جس شخص کے دلّی کے مکان میں ماشاء اللہ نو نو کمرے تھے اور ہر کمرہ کسی ایک کام کے لیے مخصوص تھا، اُسے مہینوں دو کمرے (کمرے بھی کیا۔ دو کوٹھریوں) کی ایک جھونپڑی میں گزارا کرنا پڑے، تو اس پر کیا گزر رہی! اور اس پر مستزاد یہ کہ آمدنی کے سب ذرائع مفقود۔ اتنا بڑا کنبہ اور کمانے والا ایک لڑکا، مجتبیٰ موسیٰ رضا واحدی۔ پوری پڑے تو کیونکر! خدا رازق ہے، اور ہر ایک کو اپنا لکھے کا بل کے رہتا ہے! کراچی میں روزنامہ "انجام" کے مالک عثمان آزاد صاحب نے ان کا پرانا زمانا دیکھا تھا، وہ آڑے آئے۔ انھوں نے مہربانی کی اور اپنے اخبار کی مینیجری ان کے سپرد کر دی۔ زیرِ تعلیم منجھلے بیٹے (علی مقتدی واحدی) نے ایم اے کے بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور کلرکی کر لی۔ کسی نہ کسی طرح دال روٹی کا انتظام ہو گیا۔ تھوڑے دن بعد مجتبیٰ واحدی کو بھی ان کی ملازمت کے استحقاق کے مطابق مکان تفویض ہو گیا اور خاندان وہاں منتقل ہو گیا۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ملّا واحدی نے خواجہ حسن نظامی کے اشتراک سے ماہنامہ نظام المشائخ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں جاری کیا تھا۔ جب تک وہ ہندستان میں رہے (یعنی اکتوبر ۱۹۴۷ء تک) یہ بلا ناغہ شائع ہوتا رہا۔ کراچی کے ابتدائی زمانے میں جب جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لالے پڑے ہوئے تھے، اُسے دوبارہ جاری کرنے کا تصوّر بھی کیسے کیا جا سکتا تھا! لیکن مُلّا واحدی صاحب بھی دُھن کے پکے تھے۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۴۷ء کے دو پرچے تو نہ نکل سکے، لیکن ذرا سانس لینے کے قابل ہوئے، تو انھوں نے جنوری ۱۹۴۸ء میں اسے پھر دوبارہ جاری کر دیا کہ "بیکار مباش کچھ کیا کر" کے مطابق مصروفیت میں کچھ دل بھی لگا رہیگا اور شاید چار پیسے کی یافت کا وسیلہ بھی ثابت ہو۔ بحمدہٖ تعالیٰ دونوں مقصد پورے ہو گئے۔

ان کی صحت بالعموم اچھی رہی۔ آسودہ حالی اور بے کھٹکے زندگی بسر کی۔ مذہبی رجحان کے باعث کسی طرح کی بداعتدالی تک کے نزدیک نہیں گئے۔ کراچی کی افتاد نے البتہ

برا اثر ڈالا۔ سب سے پہلے آنکھوں نے جواب دیا، پانی اتر آیا۔ لیکن انھوں نے آخر تک پڑھنے کا شغل نہیں چھوڑا۔ یوں بھی یہی ان کی زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ تھا۔

بہت دن ہوئے ایک کتاب "میرے زمانے کی دلی" شائع کی تھی (کراچی: ۱۹۵۶ء) اگرچہ اس پر لکھا ہے: "حصہ اول" لیکن دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا۔ انھوں نے خواجہ حسن نظامی کی وفات کے بعد ماہنامہ منادی' دلی میں خواجہ صاحب مرحوم کے کچھ حالات اور تاثرات پر مشتمل ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا، یہ بعد کو "سوانح عمری حضرت خواجہ سید حسن نظامی دہلوی" کے عنوان سے شائع ہوئی (دلی: ۱۹۵۷ء) ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں:

(۱) حیاتِ سرورِ کائنات (تین حصے)؛ (۲) جاماسپ نامہ (فارسی سے ترجمہ) (۳) بزمِ فرید (حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے ملفوظات: راحت القلوب مرتبہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کا ترجمہ)؛ (۴) مجالس حسنہ (خواجہ حسن نظامی کے کچھ ملفوظات)؛ (۵) "تاثرات۔"

نظام المشائخ میں تو وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے، لیکن کراچی کے دوران قیام میں، خاص کر ۱۹۵۰ء کے بعد انھوں نے قرآن اور اسلام کے بارے میں کثرت سے لکھا ہے۔ ان کے یہ مضامین "ملا واحدی کے مقالات" اور "انشائیے اور شخصیتیں" کے عنوان سے ان کے منجھلے صاحبزادے سید علی مقتدی واحدی نے جمع کیے ہیں اور غالباً شائع ہو گئے ہیں؛ لیکن یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔

ملا واحدی نے ایک اور کتاب اپنی یادداشتوں اور احباب کے احوال میں "ناقابلِ فراموش لوگ اور ناقابلِ فراموش باتیں" کے عنوان سے بھی مکمل کر لی تھی، یہ بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

۱۹۶۶ء میں انھوں نے اپنی سوانح عمری "میرا افسانہ" کے عنوان سے لکھی اور اسے سائیکلو اسٹائل کروا کے اعزہ احباب میں تقسیم کر دیا۔ یہ الگ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی۔ ہاں میں نے

اسے اپنے تماہی رسالے "تحریر" کے ایک خاص شمارے میں چھاپ دیا تھا۔
صحت کبر سنی کے ساتھ خراب رہنے لگی تھی۔ اس پر فالج نے آدبوچا۔ اسی میں بدھ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے خالق کے سامنے حاضر ہو گئے۔ یرحمہ اللہ تعالی۔ ان کے ساتھ دلی کی تہذیب کا ایک بڑا عاشق اور نمایندہ ہم سے جدا ہو گیا۔
انھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ چار بیٹے اور چار بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔

سیّد محمّد، پروفیسر

بڑے عالی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ مشہور صوفی، شاعر اور ادیب حضرت امین الدّین اعلیٰ (ف: اگست ۱۶۷۴ء) خلف رشید حضرت برہان الدّین جانم (ف: ۱۰۰۷ھ) تھے۔ ان دونوں کا دکنی ادب کی تاریخ میں بہت بلند مقام ہے۔ سب سے پہلے اس خاندان کے سید حسین نامی ایک صاحب حیدرآباد آئے اور سالار جنگ اول نواب مختار الملک میر تراب علی خان (ف: فروری ۱۸۸۲ء) کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے۔ یہ سیّد محمد کے دادا تھے۔ ان کے ایک بیٹی (مالن بیگم) اور دو بیٹے سیّد حیات اور سیّد عبدالرحمٰن ہوئے۔ سیّد محمد انھیں سیّد عبدالرحمٰن کے منجھلے بیٹے تھے؛ ایک بیٹے سیّد احمد اور سیّد محمد پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور سیّد محمود دوسری بیوی کے۔

سیّد عبدالرحمٰن ریاستِ نظام حیدرآباد کے منصبدار بھی تھے۔ منصبداری یا تو خود حضورِ نظام سے، یا ریاست کی تین پایگاہوں (بشیر الدولہ، لطف الدولہ، ولی الدّولہ) میں سے کسی ایک کی طرف سے دعاگوئی یا کسی نمایاں خدمت کے عوض میں عطا ہوتی تھی، اور یہ منصب نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتا تھا۔

سیّد محمد ۲۸ مارچ ۱۹۰۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ نظامیہ اور مدرسۂ بازار گھانسی میں ہوئی۔ مڈل کا امتحان مدرسۂ مفید الانام سے درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ اس کے بعد دسویں کی سند سٹی اسکول سے لی؛ اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا؛ وہاں سے جون ۱۹۲۸ء میں ایم اے (اُردو) کی سند حاصل کی۔ اور اس کے تھوڑا بعد (جولائی ۱۹۲۸ء) میں سٹی ہائی اسکول میں اُردو کے مدرّس مقرر ہو گئے۔ یہاں وہ

مآخذ: حیدرآباد کے ادیب (زینت ساجدہ)؛ روزنامہ سیاست، حیدرآباد؛ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، (حیدرآباد)

نو برس رہے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، جہاں انھیں شعبۂ اردو میں لیکچرر (مدرس) کی جگہ مل گئی۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے علاوہ سماجی کاموں میں بھی خاصی دلچسپی لیتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں بلدیہ (میونسپل کارپوریشن) کے رکن بھی منتخب ہو گئے تھے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں ترقی ملی اور وہ ریڈر ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیم کے نجی معاون (پرسنل اسسٹنٹ) کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن جب ۱۹۴۸ء میں ریاست کا ہندستان کے ساتھ ادغام ہو گیا تو واپس یونیورسٹی میں اپنے ریڈری کے عہدے پر آ گئے۔ ۱۹۷۱ء میں اسی عہدے سے یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

یونیورسٹی سے پنشن ملنے کے بعد وہ اردو اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے اور پھر نمایش کے کالج و نیتا مہا ودیالیہ میں اردو پڑھاتے رہے۔ جب سب طرف سے فارغ ہو گئے، تو نشر و اشاعت کا شغل اختیار کیا۔ اپنے دوسرے بیٹے کے نام پر ذاتی مطبع (اعجاز مشین پریس) قائم کر لیا تھا، جہاں سے متعدد کتابیں شائع کیں۔

انھیں علمی، ادبی اور تعلیمی کاموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ شروع میں چند روزنامہ "رہبر دکن" حیدرآباد میں ترجمے کا کام بھی کیا۔ ۱۹۳۷ء میں سالار جنگ ثالث نواب یوسف علی خان مرحوم (ف: ۱۹۴۶ء) نے مجلس اشاعتِ دکھنی مخطوطات قائم کی، تو سید محمد اس کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ اس مجلس کی طرف سے ان کی مرتبہ گلشنِ عشق (نصرتی)، قصۂ رضواں شاہ و روح افزا (فائز)، کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ، پنچھی باچھا (وجدی) شائع ہوئی تھیں۔ ان کی دو اور کتابیں بھی ہیں: پہلی "ایمانِ سخن"، یہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے شائع ہوئی (حیدرآباد، ۱۹۳۷ء)؛ دوسری مثنویاتِ میر ۱۹۴۵ء میں چھپی۔ — انھوں نے ہائی اسکول کے لیے چند نصابی کتابیں بھی مرتب کی تھیں؛ ان میں سے قواعدِ فارسی اور انتخابِ اردو مدتوں داخلِ نصاب رہیں۔

ان کی دو کتابوں نے وسیع تر حلقوں میں شہرت حاصل کی۔ اربابِ نثرِ اردو (حیدرآباد، ۱۹۲۷ء) فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کا پہلا تذکرہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس پر

کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوسکا۔ ان کی دوسری کتاب حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ گلشن گفتار (حیدرآباد ۱۹۲۹ء) ہے، جو ان کی مساعی سے پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی تاسیس و تنظیم میں وہ بھی ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۶۲ء) کے ساتھ تھے۔ اس ادارے کی گوناگون سرگرمیوں میں وہ آخر دم تک شریک رہے کسی زمانے میں ادارے نے ایک شعبۂ شعرا و مصنفین دکن قائم کیا تھا۔ سید محمد اس کے سکتر تھے۔ اس شعبے کے فرائض میں شامل تھا کہ یہ مختلف ادبا کے مدافن کا کھوج لگائے اور ان کی قبروں کے تحفظ کا انتظام کرے۔ سید محمد نے اس سلسلے میں اورنگ آباد میں سراج اورنگ آبادی اور حیدرآباد میں شاہ نصیر دہلوی، شاہ تجلّی علی تجلی، میر شمس الدین فیض، عبدالجبار خان آصفی، میر احمد علی عصر وغیرہ کئی ادیبوں کی قبروں پر کتبے لگوائے تھے۔ وہ ادارہ کے شعبۂ امتحانات کے بھی اولاً سکتر اور پھر یوم وفات تک نائب صدر رہے۔

وہ بہت زمانے سے حضرت عبدالقدیر صدیقی حسرت (ف: ۱۹۶۲ء) پروفیسر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ سے قادری سلسلے میں بیعت تھے۔ اسی باعث آخری ایام میں تصوف سے لگاؤ المضاعف ہوگیا تھا۔ عرس کی کوئی تقریب اور قوالی کی کوئی محفل مشکل سے چھوٹتی تھی؛ ادبی مجالس کا مشغلہ اس کے علاوہ۔ عمر کے ساتھ جسمانی ضعف محسوس کرنے لگے تھے، لیکن مروّت اور وضعداری کا یہ عالم تھا کہ انھیں کوئی دعوت یا فرمائش رد کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ معلومات بحر وسیع تھیں، اور حافظ غیر معمولی طور پر مضبوط پایا تھا، اس لیے بہت مقبول مقرر تھے۔ مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ فی البدیہہ تقریر کرنے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔

۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کی شام ایک تعزیتی جلسے کی صدارت کی؛ یکان سے چُور، دیر سے مکان پر آئے۔ کھانا تناول کیا اور سو رہے۔ آدھی رات کے بعد ڈیڑھ دو بجے کھانسی کا دَورہ پڑا جس سے آنکھ کھل گئی۔ پوری کوشش کے باوجود جب اختلاج میں کمی نہ ہوئی، تو

انھیں عثمانیہ اسپتال لے گئے - وہیں پیر ۳۰ اگست ۱۹۷۶ء (۳ رمضان ۱۳۹۶ھ) صبح سات بجے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی دن مغرب کے بعد بیرون فتح دروازہ، درگاہ حضرت شاہ راجو (تانا شاہ کے پیر) کے قریب درگاہِ شمس الدین (مصری گنج) میں تدفین عمل میں آئی - اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون - احمد اللہ احمد القدیری نے ہجری میں تاریخ کہی:

سید محمد آج بہشت بریں رواں (۱۳۹۶ھ)

اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے عیسوی میں:

حضرت سید محمد نے صبح پردا کیا (۱۹۷۶ء)

ان کی شادی جناب محمد عثمان کی صاحبزادی زیب النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ محمد عثمان صاحب ریاستِ نظام کے محکمۂ مالگذاری (بورڈ آف ریونیو) میں محافظ دفتر (ریکارڈ کیپر) تھے۔ ان کا شاید ۱۹۳۲ء میں انتقال ہو گیا۔ سید محمد مرحوم نے اپنے پیچھے بیوی کے علاوہ پانچ بیٹے (معراج محمد، اعجاز محمد، منظور محمد، نور محمد، ممتاز محمد) اور پانچ بیٹیاں اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔ افسوس کہ زیب النسا بیگم کا بھی اپنے شوہر کی وفات کے صرف ۲۵ دن بعد جمعہ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۶ء (۲۸ رمضان ۱۳۹۶ھ) کو انتقال ہو گیا۔ اپنے شوہر کے پہلو میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

پریم ناتھ دَر

ان کے خاندان کا گوتر دَر بھاردواج تھا، جو کشمیری پنڈتوں میں ایک معزز سلسلہ خیال کیا جاتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ یہ لوگ بھاردواج رشی کی نسل سے ہیں، جن کا نام ویدوں اور اُپ نشدوں کے مفسروں میں شمار ہوتا ہے۔ مدتوں خاندان کا نام بھاردواج ہی رہا۔ لیکن بعد کو اس میں دَر (دھر) کا اضافہ خاندان کی دوسری شاخوں سے امتیاز کی خاطر کیا گیا۔ "دَر" اصل میں ان کے ایک بزرگ (پنڈت صاحب دَر بھاردواج) کے نام کا حصّہ تھا۔ انھیں پنڈت صاحب دَر کی تیسری پُشت میں پنڈت رام چند ہوئے، جو پریم ناتھ دَر کے والد تھے۔ بدقسمتی سے پریم ناتھ کو اپنے والد کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ ان کی وفات (مارچ ۱۹۱۴ء) کے کوئی پانچ مہینے بعد ۳۰ جولائی ۱۹۱۴ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔

پرانے بزرگ تجارت پیشہ تھے اور لدّاخ کے رستے تبت سے درآمد برآمد کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن اسلامی حکومت کے زمانے میں یہ لوگ سرکاری ملازمت میں بھی شامل ہو گئے۔ اسی عہد میں عزّ وجاہ بھی ملا، اور جاگیریں بھی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب ریاست کشمیر کا انضمام ہوا ہے، تو اس وقت دو سب سے بڑے زمیندار دَر خاندان ہی کے تھے۔ لیکن یہ ہے کہ ان کے خاندان کی پرانی شان و شوکت کب کی ختم ہو چکی تھی۔ ہر سال آگ لگنے سے سب مکانات جل کر خاک ہو گئے۔ بچا کھچا اثاثہ سفید پوشی کی بسر اوقات کے لیے بھی بمشکل کفایت کر سکتا تھا۔

پنڈت رام چند اپنے والد پنڈت بالک رام دَر کے دوسرے بیٹے تھے۔ انھیں پڑھنے

ماخذ: تریمیتی للتا (پریم پرتما)؛ نرملا (دختر پریم ناتھ دَر)؛ ٹریبیون (روزنامہ، لاہور)؛ انگریزی خودنوشت (قلمی)

لکھنے سے دلچسپی تھی، لیکن خاندان کے حالات ان کے تعلیم جاری رکھنے میں معاون ثابت نہ ہوئے اور انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے ملازمت اختیار کرنا پڑی، وہ پولیس میں نوکر ہو گئے۔ لیکن ان کا سنسکرت اور فارسی کا ذوق عمر بھر ان کے ساتھ رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں میں انھیں خاصی مہارت تھی۔ وہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، تخلص ترک تھا۔ اسی لیے بعض لوگ خاندان ہی کو "ترکی" کہنے لگے۔ انھوں نے بھاگوت کا منظوم ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ افسوس کہ اس کتاب کا خطی نسخہ، جو ان کی وفات کے بعد بھی بہت دن تک خاندان میں رہا، محفوظ نہ رہ سکا اور ضائع ہو گیا۔

والد کی وفات کے بعد پریم ناتھ کی نگہداشت اور سرپرستی ان کے بڑے چچا پنڈت شیوجی دھرنے کی، جو مجرد رہے۔ پنڈت شیوجی خاصے متمول آدمی تھے اور ساہوکارے کا کاروبار کرتے تھے۔ انھوں نے پریم ناتھ در کو متبنیٰ بنا لیا۔ ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا، جب پریم ناتھ ابھی ساتویں درجے کے طالب علم تھے۔

بچپن میں پریم ناتھ کی صحت بالعموم ٹھیک نہیں رہتی تھی، وہ بہت دبلے پتلے اور نحیف الجثہ تھے۔ قدرتاً اس سے ان کی والدہ کو تشویش تھی کہ بزرگوں کی یہ اکیلی نشانی پروان چڑھتی ہے یا نہیں! پنڈت رام چند کا سب سے پہلا بچہ ایک لڑکا دینا ناتھ تھا، جو صغر سنی میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دو لڑکیاں (دیوکی اور رون مالا) ہوئیں۔ دیوکی بھی سولہ سال کی عمر میں رحلت کر گئی، ہنوز اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ رون مالا البتہ شادی کے ۱۲ برس بعد تک زندہ رہی اور ایک بیٹا بنسی لال اپنی یادگار چھوڑ کر جان بحق ہوئی۔

پریم ناتھ اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے۔ لازماً بیوہ ماں جتنی بھی فکر مند ہوتی، کم تھا۔ اس کی ساری امیدیں اور ارمان ان کے کامیاب مستقبل سے وابستہ تھے۔ لیکن افسوس انھیں یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ سری نگر بزناب ہائی اسکول، سرینگر کے دسویں درجے میں تعلیم پا رہے تھے، جب ۱۹۲۹ء میں والدہ کا تپ دق

کے موذی مرض سے انتقال ہوگیا۔ پریم ناتھ اس وقت بمشکل پندرہ برس کے تھے۔ اگلے برس ۱۹۳۰ء میں انھوں نے دسویں درجے کی سند حاصل کرلی اور پھر وہیں سرینگر میں سری پرتاپ کالج میں داخلہ لے لیا۔ انھوں نے بی۔ اے ۱۹۳۴ء میں پاس کیا۔

اب روزگار کا مسئلہ پیش آیا۔ بزرگوں کی روایت راج دربار کی ملازمت کی تھی۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ ریاست کی نوکری کرلی جائے۔ لیکن پریم ناتھ کے دماغ میں آزادی اور بغاوت کے جراثیم پرورش پا رہے تھے۔ انھوں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بسر اوقات کے لیے طلبہ کو نجی طور پر پڑھانے (ٹیوشن) پر اکتفا کی۔ تھوڑے دن بعد چند ہمخیال دوستوں کے تعاون سے انھوں نے "انجمن بیکاراں" بنائی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ نوجوان اپنی تنظیم کریں اور بیکاری کی لغویات میں وقت ضائع کرنے سے گریز کریں۔ ناگزیر تھا کہ وہ رفتہ رفتہ سیاست کے میدان میں آجاتے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ دوستوں نے اصرار کیا اور انھوں نے ایک نیم سیاسی، نیم سماجی ادارے "ہندو پروگریسو پارٹی" کی بنیاد رکھی۔ اب حلقۂ عمل بہت وسیع ہوگیا۔ اس سے جہاں دوسری تنظیموں کے سرگرم کارکنوں سے تعارف اور تعلقات پیدا ہوئے، وہیں سرکاری حلقے بھی انھیں شک وشبہہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کا شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد مرحوم (ف: جولائی ۱۹۷۲ء) سے تعارف ہوا۔ پریم ناتھ جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس کے بنیادی اراکین میں سے تھے، بلکہ ایک روایت کے مطابق اس کا جھنڈا بھی انھیں کا بنایا ہوا تھا۔

حکومت ان کی سرگرمیوں سے بیخبر نہیں تھی اور ان کی کڑی نگرانی کر رہی تھی فیصلہ یہ ہوا کہ اب ان کا دائرۂ عمل مناسب حدود سے متجاوز ہو رہا ہے، لہٰذا لازم ہے کہ انھیں گرفتار کرلیا جائے۔ انھیں بھی اپنے دوستوں کے ذریعے پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ جب انھوں نے سنا کہ وارنٹ جاری ہوگیا ہے، تو یہ اور بخشی غلام محمد دونوں اولاً روپوش ہوگئے اور پھر بھیس بدل کر سرحد کی طرف بڑھے کہ کسی طرح انگریزی

علاقے میں پہنچ جائیں ۔ پریم ناتھ نے اس زمانے میں ایک گنوار کسان کا بھیس بدلا ۔ مراد خان نام اختیار کیا ۔ سر پر دہقانی کلپوش اوڑھے اور دن میں جسم پر کمبل لپیٹے رہتے ، بات چیت بھی ٹھیٹ دیہاتی بولی اور لہجے میں کرتے ؛ اور وہ بھی اشد ضروری موقع پر کہ کہیں بھید نہ کھل جائے ۔ اُدھر جب حکومت کے کارندے انھیں گرفتار کرنے کو مکان پر پہنچے ، تو انھیں پتا چلا کہ پنچھی اُڑ گیا ہے ۔ اس پر حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص انھیں گرفتار کرنے میں مدد دیگا ، اُسے پانسو روپے انعام دیا جائیگا ۔ بہرحال سو صعوبتیں جھیلنے کے بعد یہ ریاست سے نکل کر لاہور پہنچے یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے ۔

لاہور ان دنوں ہماری قومی تحریکِ آزادی کا اہم مرکز تھا ۔ چونکہ یہ قیام سرینگر کے زمانے میں بھی ریاست کے حالات کے بارے میں انگریزی میں مضمون لکھتے رہے تھے ، اس لیے لاہور کے ادبی حلقوں میں ایسے اجنبی بھی نہیں تھے ، یہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ۔ لاہور میں انھوں نے مضامین کے ذریعے سے اور جلسوں اور تقریروں سے لوگوں کو کشمیر کے حالات سے آگاہ کرنے کی کوشش جاری رکھی ۔ لیکن وہ لاہور میں زیادہ دن نہیں رُکے اور جلد ہی وہاں سے دلّی منتقل ہو گئے ۔

دلّی میں بھی وہی مشغلہ جاری رہا : مضمون نگاری اور تقریر بازی ۔ تقریر میں انھوں نے بہت مہارت حاصل کر لی تھی ۔ مسلسل مشق اور حالاتِ حاضرہ سے واقفیت کے باعث ان کی تقریریں بہت متاثر ہوتیں ۔

اب دیکھیے حسنِ اتفاق کا ایک کرشمہ !

حسبِ معمول ایک شام انھوں نے دلّی کی رام لیلا گراؤنڈ میں تقریر کی ۔ سامعین میں ایک کشمیری پنڈت شری گووند جی بھٹ بھی موجود تھے ۔ وہ کسی زمانے میں مہاراجا گوالیار کے ہاں راج جوتشی رہے تھے ، اور اب وہاں سے سبکدوش ہو کر دلّی میں آ بسے تھے ۔ انھوں نے جو ایک کشمیری نوجوان کو اس روانی اور طلاقت سے تقریر کرتے سُنا ،

ہ غالباً یہ لفظ "کلہ پوش" کی تخفیف ہے ۔

تو بہت خوش ہوئے۔ چونکہ پریم ناتھ اسٹیج پر کانگریس کے سربرآوردہ عمائد کے ساتھ بیٹھے تھے، اس سے ان کے پندار اور جذبۂ عزتِ نفس کی کچھ تسکین ہوئی۔ جلسے کے خاتمے پر ان کا پتا معلوم کیا اور اب گاہے ماہے ملاقات ہونے لگی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ پریم ناتھ کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں، دوستوں کے ہاں پڑے ہیں، تو انھوں نے اپنی قدردانی اور اخوت اور ہمدردی کا مظاہرہ یوں کیا کہ انھیں دعوت دی کہ آپ میرے ہاں اٹھ آئیں اور آئندہ میرے مکان کو اپنا مکان سمجھیں۔ پریم ناتھ کہتے تھے کہ میں اچھے کشمیری کھانے کو ترس گیا تھا، جب سے کشمیر سے نکلا تھا، کہیں اپنی پسند کا کھانا نہیں ملا تھا۔ بھٹ صاحب نے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی، تو میں نے خیال کیا کہ خدا نے میری سن لی۔ ضمناً یہ لکھنا چاہیے کہ پریم ناتھ کی والدہ سمنگھی (میکے کا نام جے مالا تھا) بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں اور اس پہلو سے ان کی پورے سرینگر میں شہرت تھی؛ بڑے بڑے شاہی رکابدار بھی اس فن میں ان کا کلمہ پڑھتے تھے۔ پریم ناتھ نے پندرہ برس ان کے ہاتھ کے پکائے ہوئے لذیذ کھانے کھائے تھے۔ قدرتاً انھیں وہ یاد آتے تھے، لیکن اس کا علاج بھی کیا تھا! اب جو کچھ بھی ملتا، اسی پر قناعت کرنا پڑتی تھی۔ بھٹ صاحب نے انھیں مستقلاً اپنے ہاں رہنے کو کہا، تو انھوں نے اسے نعمتِ غیر مترقبہ خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا۔ اور سیتارام بازار (دلی) میں ان کے مکان پر اٹھ گئے۔

بھٹ صاحب کی ایک بیٹی تھیں للتا دیوی نام۔ اس زمانے میں یہ اندر پرستھ کالج (دلی) میں بی اے کے درجے میں پڑھتی تھیں۔ چونکہ پریم ناتھ گھر ہی میں رہتے تھے۔ صبح شام کے اکثر اوقات یکجا رہنے سے انھیں للتا سے محبت ہو گئی۔ پریم ناتھ نے بھٹ صاحب سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں، تو للتا کی پڑھائی میں کچھ مدد کر دیا کروں۔ بھولے بھٹ صاحب بھلا "مطلب سعدی" کیا سمجھتے؛ وہ بخوشی مان گئے۔ اور یوں ان دونوں کو روزانہ کچھ وقت ایک دوسرے سے بے خلل بات چیت کرنے کا موقع مل گیا۔ جب للتا دیوی نے بی۔اے کا امتحان پاس کر لیا، تو اب پریم ناتھ نے

بھٹ صاحب سے درخواست کی کہ وہ دونوں کی شادی کی منظوری دے دیں۔ بھٹ صاحب نے اس پر اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن ایک شرط لگا دی کہ سیاست میں حصّہ لینا ترک کر دو۔ پریم ناتھ کے لیے یہ بہت بڑی قربانی تھی، لیکن وہ کسی صورت محبوب سے دستبردار ہونے پر بھی تیار نہیں تھے۔ بادشاہوں نے تو اپنے تاج و تخت محبّت کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دیے ہیں، یہاں تو محض ایک سرگرمی میں عدم شرکت کی بات تھی۔ انھوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ شادی کے بعد انھوں نے بیوی کو نیا نام دیا: پریم پرتما (محبّت کی مورتی)۔

اب سوال روزگار حاصل کرنے کا تھا۔ اپنے سیاسی کاموں کے دوران میں انھیں گاندھی جی کے چھوٹے صاحبزادے دیوداس (ف: اگست ۱۹۵۷ء) سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ دیوداس ان دنوں مشہور انگریزی روزنامے "ہندستان ٹائمز" دلّی کے مدیر اعلیٰ تھے۔ پریم ناتھ ان کے پاس گئے۔ اور ان سے باصرار کہا کہ مجھے اپنے ہاں ملازمت دے دیجیے۔ دیوداس سے ان کی صحافی صلاحیت پوشیدہ نہیں تھی۔ انھوں نے فوراً انھیں نیوز ایڈیٹر مقرر کر دیا، اور چند سے بعد سب ایڈیٹر بنا دیا۔ پریم ناتھ یہاں صرف دو سال رہے، ۱۹۴۲ء میں ایک دوسرے مشہور روزنامے "اسٹیٹس مین" میں ملازم ہو گئے۔ ان دونوں اخباروں کا تجربہ ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ حکومت کا ریڈیو کا محکمہ انگریزی میں ایک ماہنامہ "انڈین لسنر" کے نام سے نکالتا تھا؛ اس کے ساتھ "اردو آواز" بھی شائع ہوتا تھا۔ پریم ناتھ پہلے انگریزی رسالے کے مدیر معاون مقرر ہوئے، اور بعد کو "آواز" کے مدیر۔

اس کے بعد وہ حکومتِ ہند کی باقاعدہ ملازمت میں شامل ہو گئے۔ ان کا تعلق ہمیشہ ریڈیو سے رہا۔ مدتوں شعبۂ اردو میں پروگرام ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ آخری دورِ ملازمت میں وہ ڈپٹی ڈائرکٹر فیلڈ پبلسٹی اور پھر کشمیر سیکشن میں خصوصی افسر کے عہدے پر متمکن تھے۔ یوں کوئی ۳۰ برس کے بعد وہ جولائی ۱۹۷۲ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ مزید ایک سال کے لیے (جولائی ۱۹۷۳ء تک) خاندانی منصوبہ بندی

کے شعبے میں بطور مشیر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد حکومت ہند سے تعلق منقطع ہو گیا۔
تقسیم ملک کے زمانے میں انھوں نے ایک اور تعمیری کام بھی کیا تھا۔ مغربی پنجاب سے جو ادیب اور شاعر حضرات دلّی پہنچے، وہ بہت پریشان حال تھے۔ پریم ناتھ در نے اپنے بعض دوستوں کے تعاون سے "حلقۂ اربابِ ذوق" قائم کیا اور تمام مہاجر ادیبوں کو اس کے ہفتہ واری اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ اس سے ان اصحاب کو جو ذہنی اور جذباتی سکون ملا، اس کا اعتراف یہ لوگ آج تک کرتے ہیں۔
جب شیخ محمد عبداللہ دوبارہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے، تو انھوں نے پریم ناتھ کو مارچ ۱۹۷۵ء میں اخباری امور (پریس) کے لیے اپنا مشیر مقرر کر دیا۔ لیکن اب ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ لہٰذا وہ علاج کے لیے دلّی چلے آئے۔ عام کمزوری کے علاوہ آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا: ذیابیطس کی شکایت بھی تھی۔ یہاں وہ علاج معالجے سے رو بہ صحت ہو گئے، تو شیخ صاحب موصوف کے بلانے پر اپریل ۱۹۷۶ء میں دوبارہ کشمیر گئے۔ لیکن طبیعت پھر بگڑ گئی اور وہ دلّی واپس آنے پر مجبور ہو گئے۔
لیکن اب کے دوا دوش سے صحت میں کوئی بہتری نہیں ہوئی، بلکہ بخار بہت تیز رہنے لگا۔ اسی حالت میں پیر ۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو شام کے ساڑھے سات بجے حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔
جیسا کہ ذکر ہوا، ۱۹۴۰ء میں ان کی شادی کَلما بھٹ سے ہوئی تھی۔ وہ بفضلہ زندہ سلامت موجود ہیں۔ پانچ بچے ان سے یادگار ہیں: تین لڑکیاں (نرملا، وینا، پرگتی) اور دو لڑکے یگ پرکاش (عرف تبو) اور رجنگ پرکاش (عرف لالو) سب اپنی اپنی جگہ پر مطمئن اور خوشحال ہیں۔
انھوں نے شروع میں بہت دن تک انگریزی اخبار ہی میں لکھا، لیکن شادی کے بعد دلّی میں مستقل سکونت اختیار کر لینے اور خاص طور پر ریڈیو سے وابستگی نے انھیں اردو کی طرف مائل کر دیا۔ وہ مذاق سے کہا کرتے تھے کہ اردو الفاظ کا صحیح تلفظ میں نے اپنی بیوی کَلما سے سیکھا ہے۔ بہر حال انھوں نے افسانہ نویسی پر توجہ دی۔ ان کا پہلا افسانہ "غلط فہمی"

ادبی دنیا (لاہور) کے شمارۂ نومبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ رسالے کے
مدیر صلاح الدین احمد (ف: جون ۱۹۶۴ء) نے ایک تعریفی اور تعارفی شذرہ لکھا تھا۔
دوسرے نقادوں نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد وہ کبھی کبھی، جب انھیں
اپنے منصبی کاموں سے فرصت ملی، افسانے لکھتے رہے۔ ان کے نو افسانوں کا پہلا
مجموعہ "کاغذ کا واسدیو" کے عنوان سے شائع ہوا (دلّی: ۱۹۴۹ء)۔ اس کا پیش لفظ
سید احتشام حسین نے لکھا تھا۔ دوسرا مجموعہ "نیلی آنکھیں" اس کے کوئی گیارہ برس بعد
شائع ہوا (دلّی: ۱۹۶۰ء)۔ اس میں دس افسانے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ کشمیری میں
بھی لکھتے تھے؛ چنانچہ ان کا ایک کشمیری ڈراما "ازدوی گبر" (= دو بیٹے) ۱۹۶۹ء میں
دلّی سے شائع ہوا تھا۔ آخری ایام میں وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے تھے، ان کے چار پانچ
افسانے ہندی کے بعض موقّت الشیوع پرچوں میں چھپے تھے۔ ان کا ہندی میں ایک
سوشل ڈراما بھی "گھر کی بات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے؛ اس پر انھیں کشمیر اکاڈمی
نے انعام بھی دیا تھا۔ انھوں نے انگریزی میں اپنے خاندان کے تفصیلی حالات لکھنا
شروع کیے تھے، لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔ صرف بزرگوں کے حالات قلمبند کیے تھے
کہ اور کاموں میں الجھ گئے، اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اس کا مسودہ میری نظر سے گزرا
ہے۔ اگر یہ مکمل ہو گیا ہوتا، تو اس سے نہ صرف ان کی ابتدائی ہنگامہ خیز زندگی کی
تفصیلات معلوم ہوتیں، بلکہ اس عہد کی سیاسی تاریخ کی تکمیل کے لیے بھی خاصا
معتبر مواد ہماری دسترس میں آجاتا۔ ایک اور نامکمل کتاب زنـ (The Event
کے نو ابواب بھی ان کے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ افسوس، وہ اس کا آخری
باب نہ لکھ سکے۔ اس میں اپنے مرشد نندلال جی (عرف نندبب) کے ساتھ اپنے روحانی
تجربات بیان کیے ہیں۔

کلیم، محمد مکین احسن

نگرام کے ایک صاحب وجاہت خاندان کے فرد ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عبادہ بن صامت انصاری صحابی حضرت رسول اللہ صلعم سے ملتا ہے۔ (ان کے جدِ اعلیٰ رجبن کے نام میں اختلاف ہے) ابراہیم لودی کے عہدِ سلطنت میں لاہور آئے۔ ان سے چوتھی پشت میں خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ یہاں انھیں بہت عروج حاصل ہوا۔ ان کے ایک بزرگ حافظ علیم اللہ شائق وزیر اودھ امین الدولہ کے استاد تھے محمد مکین کے والد محمد امین احسن مرحوم مدتوں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر متمکن رہے تھے، اور ان کا یوپی کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔

مکین احسن نے ابتدائی تعلیم مولانا نجم الحسن کی نگرانی میں پرتاپ گڑھ میں پائی بالآخر الہ آباد یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ عربی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ مرکزی حکومت کے ریڈیو مانیٹرنگ سکشن میں ملازم ہو گئے۔ اس شعبے کے فرائض میں بیرونی ممالک کے ریڈیو کا سننا اور وہاں کی خبروں کی تلخیص پیش کرنا ہے؛ اس کام میں عربی کا علم ان کے بہت کام آیا۔ لیکن انھوں نے جلد ہی یہ سرکاری ملازمت ترک کر دی، اور لکھنؤ کے روزنامہ "قومی آواز" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ یہاں سے غالباً ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) چلے گئے۔ چندے بعد وہاں سے لاہور پہنچے اور روزنامۂ "ملت" میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں روزنامہ "نوائے وقت" کے عملۂ ادارت میں شامل ہوئے۔ یہاں وہ آٹھ برس تک رہے۔ ۱۹۶۰ء میں روزنامۂ "مشرق" جاری ہوا، تو کلیم بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے نائب مدیر اور پھر مدیر مقرر ہوئے۔

ماخذ: ذکرِ احسن از محمد صدیق؛ خطوطِ مشفق خواجہ، کراچی؛ غزل انسائیکلوپیڈیا از ذکی کاکوروی

انھوں نے متعدد ممالک کا سفر کیا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ غرض زندگی خاصی کامیاب رہی۔

کلام پر اصلاح اپنے چچا احسن صاحب سے لی تھی۔

شب شنبہ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۶ء کو لاہور (پاکستان) میں دماغ کی شریان پھٹ جانے سے انتقال ہوا۔ صرف ۳۵ سال کی عمر پائی۔ لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک ہوئے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

کلام کا مجموعہ غالباً شائع نہیں ہوا۔ یہ چند شعر ایک انتخاب میں نظر سے گزرے:-

نہیں کچھ اور تو ممکن تھی خودکشی پھر بھی — ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی
یہ تیرگی تو بس اک گردشِ زمیں تک ہے — مگر یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی
چمن لٹا ہے خود اہلِ چمن کی سازش سے — کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی
کسی کو پا کے بھی اکثر گماں یہ ہوتا ہے — کہ جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی
ہمیں پہ یورشِ ظلمت، ہمیں ہیں کشتۂ شب — ہمیں ہیں پیشرو صبح و روشنی پھر بھی

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں — ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے
ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا — زمیں پر بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

Scanned with CamScanner

محشر عنایتی رامپوری (صابر رضا خان)

محشر کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے کسی نے کچھ لکھی ہے کسی نے کچھ — سب سے زیادہ ثقہ روایت ان کے حقیقی بڑے بھائی جناب محمود رضا خان صاحب (ددا بھائی) کی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ جب ہمارے والد مولوی احمد رضا خان کا نومبر ۱۹۱۵ء میں انتقال ہوا ہے، تو اس وقت میری عمر ساڑھے آٹھ سال کی تھی اور صابر رضا خان (مجھ سے ڈھائی برس چھوٹے)، چھ سال کے تھے — اس سے معلوم ہوا کہ یہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔

ان کی تعلیم سراسر گھر پر ہوئی، اور وہ بھی عربی اور فارسی تک محدود رہی۔ البتہ اس سے ان کے دل میں وسیع تر حصول علم اور مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعد کو انھوں نے اساتذہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور اسی دوران میں عروض میں بھی خاصی مہارت پیدا کر لی۔

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت کم عمری میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ شروع میں تخلص "پروین" تھا اور اس زمانے میں وہ صفدر (علی خان صفدر) سے اصلاح لیتے تھے، جو منجم کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ صفدر نے انھیں "پروین" ترک کر کے محشر تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے صرف یہ مشورہ ہی قبول نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ عنایتی کے لاحقے کا اضافہ کر کے محشر عنایتی ہو گئے۔ یہ نسبت انھوں نے اپنے بزرگ مولوی حافظ عنایت اللہ خان مرحوم کے نام سے اختیار کی تھی۔ حافظ صاحب موصوف بیک وقت ان کی والدہ مرحومہ عزیز بیگم کے حقیقی دادا اور ان کی دادی کے عم زاد بھائی تھے، اس طرح

ماخذ: روداد جشن محشر (عابد رضا بیدار)؛ اظہر عنایتی ایڈوکیٹ، رام پور

گویا وہ محشر کے والد احمد رضا خاں مرحوم کے ماموں ہوئے۔ وہ بڑے متقی اور پرہیزگار، صاحبِ دل اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کا ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ ان کی خانقاہِ عنایتیہ، رامپور کے محلّہ زیارت حلقے میں موجود ہے۔
صفدر سے تلمذ کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں منقطع ہو گیا، اور اس کے بعد وہ منشی رشید احمد خان رشید (ف: اپریل ۱۹۶۴ء) کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ رشید خود محمود رامپوری (تلمذ داغ) کے جانشین تھے اور رامپور میں اپنے استاد داغ دہلوی کے رنگِ سخن۔ کے سب سے بڑے علمبردار۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، داغ کے ہاں زبان اور محاورے اور روزمرّے اور معاملہ بندی اور محاکات پر خاص توجہ ہے۔ ادھر محشر محض زبان اور چونچلے سے نکل کر اس سے بلند تر فضا میں پرواز کرنے کے لیے پَر تول رہے تھے۔ استاد کو اپنے گھرانے کی روایت سے یہ انحراف پسند نہ آیا۔ اس لیے چھ برس کے تعلّق کے بعد ۱۹۲۸ء میں محشر نے ان سے مشورہ کرنا بند کر دیا۔ اس زمانے میں انھوں نے غالباً چند غزلیں خود حضرت محمود کو بھی دکھائیں۔ لیکن جو مشکل رشید سے مشورہ کرنے کے راستے میں حائل تھی، وہی یہاں بھی مانع آئی۔ بالآخر انھوں نے قاضی حافظ الدین نشتر مقتدری سکندرآبادی سے رجوع کیا، جو اپنے استاد (اور ماموں) قاضی محمد حیات بخش رسا سکندرآبادی کی وفات (۲۲ نومبر ۱۹۱۳ء) کے بعد دربارِ رامپور میں ملازم ہو گئے تھے؛ اور ان دنوں رامپور ہی میں مقیم تھے۔ نشتر استادِ فن اور نقادر الکلام شاعر تھے؛ افسوس، ایک مختصر مجموعے "جام و مینا" کے سوا ان کا اور کلام شائع نہیں ہو سکا؛ اور اس مجموعے میں بھی صرف خمریات کے اشعار ہیں۔ ان کا ۵/۷/۱۹۴۷ء میں پاکستان میں انتقال ہوا۔ نشتر صاحب سے بھی زیادہ دن مشورہ نہیں رہا، کیونکہ انھوں نے محشر کو فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔
محشر نظم ہی نہیں، نثر میں بھی بند نہیں تھے۔ شروع میں کچھ افسانے بھی لکھے، لیکن جلد ہی یہ میدان چھوڑ دیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں رامپور کی دیسی حکومت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ملک کی سیاسی تحریک اور عام بےچینی کے اثرات ریاست میں بھی نہ پہنچ جائیں۔

ان کا سدباب کرنے کی خاطر روزنامہ "ناظم" (رامپور) میں ایک ہفتہ وار ضمیمے کا اضافہ کیا گیا جس میں دیہاتی موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔ اس ضمیمے کی ترتیب و تدوین محشر کے سپرد تھی۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ریاست کے محکمۂ مال میں "محرر سرسری" (عارضی کلرک) رہے تھے اور اس زمانے میں بھی ان کی ادبی اور شعری صلاحیتوں کی شہرت تھی۔ اس ملازمت کا ذکر ان کے ایک قطعے میں بھی ہے، لکھتے ہیں:

مانا نہیں ہے میری طرف چشم التفات
مانا تری نگاہ کرم سے بری ہوں میں
اچھا تو پھر مری طرف اک سرسری نگاہ
وہ اس لیے کہ "اہلمد سرسری" ہوں میں

معلوم نہیں، وہ کلرکی سے کیوں مستعفی ہو گئے اور کاشتکاری کرنے لگے۔ جلد ہی وہاں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ بہت پہلے یعنی ۱۹۳۸ء میں وہ مقامی میونسپل کمیٹی کا انتخاب لڑ کر اور اس میں کامیاب ہو کر سیاست حاضرہ سے اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کر چکے تھے صحافت میں یہ شوق دوآتشہ ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں روزنامہ "آغاز" جاری ہوا، تو محشر اس میں بھی کام کرنے لگے۔ سال بھر بعد "آغاز" روزنامہ سے ہفتہ وار ہو گیا، جب بھی انھوں نے دونوں سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ لیکن چار سال بعد ۱۹۵۱ء میں وہ "ناظم" کے عملے سے الگ ہو کر کلاً "آغاز" کے ہو کر رہ گئے۔ سال بھر میں اسے بھی چھوڑ دیا اور پھر موروثی زمین کی دیکھ بھال کرنے کو دیہات میں چلے گئے۔ لیکن سیمابی طبیعت نے یہاں بھی جمنے نہ دیا اور ۱۹۵۳ء میں "ناظم" میں واپس آگئے۔

"ناظم" کی ادارت کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا۔ دلی کے ایک ہفتہ وار میں یوپی کی حکومت کے خلاف سخت تنقیدی اداریہ شائع ہوا۔ محشر صاحب ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے بچھرایوں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں جائنٹ ایڈیٹر نے، جو اس وقت مدیر تھے، یہ اداریہ "ناظم" میں اداریے کے طور پر نقل کر لیا۔ حکومت یوپی نے اس پر

"ناظم" کے مالک اور مدیر (محشر عنایتی) پر دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ قائم کر دیا رامپور کی عدالت نے انھیں ڈھائی مہینے قید کی سزا دے دی۔ بالآخر اپیل میں وہ بری ہو گئے، لیکن اس سے پہلے وہ ہفتے عشرے کی قید کاٹ چکے تھے۔

اب انھوں نے اپنا ہفتہ وار "شیرازہ" جاری کیا۔ وہ مدتوں "روشن ضمیر" کے قلمی نام سے ایک کالم "پسِ پردہ" بھی لکھتے رہے۔ اس میں طنز و مزاح کے انداز میں مقامی اور ملکی مسائل پر تبصرہ ہوتا تھا۔ افسوس کہ انھوں نے یہ اندازِ سخن ترک کر دیا، اور یوں اردو دنیا ایک اُبھرتے مزاح نگار سے محروم ہو گئی۔

اسی دوران (۱۹۵۳ء) میں وہ دوبارہ میونسپل کمیٹی کے رکن بھی منتخب ہوئے تھے۔

غرض ان کی پوری زندگی بے ہمہ اور باہمہ قسم کے ہنگاموں میں بسر ہوئی۔ آئے کی خوشی نہیں، گئے کا غم نہیں۔ اس کا ثبوت ان کی زندگی کے ایک اور واقعے سے بھی ملتا ہے۔ ان کے ایک ماموں تھے، مولوی احسان اللہ خان۔ مولوی صاحب کا ایک باغ تھا۔ انھوں نے اس کی فصل بعض لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دی۔ جب باغ پر ان اصحاب کا قبضہ ہو گیا، تو انھوں نے وہاں شراب کشید کرنے کی بھٹی لگا دی۔ یہ نہ صرف معاہدے کی اور قانون کی خلاف ورزی تھی، بلکہ اخلاقاً بھی قابلِ اعتراض بات تھی۔ لہٰذا مولوی صاحب موصوف ان لوگوں سے بات چیت کرنے اور انھیں سمجھانے بجھانے کی خاطر ان کے مکان پر گئے۔ محشر بھی ماموں کے ساتھ تھے۔ اتفاق سے مولوی احسان اللہ خان کی بندوق ان کے ہاتھ میں تھی۔ بات چیت میں کچھ تیزی اور تلخی پیدا ہو گئی۔ مولوی صاحب نے بہت برداشت کیا اور طرح دیتے رہے۔ یکایک مخالف نے بلم سے ان پر وار کر دیا۔ یہ بھی آخر پٹھان تھے، جواباً انھوں نے فیر کر دیا۔ گولی حملہ آور کے سینے میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اب مخالفوں نے بھالوں، بلموں اور رنبوں سے مولویوں پر ہلّہ بول دیا۔ سب کے زخم آئے، لیکن محشر صاحب ناوہ بچ گئے۔ حالانکہ ان کے پاس فقط ایک پتلی سی چھڑی تھی، جسے وہ عموماً ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ قصہ کوتاہ، دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند کے تحت قتل کا مقدمہ قائم ہوا، اور محشر صاحب بھی

اس میں ماخوذ ہو گئے۔ یہ مقدمہ بہت دن چلا۔ جب اس کا فیصلہ ہوا، تو خوش قسمتی سے
یہ سب لوگ بری الذمہ قرار پائے لیکن اس دوران میں محشر صاحب نے جس اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش
کیا، دوست دشمن سب اس کے معترف تھے۔ ان کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ عدالت
میں مقدمے کی کارروائی سے بے پروا، وکیلوں کی جرح سے بے تعلق، فیصلے سے
بے نیاز، وہ بیٹھے کتاب دیکھتے رہتے، یا اپنی روایتی شگفتگی اور بذلہ سنجی سے دوستوں کے ساتھ
شعر و شاعری اور گپ بازی ہوتی

انھیں ایک زمانے سے ذیابیطس کا عارضہ لاحق تھا۔ لیکن سخت بد پرہیز تھے، کبھی
اس کی پروا نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں صحت بحال ہونے کا کیا امکان تھا!
جون ۱۹۷۷ء میں پیٹھ میں پھوڑا نکل آیا۔ علاج سے یہ دب گیا۔ اگر پک کر پھٹ جاتا، تو
شاید نقصان نہ ہوتا۔ اس کے دب جانے سے اس کی سمیت سارے جسم میں تحلیل ہو گئی
اور خاص طور پر خون میں زہریلا مادہ پیدا ہو گیا۔ شہر بھر کے ڈاکٹر علاج میں جٹے رہے
لیکن موت کو کون ٹال سکتا ہے! اسی میں بدھ کے دن ۲۲ دسمبر ۱۹۷۷ء صبح نو بجے کے
قریب جان بحق ہو گئے؛ اور اسی دن عشا کے وقت انھیں درگاہِ عنایتیہ کے احاطے
میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

مرحوم کی شادی ۱۹۲۵ء میں رامپور کے مشہور حکیم نذیر احمد خان (عرف دھومی خان)
کی صاحبزادی اعجازی بیگم سے ہوئی تھی؛ یہ بفضلہ بقیدِ حیات ہیں۔ اولاد میں پانچ
بیٹے (۱) مشہود رضا خان عرف سلیم عنایتی، (۲) معتبر رضا خان عرف نعیم، (۳) نوازش
رضا خان عرف فہیم، (۴) جمال افروز خان عرف وسیم، (۵) اکرم رضا خان عرف صمیم اور دو بیٹیاں (گلزار
خاتون عرف رباب اور نادرہ زبیر عرف پپو) اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ وہ اس کا نام اپنی چہیتی
بڑی صاحبزادی کے عرف کی نسبت سے "ربابِ حیات" رکھنا چاہتے تھے۔ رامپور میں
ان کے شاگردوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ ان کی زندگی میں ۱۹۷۱ء کے "جشنِ بہار"
کے موقع پر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مقامی صولت پبلک لائبریری میں "جشنِ محشر"

کے نام سے ایک جلسہ کیا تھا۔ اس تقریب میں محشر کے بعض دوستوں نے کچھ مضامین پڑھے تھے۔ انھیں کا مجموعہ ان کے کلام کے مختصر انتخاب کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں چھپا تھا۔ لیکن کتاب کی عام اشاعت نہیں ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد "صہبا و سمن" کے عنوان سے ایک مختصر انتخاب محشر اکیڈمی کے صدر واحد القادری نے شائع کیا (رامپور، مارچ ۱۹۷۹ء)

محشر نے ایک اور معرکے کا کام کیا تھا۔ انھوں نے ایک دیہاتی لڑکی کے جذبات اور تاثرات اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جس چابکدستی سے قطعے اور رباعیاں کہی ہیں، وہ خاصے کی چیز ہے۔ فراق نے "روپ" میں اور جاں نثار اختر نے "گھر آنگن" میں اسی رنگ کی کچھ چیزیں پیش کی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فراق کے ہاں سنگھار رس اور جنسیت زیادہ ہے اور جاں نثار اختر نے زیادہ تر ایک گرہستن کا نقشا پیش کیا ہے۔ محشر نے ان کے مقابلے میں گاؤں کی ایک الھڑ اور کھلنڈری اور شوخ لڑکی کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ تاثرات انھوں نے اس زمانے میں فراہم کیے، جب وہ شہری زندگی سے دور، کھیتوں کی آبیاری اور دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ مصوّر اپنی تصویریں مُوقلم سے بناتا ہے، محشر نے یہ تصویریں نوکِ قلم سے تیار کی ہیں۔ انھوں نے ان منظومات کا نام "دیہات رس" رکھا تھا؛ لیکن ان کے بعض احباب اسے "گوری نامہ" کہتے ہیں۔ "دیہات رس" کے عنوان سے ان کے ایک دوسرے شاگرد اطہر عنایتی صاحب نے شائع کی ہیں۔ (رامپور: ۱۹۷۹ء) مہارتِ فن ان کے ایک ایک شعر سے عیاں ہے۔ یہ امرِ واقع ہے کہ سرزمینِ رامپور نے ان کے قد و قامت کے بہت کم شاعر و ادیب پیدا کیے ہیں۔ افسوس کہ ان کے استغنا اور لاابالیانہ پن نے انھیں وہ شہرت حاصل کرنے سے محروم رکھا، جس کے وہ جائز طور پر مستحق تھے۔ ذیل میں ان کے چند اشعار درج کر رہا ہوں:

دن اگر کوئی گزارے بھی تو کیا — پھر وہی شام ہمیشہ کی طرح
دل وہی شہرِ تمنّا بہ کنار — اور ناکام ہمیشہ کی طرح

حال کیا اپنا بتائے محشرؔ — وقفِ آلام ہمیشہ کی طرح

نام کیوں لیں کسی کے کوچے کا — اک جگہ جا رہے ہیں کام سے ہم

یہ بھی ہوا ہے بیٹھے بٹھائے کسی طرف — یوں چل دیا ہوں جیسے کوئی دے چلا مجھے
یہ بھی خیال ہے کہ زمانہ نہ کچھ کہے — پھر یہ بھی سوچتا ہوں زمانے سے کیا مجھے

اک گھن سا لگا ہوا ہے جی کو — جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے

آپ آئیں گے کسی روز، گماں ہے میرا — اور عالم وہ گماں کا کہ یقیں ہو جیسے

لوگ حیران، وہ چپ، میں دیوانہ — اور محبت ابھی بصیغۂ راز!

نہ ہو مٹا کے مجھے منفعل، نگاہ اٹھاؤ — میں اس نگاہ کے قربان، یہ تو ہونا تھا

یہ کیا بات، گزری ہوئی کل کی بات — اگر آج کہیے کہانی لگے
خدارا کھلے ان کو! عجب ہیں وہ لوگ — عداوت کریں، مہربانی لگے

ترا انتظار نہ کر سکوں، تو شبِ فراق بھی کچھ نہیں
کہ شبِ فراق کا لطف ہی، ترے انتظار کے ساتھ ہے

آپ کو دیکھتے رہنے سے سکوں ملتا ہے — آپ کو دیکھتے رہنا مگر امکاں میں نہیں

گزر تو سکتی ہیں راتیں جلا جلا کے چراغ
مگر یہ کیا کہ اندھیرے کو روشنی سمجھو

ہر احتیاطِ محبت کو سامنے رکھ کر
کسی نے قصہ سنا، ہیں نے واقعات کہے

اب "دیہات رس" کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

موسل ڈھلکے، ہر ایک چوڑی کھنکے
دانوں کو سمیٹنے میں پائل چھنکے
دھانوں کی کٹائی کا ترنم، توبہ!
جس طرح پکھاوج پہ مجیرا جھنکے

بازو تھرکیں، تو مونڈھے پھڑکیں لچکیں
شرماتوں کے ساتھ ساتھ باہیں پچکیں
جب سانجھ سویرے گائے دوہے گوری
صندل کی ہوا میں جیسے شاخیں لچکیں

گت باندھے ہوئے چھاج تھپکتی جائے
باہوں کی ہر ایک چوڑی کھنکتی جائے
کھڑتال کے ساتھ بج رہی ہے ڈھولک
گوری بیٹھے چنے پھٹکتی جائے

اک روز ملی، تو منھ چھپا کر بھاگی
اک روز ملی، تو منھ دکھا کر بھاگی
گوری کو میں نادان کہوں یا پگلی
اک روز ملی، تو منھ چڑا کر بھاگی

ڈر ڈر کے چلے، قدم بھی دھرتے چونکے
سن لے جو کسی کو بات کرتے، چونکے
چوری چھپے یوں گھاس اکھاڑے گوری
ہرنی جس طرح چرتے چرتے چونکے

جاگے تو قیامت سی جگاتی جائے
چکی پیسے تو گنگناتی جائے
بادل کی گرج میں جیسے دھیرے دھیرے
جوگی کوئی بانسری بجاتی جائے

صوفی بانکوٹی، محمد ابراہیم غلام محمود پرکار

خطۂ کوکن (دکن) کا "پرکار" خاندان اپنی شہرت کے باعث کسی تعارف کا محتاج نہیں؛ اس میں ہر میدان کے شہسوار گزرے ہیں۔ صوفی بانکوٹی بھی اسی خانوادے کے نام لیوا تھے۔ ان کے والد غلام محمود پرکار عربی فارسی کے جید عالم تھے، اور پیشے کے لحاظ سے طبیب۔ ان کی حذاقت کا دور دور شہرہ تھا۔ دادا مولوی غلام محی الدین پرکار (ف: ۱۸۹۷ء) ریاست جنجیرہ میں منصفِ اعلیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے تھے۔

صوفی ۲۷ مئی ۱۹۱۹ء کو بانکوٹ (ضلع رتنا گیری، مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دیر سے شروع ہوئی، اور وہ بدقسمتی سے وہ بھی مکمل نہ کرسکے۔ ابھی چوتھے درجہ ہی میں تھے کہ ۱۹۳۱ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے علاوہ چار بہن بھائی اور تھے۔ اُن کی دادی اماں کو اپنے میکے کی طرف سے ناریل کا ایک چھوٹا سا باغ ورثے میں ملا تھا۔ یہ بانکوٹ سے کوئی دو میل دور ایک گاؤں ویلاس نامی میں آج بھی موجود ہے (ضمناً ویلاس مشہور مجاہدِ آزادی نانا فرنویس کا وطن ہے)۔ اس کے علاوہ کاشتکاری بھی تھی۔ یہی دونوں چیزیں خاندان بھر کے لیے قوت لایموت کا وسیلہ بن گئیں۔

غرض تعلیم کا سلسلہ تو منقطع ہونا ہی تھا؛ ۱۲ برس کی عمر میں معاشی پریشانیوں نے بھی آگھیرا۔ خدا خدا کرکے کہیں ۱۹۴۱ء میں (بعمر ۲۲ سال) انھوں نے ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا، جب وہ تین بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ اس کے بعد پرائمری درجوں کو پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ ساری عمر مدرسی میں گزری اور دورانِ ملازمت ہی میں کچھ ہندی کے امتحان اور ۱۹۵۲ء میں تربیتی کورس بھی مکمل کرلیا۔ طویل ملازمت

ماخذ: بدیع الزمان خاور (پسر مرحوم)

کے بعد مئی ۱۹۷۷ء میں جوڑے سے سبکدوش ہونے والے تھے کہ اس سے پہلے قید حیات ہی سے نجات کا فرمان صادر ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

۱۹۳۷ء کے لگ بھگ بعض اصحاب نے بنکوٹ میں ایک ادبی انجمن "معیار الادب" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کے زیر اہتمام ادبی اور شعری اجتماع تو ہونا ہی چاہیے تھے، ان کے علاوہ بھی بیت بازی اور شعر خوانی کے ہنگامے رہتے۔ صوفی ان جلسوں میں دلچسپی لینے لگے۔ یہیں انھیں خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء سے انھوں نے باقاعدہ شعر گوئی شروع کر دی اور ابر احسنی گنوری (ف: نومبر ۱۹۷۳ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ جس زمانے میں ابر احسنی بسلسلۂ ملازمت رامپور میں مقیم تھے، انھوں نے وہاں اپنے استاد مولانا احسن مارہروی (ف: اگست ۱۹۴۰ء) کی یاد میں ایک ماہنامہ "احسن" نکالا تھا۔ صوفی بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ استاد کو ان کی قابلیت پر کس درجہ اعتماد تھا۔ کیونکہ ابر احسنی زبان و بیان اور فن کے معاملے میں نہ صرف سہل انگار نہیں تھے، بلکہ خاصے سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ صوفی کو بھی استاد سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ وہ احسن کی ترقی میں قلمے اور درمے ہر طرح کوشاں رہے۔

اپنی خاندانی روایت کے زیر اثر مرحوم کا شروع سے دین اور تصوف کی طرف رجحان رہا۔ صوفی تخلص اختیار کرنا بھی اسی میلان کے باعث تھا۔ وہ حضرت سید خاکسار علی شاہ قادری خاک کلیانوی (ف: ۲۰ جنوری ۱۹۵۸ء) کے مرید تھے اور سرزمین کوکن کے مشہور بزرگ سید حسام الدین قادری (کردہ شریف) کے معتقد خاص۔ سید حسام الدین صاحب اردو اور عربی میں شعر کہتے اور حسامی غوثوی تخلص کرتے ہیں۔ انھیں نسبتوں کا نتیجہ تھا کہ صوفی نے حمد و نعت اور منقبت میں بھی وافر کلام کہا ہے۔ لیکن طبیعت کے استغنا کے باعث کبھی اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کی۔ مشاعروں میں بھی بہت کم شرکت کرتے تھے۔ رسائل و جرائد میں شاذ و نادر ہی ان کا کلام دیکھنے کو ملتا تھا۔

ان کی غزل کلاسیکی انداز کی ہے۔ کلام کا مجموعہ "بادۂ صافی" کے نام سے ان کی وفات کے بعد

ان کے صاحبزادے بدیع الزماں خاور صاحب نے شایع کیا ہے۔ (۱۹۷۹ء)۔
صوفی کی شادی ۱۹۳۵ء میں شیخ عبداللہ برکار کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی۔ شیخ عبداللہ بلحاظ پیشہ جہاز پر خلاصی تھے۔ بدقسمتی سے صوفی کی رفیقۂ حیات نے ۱۹۵۲ء میں داغ مفارقت دیا۔ حال آنکہ اس وقت عمر صرف ۳۳ برس کی تھی اور ماشاء اللہ صحت بہت اچھی تھی، انھوں نے محض اولاد کی خاطر نکاح ثانی سے اجتناب کیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑے۔ یہ اکلوتے بیٹے اردو کے نوجوان اور خوشگو شاعر بدیع الزماں خاور ہیں (ولادت: ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء)
صحت بظاہر ٹھیک تھی۔ یکایک ۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ اس سے پہلے بھی غالباً ایک دورہ پڑا تھا، جو بہت ہلکا تھا اور ان کی تسلی بخش تندرستی کے پیش نظر اس کا پتا ہی نہیں چلا۔ اب کے انھیں بمبئی کے نائر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن علاج معالجے سے حالت بہتر نہ ہوئی اور بیچ اسی میں وہ ۱۱ اکتوبر (۱۹۷۶ء) پیر کے دن جاں بحق ہو گئے۔ لاش ان کے وطن بانکو گئی، جہاں اگلے دن منگل (۱۲ اکتوبر) کو انھیں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے استاد بھائی صغیر احسنی نے "تاریخ وفات کہی:

روز و شب رہتا ہے مصروف عمل دست قضا
بچ نہیں سکتا ہے کوئی دستبرد موت سے

کیا شگفتہ دل کا ساماں بزم ہستی میں رہا
رفتہ رفتہ جا رہے ہیں دوستداران کہن

دور تھے لیکن تھا دونوں کے دلوں میں ربط
چل دیا صوفی بھی اٹھ کر، ہم تڑپتے رہ گئے

مرنے والے! دے تجھے آسودگی رب علا
ہم تو پی کر اشک غم کر لینگے صبر و ضبط بھی

سال رحلت از لب احباب نکلا یہ صغیر!
"آہ، صوفی بھی ہمیں اب رنج فرقت دے گیا"

(۱ + ۱۳۹۵ = ۱۳۹۶)

مطبوعہ دیوان سے یہ چند شعر انتخاب کیے گئے ہیں:

مجھے تسلیم، میری شاعری کچھ بھی نہیں صوفی!
جناب آبر کا شاگرد ہوں، یہ فخر کیا کم ہے!

ابھی تو کرنا ہیں طے مرحلے محبت کے — ابھی سے کیوں یہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ بزمِ حسن ہے انداز ہیں جدا اس کے — یہاں تو دل ہی پئے نذر لائے جاتے ہیں

پیامِ دوست شاید آ رہا ہے — مرے سینے میں دل گھبرا رہا ہے
محبت میں نہ پوچھو حال دل کا — شگفتہ پھول تھا مرجھا رہا ہے
کوئی ہے محو خود آرائیوں میں — کسی کا دم لبوں پر آ رہا ہے

پریشانی نہ تھی کم یوں بھی پابندِ وفا ہو کر — مصیبت میں اضافہ ہو گیا تم سے جدا ہو کر
یہاں سے میں نہ آنے کا ارادہ کر کے اٹھا تھا — مگر آیا اسی محفل میں مجبورِ وفا ہو کر

کیوں بہ رہے ہیں اشکِ محبت نہ پوچھیے — ہے میرے دل پہ کس کی عنایت نہ پوچھیے
پہلو میں دل تھا آپ بھی دل کے قریب تھے — کیسی گزر رہی تھی یہ صحبت نہ پوچھیے

گلا ہے مجھ کو پائے ناتواں سے — رہا جاتا ہوں پیچھے کارواں سے
زمانے بھر میں رسوا ہو گئے ہم — یہی حاصل ہوا عشقِ بتاں سے

حسن کے فتنوں سے ہے محشر بپا — عشق ناحق موردِ الزام ہے

لبریز ہو گا ایک دن پیمانہ زندگی کا — اس راز کو نہ سمجھا دیوانہ زندگی کا
پرسانِ حال ہی جب کوئی نہیں جہاں میں — جا کر کسے سنائیں افسانہ زندگی کا

پھولوں کی طرح چاک گریباں ہوں آج کل — بربادئ چمن سے پریشاں ہوں آج کل
بیگانہ وار تکتے ہیں دیوار و در مجھے — خود اپنے ہی مکان میں مہماں ہوں آج کل

وہ وقت تھا کہ میں بھی گلستاں کا پھول تھا
یہ وقت ہے کہ خارِ گلستاں ہوں آج کل

منزلِ عشق سخت ہے، پاؤں میں آبلے بھی ہیں
ایسے میں آ کے ہاتھ تھام، دُور سے بیکسی نہ دیکھ

گل کھلائے ہیں تلوّن نے تمہارے کیا کیا
کوئی نازاں ہے مقدّر پہ، تو نالاں کوئی
اس کی مرضی ہے، جسے چاہے بنائے اپنا
مذہبِ عشق میں کافر نہ مسلماں کوئی

بہت بھول جانے کی کرتا ہوں کوشش، مگر یاد اُن کی چلی آ رہی ہے
گزرتی ہیں تاروں کو گن گن کے راتیں، محبّت قیامت بنی جا رہی ہے
بھنور ہی بھنور ہے نگاہوں کی حد تک، نہیں کوئی ساحل جدھر دیکھتا ہوں
مخالف ہوائیں، جوانی پہ طوفاں، تھپیڑوں میں کشتی بہی جا رہی ہے

مخصوص جبیں کے لیے، مخصوص ہے اک در
ہر در پہ جھکے جا کے، یہ توہینِ جبیں ہے

نقشِ پائے دوست ہیں پیشِ نظر
ہر قدم پر بندگی ہے آج کل

شروعِ عشق میں یہ درد، یہ الم، صوفی!
خدا ہی جانے کہ انجامِ عاشقی کیا ہے

بہت کوشش کی دل نے، رازہائے غم چھپانے کی
مگر کہہ دی نگاہِ یاس نے سب داستاں میری

ذکی دامودر ٹھاکور

آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں ایک قصبہ کوڑنگل ہے؛ آزادی سے پہلے یہ ضلع گلبرگہ میں تھا۔ یہیں دامودر ذکی ٹھاکور ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ضلع تزناگری کے موضع پٹریل کا رہنے والا تھا، اور یہ لوگ موروثی دیش مکھ تھے۔ جب دیش مکھی ختم ہوگئی، تو ذکی مرحوم کے والد شیو رام پنت اور چچا باجی راؤ تلاش معاش میں پٹریل سے نکلے۔ مختلف ریاستوں میں قسمت آزمائی کی، لیکن کہیں پاؤں نہ جم سکے۔ سب سے آخر میں وہ حیدرآباد پہنچے بارے یہاں نصیبے نے یاوری کی، اور دونوں محکمۂ مال میں گرداور مقرر ہوگئے۔ شیو رام پنت کا چنچونی میں تقرر ہوا اور باجی راؤ کا کوڑنگل میں۔ چنچولی کی آب و ہوا خاندان کو راس نہ آئی اور شیو رام نے بیوی اور بیٹے کو بھائی کے پاس کوڑنگل بھیج دیا۔

ذکی دامودر صرف ۵ برس کے تھے کہ ۱۹۰۸ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ لازماً خاندان کی کفالت کی ذمہ داری باجی راؤ کو اٹھانا پڑی۔ ذکی دامودر کی تعلیم و تربیت بھی انھیں کی نگرانی میں ہوئی۔

گھر کے حالات اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مانع تھے۔ لیکن اس سے وہ بددل نہیں ہوئے۔ کوڑنگل جغرافیائی اور تاریخی، دونوں پہلوؤں سے کئی تہذیبوں اور زبانوں کا سنگم رہا ہے۔ مرہٹواڑہ اور تلنگانہ اور کرناٹک تینوں تین دھارے اس پر اثر انداز رہے ہیں۔ ذکی نے ان کا اثر قبول کیا۔ گھر کی زبان مرہٹی تھی۔ تلگو پورے علاقے پر چھائی

ماخذ: انجمن (حسن الدین احمد)؛ دیباچہ ارج، مجموعۂ کلام ذکی؛ محمد عبدالرزاق قمر، ایڈوکیٹ، کوڑنگل

ہوئی تھی۔ کنڑ ہمسایہ علاقے کی زبان تھی۔ انھوں نے بینوں میں تربیت پائی اور ان پر پوری قدرت حاصل کی۔ تعلیم اردو اسکول میں ہوئی۔ جب ملازمت میں شامل ہوئے تو استاد کے مشورے سے لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ان سب تہذیبی اور لسانی دھاروں نے جو رواداری ذکی کی زندگی میں پیدا کی، وہ ان کے کلام کے ایک ایک مصرعے سے ظاہر ہے۔

تعلیم کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور پوری زندگی اسی میں بسر کر دی۔ مدرسی کے پیشے کی ہمارے ہاں جو قدر ہے اور یہ طبقہ جس حد تک مفلوک الحال ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ذکی غریب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مشاہرہ قلیل اور کنبۂ کثیر۔ تعلیم بھی زیادہ نہیں تھی، اس لیے اپنے پیشے میں کوئی خاص ترقی بھی نہ کر سکے۔ غرض عمر بھر عسرت میں کٹ گئی۔

ابھی اسکول کے پانچویں درجے میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ مولوی اسمٰعیل شریف ازل اس زمانے میں اس طرح کے متبدیوں کا ملجا و ماوا تھے؛ یہ بھی ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ازل عروض کے ماہر تھے۔ ذکی نے عروض کی تعلیم انھیں سے پائی۔ اس کے بعد جب حبیب اللہ وفا (نبیرۂ حبیب اللہ ذکا تلمیذ غالب) اپنی ملازمت کے سلسلے میں کوڑنگل آئے، تو ذکی بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ وفا کو فن شعر میں جو مہارت حاصل تھی، وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ذکی نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ ذکی نے انھیں کے مشورے سے لاہور سے منشی فاضل کا امتحان دیا، اور اس میں کامیاب ہوئے۔ وہ استاد کے عاشق تھے۔ وفا کا کوڑنگل میں تقریباً دو برس قیام رہا۔ ذکی نے پوری مدت کھانا اپنے ہاتھ سے پکا کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے بعد ذکی کا کوہیر تبادلہ ہو گیا۔ اس زمانے میں وفا بیدر میں تعینات تھے۔ دونوں جگہوں میں ۳۵ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ذکی ہر جمعرات کو بائیسکل پر بیدر جاتے اور اگلا دن استاد کی خدمت میں گزارتے۔ ان کا یہ معمول ۱۴ سال تک رہا۔

ان کے کلام کے دو مختصر مجموعے ان کی زندگی میں چھپے: (۱) سفینۂ ذکی (اسے مئی ۱۹۶۶ء

ہیں" بزمِ سفینۂ ذکی" نے شائع کیا اور اس موقع پر ایک کیسٹہ زر بھی ذکی کی خدمت میں پیش کیا) ۔ (۲) ارج (حیدرآباد جنوری ۱۹۷۱ء) ۔ ذکی نے غزل، رُباعی، قطعہ سب میں دادِ سخن دی ہے ۔ لیکن آپ کے دو میدان خاص ہیں ۔ نعت اور تاریخ ۔ یہ حقیقت ہے کہ غیر مسلم نعت نگاروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ ان کی نعتوں میں خلوص، احترام اور عقیدت ایک ایک مصرعے سے عیاں ہے ۔ اپنے استاد وفا کی طرح تاریخ گوئی میں بھی خاص مہارت تھی ۔ تعمیہ و تخرجہ کے بغیر ایسی برجستہ تاریخ کہتے ہیں کہ بایدو شاید ۔ آندھرا پردیش اُردو اکاڈیمی اور بہار اُردو اکاڈیمی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انعامات دیے تھے ۔

۷۳ سال کی عمر میں پیر ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اپنے وطن کوڑنگل میں انتقال ہوا ۔

ذکی دامودر کی شادی شنکر راؤ کی بیٹی وملا بائی سے ہوئی تھی ۔ شنکر راؤ جلسند (تعلقہ ہمناباد ضلع گلبرگہ، کرناٹک) کے رہنے والے اور پیشہ کے لحاظ سے پٹواری تھے ۔ اولاد میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا اپندر ٹھاکور ہوئے ۔ وملا بائی کو محکمۂ تعلیم کی طرف سے سو روپیہ وظیفہ ملتا ہے ۔

نمونے کے لیے کچھ منتخب اشعار پیش ہیں :

مجھ کو دیکھا، تو وہ بیساختہ ہنس کر بولے
غم تو ہر ایک کو ہوتا ہے، پر اتنا بھی نہیں

یہ اور بات ہے، ہنستے گزار دی ہم نے
وگرنہ کب ستمِ روزگار ہو نہ سکا

پھولوں کا تھا فریب کہ سج مج چُنے تھے پھول
حیراں ہوں اپنا دامنِ پُر خار دیکھ کر

انداز گفتگو وہ کہ اقرار کی قسم
امید جی اٹھی ترا انکار دیکھ کر

عشق ہی جلوہ ہے، گر حد سے گزر کر ہو بلند
منظرِ جلوہ، یہ سر، سجدہ، جبیں کوئی نہیں

شکر ہی ہو سکا تو، کر اے ذکی!
شکوۂ جورِ روزگار نہ کر!

تلخیاں گھر کی رہیں گھر میں، سکوں کچھ تو ملا
شکر ہے، گھر سے تو اچھی ہے بیاباں کی روش

یا دیکھیے سحر مری، یا شام دیکھیے
بیچارگیِ حسرتِ ناکام دیکھیے

میں سب کی نگاہوں میں بیگانہ سہی، لیکن
میرے لیے ان سب میں کوئی بھی نہیں بیگانہ
دوزخ جسے کہتے ہیں، محشر جسے کہتے ہیں
اک دن کی کہانی ہے، اک رات کا افسانہ

ذلیل ہو کے ملیں نعمتیں، تو کیا حاصل
وہی بہت ہے، جو کچھ آبرو سے ملتا ہے

موت کی عمر لمحہ بھر، زندگی ہے تمام عمر
مرنے کی فکر چھوڑیے، جینا یہاں محال ہے

حسن اور دل میں ہے کچھ راز، خدا خیر کرے!
ہے نظر بیچ میں غمّاز، خدا خیر کرے!

یہ زندگی اک بھیس سہی، راس کیسے ہے
جیتا ہوں، مگر جینے کا احساس کیسے ہے
صرف ایک نظر کے لیے، ہم بزم میں ان کی
آنے کو تو آئے ہیں، مگر آس کیسے ہے
غمِ دل کو، دکھ ارماں کو، الم چارہ گروں کو
کہتے ہیں جسے سکھ، وہ مرے پاس کیسے ہے

نم آئے نہ تھے غم تھا، نم آئے، نہ تھی مسرت
آنسو مری آنکھوں سے بہر حال ہیں برسے
اب کے تو جنوں مائلِ تعمیر ہے شاید
صحرا ابھی نظر آنے لگے ہیں مجھے گھر سے

یوں جینے کو کہتے ہیں، ذکی! زندگی شاید
ہم ایسے جیے، جیسے کوئی جینے کو ترسے

میں بھی ہوں کائنات میں تیری　　گر نہیں میرا کوئی، تُو تو ہے

کانٹوں کی ایک دنیا پہلو میں اپنے لے کر　　سیکھا ہے مسکرانا، ہم نے کلی کلی سے

مقصودِ غم سے شکوۂ اہلِ جفا نہیں　　ہر اشک بے بسی کے خلاف احتجاج ہے

ہم کو کبھی نہ تھا، اپنی تہی دامنی کا غم　　لیکن ہے آج فکر کہ دامان کیا ہوا!

مالک ہے تُو، کیوں اپنے کو ناچار کہوں!　　آوارہ کہوں کس لیے، کیوں خوار کہوں!
سچ ہے کہ گنہگار ہوں، بندہ بھی تو ہوں　　کیونکر ترے بندے کو گنہگار کہوں!

اختر لکھنوی، مرزا سجّاد علی خان

لکھنؤ کے شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی والدہ افضل بیگم، نواب بہو بیگم کے خاندان سے تھیں۔ جیسا کہ معلوم ہے: بہو بیگم، نواب وزیر شجاع الدولہ کی بیوی اور نواب وزیر آصف الدولہ کی والدہ تھیں۔ اختر کے والد نواب سالار جنگ کی نسل سے تھے؛ اور دادی نواب شجاع الدولہ کے خاندان سے۔ چنانچہ ان تینوں کے ترکے سے اختر کے خاندان کے افراد کو وثیقہ ملتا تھا۔

اختر کے والد نواب مرزا مہدی وثیقہ دار ہونے کے علاوہ ٹھیکیدار بھی تھے۔ جنگلوں کے بڑے ٹھیکے سے لے کر چھوٹے موٹے کاموں تک کا ٹھیکہ لے لیتے تھے، مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر روشنی اور کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کے لیے۔ اس سے اچھے خرچ کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

نواب مرزا مہدی کے پانچ بچے تھے: (۱) حسن عسکری عرف نواب؛ (۲) سجّاد علی خان عرف بالو صاحب؛ (۳) زینب بیگم؛ (۴) راضیہ بیگم؛ (۵) جعفر علی خان عرف ننھن صاحب۔

سجّاد علی خان مرحوم ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دسویں تک تعلیم حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ انٹر اور بی اے اور بی ٹی کے تمام امتحان یہیں سے پاس کیے۔

اس کے بعد انھوں نے تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے بہت جگہ کام کیا، لیکن کہیں بھی مستقل صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بلکہ اس دوران میں اپنے بہنوئی سید شبیر حسن قتیل (ف: جولائی ۱۹۴۶ء) کے ساتھ مل کر دو ڈرامے "خونی سردار" اور "اودھ کا کنھیا" بھی لکھے۔ انھیں

مآخذ: زینب بیگم (ہمشیر اختر مرحوم)؛ عباس ظہیر، نئی د

اسٹیج کرنے کے لیے دونوں کلکتے پہنچے۔ ایک چھوٹی سی تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ لیکن کمپنی چل نہ سکی اور بہت زیر باری ہوئی۔ اس پر دونوں واپس لکھنؤ آگئے اور دونوں کھیل یہاں گولہ گنج کی ایک کمپنی نے اسٹیج کیے۔

انھیں تعلیمی امور سے بہت دلچسپی تھی، اور اس میں بھی چھوٹے بچوں کی تعلیم۔ جغرافیہ ان کا خاص مضمون تھا۔ اس موضوع پر ان کی کچھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ غرض اب انھوں نے ریاست کشمیر کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت کر لی۔ وہاں کوئی دو تین سال کام کیا تھا۔

سجّاد علی خان مرحوم کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ ہارمونیم اور طبلہ خاص طور پر بہت اچھا بجاتے تھے؛ کلاسیکی فن موسیقی میں بھی استادانہ مہارت حاصل تھی۔ ان کی ملاقات نواب رضا علی خان مرحوم والیِ رامپور سے ہوئی، جو خود بھی اس فن میں ماہرانہ درک رکھتے تھے۔ انھوں نے سجّاد علی خان کو رامپور آنے کی دعوت دی۔ سجّاد علی خان نے نواب صاحب کو اس پر راضی کر لیا کہ رامپور میں بچّوں کے لیے کنڈرگارٹن درجے کا مونٹسری اسکول قائم کیا جائے، چنانچہ نواب صاحب نے اپنا انگوری باغ والا محل اس کے لیے خالی کر دیا، جہاں یہ اسکول ۱۹۴۳ء میں قائم ہوا۔ بعد کو (غالباً ۱۹۴۸ء میں) اسکول منجھلی بھون کی عمارت میں چلا گیا۔ یہ اسکول اب بھی بحسن وخوبی چل رہا ہے۔ سجّاد علیخان ۱۹۷۰ء تک اس اسکول کے پرنسپل رہے، اور اس کے بعد سبکدوش ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی والدہ کے اصرار پر کلکتے کی ایک خاتون سے ہوئی۔ لیکن یہ سنجوگ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد دوسری شادی اپنی مرضی کی لکھنؤ کے ایک ہندو صرّاف کی صاحبزادی سے کی؛ اسے انھوں نے کنیز عباس کا نام دیا تھا۔ انھیں اس بیگم سے عشق تھا۔ ۱۹۴۴ء میں اس کی دائمی مفارقت کے

بعد غریب کا دل دنیا سے اُچاٹ ہوگیا۔ مثلاً وہ انگریزی لباس کے بہت شوقین تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد انھوں نے کوٹ، پتلون کا استعمال یکسر ترک کر دیا۔ اسی طرح موسیقی جو گویا ان کی روح کی غذا تھی، بالکل چھوٹ گئی۔ رہی سہی کسر ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ان کی دو بیٹیوں، اور ایک داماد کی ناگہانی موت نے پوری کر دی۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے بہت حوصلے اور ضبط سے کام لیا اور اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ اتوار ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دل کا شدید دورہ پڑا اور اسی دن شب کے ساڑھے نو بجے کے درمیان روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنازہ اگلی صبح (پیر، ۲۵ اکتوبر) اٹھا اور ۱۱ بجے انھیں مبادۂ غفران مآب میں اپنے والد کی قبر میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اولاد میں دو بیٹے (صادق علی خان عرف چھوٹے جانی اور سعید سیّدین، عرف پیارے) اور دو بیٹیاں (سلمہ بانو عرف ذکو اور رئیس بانو) ان سے یادگار ہیں۔

اختر نے شعر گوئی ہائی اسکول کے زمانے میں شروع کی۔ اس میں مشورہ سید شبیر حسن قتیل سے رہا۔ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ زمانہ ہوا چھپا تھا۔ ایک نثری کتاب (دورِ اوّل کا اودھ پنچ) ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ کلام نظم و نثر کی پختگی، واقفیتِ فن اور مہارت پر دال ہے۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں؛ یہ ان کے صاحبزادے سعید سیّدین نے مہیّا کیے ہیں۔

تری گردشِ عبث، اے آسماں، ہے — محبت ماورائے امتحاں ہے
اسی امید پر دن کٹ رہے ہیں — قفس سے دو قدم پر آشیاں ہے
سناؤں گا، تو سنتے ہی رہو گے — مرا قصہ، تمھاری داستاں ہے
تلاشِ منزلِ الفت میں، اکثر — جبیں میری ہے، ان کا آستاں ہے

ہوائیں شدت سے چل رہی ہیں، مگر ہوائیں بھی آتشیں ہیں
جو روحِ ہستی کو تازگی دے، چمن میں ایسی ہوا نہیں ہے

حصولِ مقصد کی جستجو میں، اسیرِ منزل رواں دواں ہیں
کہاں ہے منزل، کدھر ہیں راہیں، خود ان کو اختر! پتا نہیں ہے

در مدحِ حضرتِ علی

غلط نگاہی کا رُخ بدل دے، نظر کو جلووں کی تاب دے دے
مجھے تو اے آرزوئے منزل! غلامیٔ بوتراب دے دے
اسی سے دل کی لگن لگی ہے، جو بے کہے دل کی بات سمجھے
اسی کو کیسے نہ میں پکاروں، جو بے پکارے جواب دے دے

بھلا ہمیں اور غمِ دل سے کنارا کرنے والوں ہیں!
جو طوفانوں سے ڈرتے ہیں، وہ اکثر ڈوب جاتے ہیں
محبت کا بجا انجام، مرگِ ناگہانی ہے
مسافر چین سے سوتے ہیں، جب منزل پہ آتے ہیں
یہ کس منزل پہ لے آئی، کسی کی جستجو یارب!
جہاں دل بھی دھڑکتا ہے، قدم بھی ڈگمگاتے ہیں
کرم کے اہل ہیں جو، اس جہانِ درد میں اختر!
انھیں کو لوگ از راہِ کرم، محروم پاتے ہیں

قطعہ

تیز کر دی میرے شل پیروں نے رفتارِ عمل
جب کبھی دل میں خیالِ دوریٔ منزل ہوا
رات بھر تو حادثاتِ عشق میں اُلجھا رہا
مر کے پروانہ سحر کو زینتِ محفل ہوا

آغا حیدر حسن مرزا دہلوی

آغا حیدر حسن مرزا کی ایک ذات میں ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے کئی دھارے مل گئے تھے:٭

(۱) ان کے پر دادا مرزا احمد شکوہ کی دو بیویاں تھیں: ایک کنز رو خاندان کی کشمیری برہمن خاتون اور دوسری، ایک ایرانی بیگم۔ ایرانی بیگم کے بطن سے صرف ایک بیٹی ہوئی جس کا نام پیاری بیگم تھا۔ کشمیری خاتون کے بطن سے مرزا حسن جان پیدا ہوئے، جنھیں مرزا حسن الدین بھی کہتے تھے (عرف مرزا حسنو)۔ انھیں ان کی سوتیلی والدہ یعنی ایرانی بیگم نے پالا، جن کے اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ وہ انھیں آغا حسن کہہ کر پکارتی تھیں۔ یوں وہ اس خاندان کے پہلے آغا تھے؛ ان کے بعد آغا گویا خاندان کے نام کا جزو ہوگیا۔ یہی آغا حسن جان، ہمارے آغا حیدر حسن مرزا کے دادا تھے ان کا ۱۸۷۸ء میں انتقال ہوا۔

(۲) آغا حیدر حسن کے والد آغا صفدر حسن مرزا کی شادی ہمارے مشہور شاعر حافظ جیو احسان (ف: ۱۲۶۷ھ) کی پرپوتی سے ہوئی تھی۔ احسان کے دو بیٹے تھے: سیف الرحمٰن خان المخاطب بہ موسیٰ خان اور عبدالکریم خان المخاطب بہ عیسیٰ خان۔ سیف الرحمٰن خان موسیٰ خان کی شادی مریم زمانی بیگم (بنت ذوالفقار خان) سے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے احمد حسن خان کا نکاح افضل زمانی بیگم سے ہوا؛ یہ نواب شرف الدولہ خان کی چھوٹی صاحبزادی تھیں؛ ان سے بڑی بہن ملکہ زمانی بیگم، ملکۂ دوران زینت محل بیگم تھیں،

٭ یہ حالات میری یادداشتوں پر مبنی ہیں، جو میں نے مرحوم سے مختلف ملاقاتوں کے بعد قلمبند کر لی تھیں

جن سے بہادر شاہ ظفر نے اپنے بڑھاپے میں شادی کی تھی اور جن کے بیٹے جوان بخت کی شادی پر غالب اور ذوق نے سہرے کہے تھے۔ انھیں احمد حسن خان اور افضل زمانی بیگم کی صاحبزادی حُسن زمانی بیگم تھیں؛ جو آغا صفدر حسن مرزا کے عقدِ نکاح میں آئیں اور جو آغا حیدر حسن مرزا کی والدہ تھیں۔ آغا صفدر حسن مرزا کا ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔

(۳) آغا صفدر حسن مرزا کی ایک ہمشیر تھیں؛ انجم زمانی بیگم۔ یہ نواب محمد مصطفٰے خان شیفتہ (ف: ۱۸۶۹ء) کے سب سے بڑے بیٹے نواب محمد علی خاں رشکی (ف: مئی ۱۸۹۹ء) سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی، تو انھوں نے اپنے بھتیجے آغا حیدر حسن کو بیٹا بنا لیا اور یوں ان کی ابتدائی تربیت انھیں کے وہاں ہوئی۔ آغا حیدر حسن مرزا جمعہ ۱۲ محرم ۱۳۱۰ھ (۵ اگست ۱۸۹۲ء) کو اپنے خاندانی مکان سرکی والان (لال کنواں) میں پیدا ہوئے۔ یہ حویلی احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان کی ملکیت رہی تھی اور بعد کو آغا حیدر حسن مرزا کے دادا نواب موسیٰ خان کے قبضے میں آگئی تھی۔

آغا حیدر حسن مرزا کی تعلیم گھر پر شروع ہوئی۔ چونکہ اس زمانے میں یہ نواب شیفتہ کے گھر میں رہتے تھے؛ ان کی پہلی معلّمہ نواب ولی داد خان والی مالاگڑھ (نزد بلند شہر) کی صاحبزادی مقرر ہوئیں۔ جب دلّی آئے، تو لال قلعے کی دو شہزادیاں انھیں پڑھانے لگیں: مرزا فخرو (ف: جولائی ۱۸۵۶ء) کی بیٹی قویشہ سلطان بیگم اور دوسری بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی کلثوم زمانی بیگم۔ کلثوم زمانی بیگم پر غالباً ۱۸۵۷ء کی افتاد کے باعث، مذہب اور تصوّف کا بہت زیادہ غلبہ تھا؛ گیروے کپڑے پہنتیں، گلے میں تسبیح اور ہاتھ میں سُمرن رہتی۔ آغا نے ان سب سے فارسی، اردو اور بغدادی قاعدے کے علاوہ ناظرہ قرآن کے اسباق لیے۔ اس کے بعد انھوں نے اینگلو عربک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں تیسرے درجے تک تعلیم پائی۔ پھر غازی الدین فیروز جنگ کے مدرسے (بیرون اجمیری دروازہ) میں چوتھے درجے میں داخل ہو گئے۔ اس مدرسے میں

ف بعض اصحاب نے ان کی تاریخ ولادت کچھ اور لکھی ہے، لیکن یہ وہ تاریخ ہے، جو مرحوم نے خود مجھے بتائی تھی۔

وہ ۱۹۴۰ء تک دس برس رہے؛ اگلے پانچ برس ایم' اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی (۱۹۱۴ - ۱۹۱۹ء)۔ یہاں ان کے مضامین میں فارسی اور انگریزی کے علاوہ قدیم تاریخ (روم و یونان و ہندستان) تھی۔
علی گڑھ میں ان کے ہمعصروں میں بڑے بڑے نام ہیں: رشید احمد صدیقی، اقبال احمد خان سہیل، ذاکر صاحب، صاحبزادہ خورشید احمد خان، ڈاکٹر سلیم الزمان (چودھری خلیق الزماں کے بھائی) وغیرہ۔
۱۹۱۹ء میں گاندھی جی علی گڑھ آئے۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ آغا حیدر حسن نے انگریز کے خلاف ایک مضمون لکھا، جو علی گڑھ میگزین میں چھپا۔ اس پر پرچہ ضبط ہو گیا اور خود انھیں راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ یہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے
حیدر آباد میں چند ماہ انتظار کے بعد ۱۹۲۰ء میں محکمۂ پولیس میں مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) مقرر ہو گئے۔ پھر وردی خانہ کے انچارج بنا دیے گئے۔ اس شعبے کے ذمّے ریاست بھر کے سپاہیوں کی وردیاں مہیا کرنا تھا۔ اس زمانے میں اس عہدے کا مشاہرہ ۲۰۰ روپے حالی تھا۔
اب عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ سر اکبر حیدری اُس کے کرتا دھرتا تھے۔ دینی امور (خلیہ) کے بھی سکتر تھے، جس کے ذمّے تعلیمی امور کی دیکھ بھال تھی۔ آغا حیدر حسن کی ان سے علیک سلیک تھی۔ جب انھوں نے سر اکبر سے یونیورسٹی میں ملازمت کی درخواست کی تو انھوں نے کہا کہ آپ ابھی پولیس کے محکمے میں کام کرتے رہیے، جب موقع ملیگا، آپ کو یونیورسٹی میں بلا لینگے؛ اور اردو کی جگہ پر وحید الدین سلیم پانی پتی (ف جولائی ۱۹۲۸ء) کا تقرر ہو گیا۔ اسی زمانے یعنی ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ سے آغا حیدر حسن مرزا کا مجموعۂ مضامین "پس پردہ" شائع ہوا۔
۱۹۲۳ء میں سر اکبر نے انھیں جاگیردار کالج میں اردو پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ تین سال بعد (۱۹۲۶ء) اسی عہدے پر نظام کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ یہیں سے وہ ۲۸ سال بعد ۱۹۵۴ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔
ان کے دل میں لکھنے پڑھنے کا شوق علی گڑھ کے قیام کے دوران میں پیدا ہوا۔ اپنی تعلیم

کے ابتدائی دور میں انھیں قلعے کی مخدرات کی صحبت میسر آئی، بلکہ ان کی تعلیم ہی ان کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ اس سے انھیں بیگماتی زبان اور اس کے محاورے اور روزمرے پر پوری قدرت حاصل ہو گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ جب وہ بیگماتی زبان میں گفتگو کرتے تھے، ان کا لب و لہجہ بھی بالکل زنانہ ہو جاتا تھا۔ وہ آواز کے اسی اُتار چڑھاؤ سے بات کرتے، جو عورتوں سے مخصوص ہے۔ یہ اسی ابتدائی تربیت کا ثمرہ تھا۔

علی گڑھ کے زمانۂ تعلیم میں اپنی اس خصوصیت کے باعث انھوں نے خاص شہرت حاصل کی۔ ان کے دوست انھیں "آپا حیدر" کے نام سے پکارتے تھے۔ سہیل نے خاص طور پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ان سے فرمائشیں کر کر کے عورتوں کی زبان میں لکھواتے رہتے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو (ف: ۲ مارچ ۱۹۴۹ء) علی گڑھ آئیں، تو آغا حیدر نے سہیل کے کہنے پر ان کے بارے میں مضمون لکھا، جو بعد کو علی گڑھ منتھلی میں شائع ہوا۔ "پسِ پردہ"، اسی منتھلی کے بیشتر مضامین کا مجموعہ ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان کے تمام مضامین جمع کر کے شائع کر دے! انھوں نے جان صاحب کا ریختی دیوان بھی شائع کیا تھا۔

جب یہ حیدر آباد پہنچے، تو وہاں دکنی زبان کا شوق پیدا ہوا۔ ایک دن مہاراجا کشن پرشاد شاد مرحوم (ف: ۱۹۴۰ء) کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک ملّا ے افغانی تشریف لائے۔ مہاراجا نے ان سے کچھ سلوک کیا اور وہ رخصت ہو گئے۔ ان صاحب کے پاس منطق الطیر (عطار) کا دکنی ترجمہ "پنچھی باچھا" تھا۔ آغا حیدر حسن مرزا نے یہ کتاب ان سے چار روپے میں خرید لی۔ اسے پڑھا، تو زبان کی پنجابی سے مماثلت دیکھی۔ اس سے کتاب کی فرہنگ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اب تو گویا ان کے منھ کو خون لگ گیا۔ جمعرات کی پینٹھ کا چکر ان کا معمول بن گیا۔ ہر ہفتے کباڑیوں سے کتابیں خرید کر لاتے، انھیں پڑھتے؛ ان کے خلاصے اور الفاظ کا مجموعہ تیار کرتے۔ ان کا مکان (حیدر منزل) بلا مبالغہ ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہے۔ پرانے قلمی نسخے، وصلیاں، تصویریں، تاریخی ملبوسات۔ غرض عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ اسے کسی مستقل میوزیم

کا حصہ بنا دینا چاہیے۔

حیدرآباد میں وہ مدتوں ریڈیو سے تقریریں کرتے رہے۔ کھانے پینے کے محاورے، شادی بیاہ کے محاورے، حیدرآباد کے میلے ٹھیلے، تقریروں کے یہ سلسلے بہت مقبول ہوئے تھے۔ اگر یہ سب تقریریں بھی جمع کر دی جائیں، تو ان میں ایک ایک کتاب کا مواد ہے۔

ان کی شادی ۱۹۲۱ء میں بدر النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ بمبئی کے پہلے ہندستانی پولیس کمشنر خان بہادر سردار میر عبد العلی تھے۔ ان کے صاحبزادے سردار میر عون علی ولایت گئے اور بیرسٹر بن کر وطن واپس آئے۔ ان کی شادی نواب محسن الملک (ف: اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے چھوٹے بھائی امیر حسن کی صاحبزادی مرتضائی بیگم سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہی امیر حسن علی گڑھ کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن (ف: مئی ۱۹۶۳ء) اور حافظ حسن (جعفر حسن) (ف: جون ۱۹۷۳ء) کے والد تھے اور مرتضائی بیگم ان دونوں کی سوتیلی بہن تھیں۔ ان بیچاری کی موت دردناک حالات میں جل کر مرنے سے ہوئی تھی۔

خیر، بدر النسا بیگم انھیں سردار میر عون علی اور مرتضائی بیگم کی صاحبزادی تھیں۔ میر عون علی اس زمانے میں ریاست گوالیار کے قانونی مشیر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس مشہور مقدمے کی پیروی کی تھی، جس میں مہاراجا مادھو راؤ سیندھیا، انگریز ریذیڈنٹ کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ طویل مقدمے کے بعد مہاراجا اس الزام سے بری قرار دیے گئے، اور اس کے بعد میر عون علی اور ان کے خاندان کے تعلقات حکمراں خاندان سے اور بھی قریب ہو گئے۔ مہاراجا کی پٹ رانی مہارانی جنکولا لاولد تھیں، انھوں نے بدر النسا کو گود لے لیا۔ یہ اس وقت تین برس کی تھیں۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت گوالیار کے شاہی محل میں ہوئی؛ وہ فارسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پوری طرح قادر تھیں۔

آغا حیدر حسن مرزا کے دو بچے ان کی یادگار ہیں: مہر النسا بیگم (عرف شہزادی) اور

آغا سرتاج حسن مرزا (عرف چاند پاشا) بیٹی میر معظم حسین خان کے عقدِ نکاح میں ہیں جو یونسکو میں ملازم تھے۔ وہ پہلے بہت دن پیرس کے صدر دفتر میں رہے، بعد کو کابل دفتر کے انچارج رہے۔ آغا مرحوم اکثر اپنی صاحبزادی اور داماد سے ملنے یورپ جاتے رہے۔ انھیں سفروں کے دوران میں فرانس اور جرمنی کے بہت لوگوں کو ان سے بطور صوفی عقیدت ہو گئی تھی۔

۱۹۷۶ء کے موسمِ گرما میں بھی وہ اپنے عقیدت مندوں کی دعوت پر یورپ گئے۔ وہاں سے اکتوبر میں کابل آئے، جہاں مہرالنسا بیگم اپنے شوہر کے ساتھ مقیم تھیں۔ کابل سے بیٹی کے ہمراہ دلّی آئے۔ تین دن یہاں قیام کیا اور پھر حیدرآباد چلے گئے۔ بظاہر بالکل خوش و خرم تھے اور سان گمان تک نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ جمعہ ۵ نومبر ۱۹۷۶ء کی شام ایک دوست کے ہاں چائے پی۔ واپس مکان آئے، تو سینے میں درد کی شکایت کی۔ فوراً ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ حسبِ عادت ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے کہ یکایک روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ شب کے ساڑھے نو بجے کا واقعہ ہے۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہ رَاجِعُون۔

جنازہ ہفتے کے دن ۶ نومبر کو ظہر کے وقت اٹھا اور انھیں خطّہ صالحین میں دفن کر دیا گیا۔ مغیث الدین فریدی نے تاریخ کہی:

ہم سے رخصت ہوئے آغا حیدر حسن — جن سے روشن تھی تہذیب کی انجمن
وہ مجسّم شرافت، سراپا خلوص — سادگی میں بھی ان کی تھا اک بانکپن
وہ تھے دہلی کی محفل کے تنہا چراغ — شخصیت ان کی تھی آبروئے وطن
ان کی ذاتِ گرامی تھی ہر رنگ میں — روحِ تہذیب، جانِ ادب، شانِ فن

نام سے ان کے تاریخ رحلت ملی
آہ: "جنت مقام آغا حیدر حسن"
(۱۹۷۶)

دوسری تاریخ حسب حال باقر امانت خانی کی ہے:

کہی باقر نے وہ تاریخ جو عینِ حقیقت ہے
"زبان بیگماتی دیدہ نم ہے آغا صاحب پر"
(۱۹۷۶)

سید ریاست علی ندوی

ان کے مورث اعلیٰ میرزا مشہدی عہدِ شاہجہانی میں ہندستان آئے۔ ان کے ساتھ ان کے دو بھائی بھی تھے۔ ایک بھائی یہیں دلّی میں رہ گئے، دوسرے کڑہ مانکپور میں رکتے ہوئے پورب پہنچے۔ حکومت وقت کی طرف سے ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور جید گاؤں بھی معافی میں عطا ہوئے۔ رشد وہدایت اور طبابت اس خاندان کا خصوصی مشغلہ رہا۔

اس خانوادے کے پہلے فرد جو انگریزی عہدِ حکومت میں ملازمت میں شامل ہوئے ان کا نام سید احسان علی تھا؛ ان کے والد سید یوسف علی نامور طبیب اور ممتاز عالم تھے لیکن ان کے بعد خاندان نے آزادہ روی کے ساتھ حکومت سے بھی تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ سید احسان علی پٹنہ (عظیم آباد) میں ناظر مقرر ہوئے؛ جو اس زمانے میں بہت معزز عہدہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ پٹنے سے خشکی کے راستے گیا جارہے تھے کہ اثنائے سفر میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہوگئی؛ اسی میں وہ جان بحق ہو گئے۔ ان کے صاحبزادے میر سید آل نبی گیا کے پہلے سرکاری وکیل تھے۔ ان کی سندِ وکالت (مورخہ ۱۸۴۳ء) آج تک خاندان میں محفوظ ہے۔

سید آل نبی کے دو بیٹے تھے: سید اولاد علی اور سید امید علی۔ یہی اولاد علی ہمارے سید ریاست علی کے حقیقی پردادا تھے، اور سید امید علی حقیقی نانا۔ سید اولاد علی کے بیٹے ڈاکٹر سید فرزند علی نے پٹنہ میڈیکل کالج میں تعلیم پائی تھی۔ وہ نوجوانی میں فوت ہو گئے۔ ان کے اکلوتے بیٹے سید بشارت علی ان کی وفات کے چند ماہ بعد جنوری ۱۸۸۷ء

ماخذ: سید اشہد علی دبیر (مرحوم)

ربیع الاول ۱۳۰۴ھ) میں پیدا ہوئے ؛ یہی ریاست علی ندوی کے والدِ بزرگوار تھے۔ سید بشارت علی کے والد اور دادا دونوں ان کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے ؛ اس لیے وہ محجوب الارث قرار پائے۔ ان کے پردادا سید آل نبی نے اپنے دوسرے بیٹے سید امید علی کی رضامندی اور تائید سے سید بشارت علی کو حاجب کیا اور معتد بہ جاداد ان کے نام لکھ دی؛ اور چونکہ وہ ابھی کمسن اور نابالغ تھے، سید امید علی ہی کو ان کا سرپرست اور ان کی جاداد کا منصرم مقرر کر دیا۔ سید امید علی نے فرض شناسی سے کام لیا۔ نہ صرف جاداد کی مناسب دیکھ بھال کی اور اسے ترقی دی، بلکہ اپنی منجھلی صاحبزادی ان کے عقدِ نکاح میں دے دی۔ سید ریاست علی ندوی اسی نکاح کا نتیجہ تھے۔

سید ریاست علی خاندان کے سکونتی مکان (محلہ آنگلہ) گیا میں ۸ اپریل ۱۹۰۴ء (مطابق ۲۰ صفر ۱۳۲۲ھ) کو پیدا ہوئے۔ سنِ شعور کو پہنچے، تو چند رے گھر پر تعلیم پانے کے بعد صاحب گنج ہائی اسکول، گیا بھیج دیے گئے۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کی والدۂ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس سے تعلیم کا سلسلہ بھی درہم برہم ہو گیا ؛ اور پھر خاندان کے بزرگوں نے انھیں گیا بلوا لیا اور ٹپنہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ لیکن وہ یہاں بھی اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ جلد ہی فیصلہ ہوا کہ انھیں ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹۱۶ء میں انھوں نے ندوۃ العلما میں داخلہ لے لیا۔

دار العلوم ندوۃ العلما میں ان کا قیام ۱۹۲۴ء تک رہا۔ تکمیلِ نصاب تو خیر، اس کا مقصد تھا ہی۔ لیکن یہاں ان کے خیالات پر دیرپا سیاسی رنگ بھی چڑھا۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی (ف: جون ۱۹۵۹ء) مصر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے۔ چونکہ مصر میں پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے دوران میں ان کی سرگرمیاں مشتبہ رہی تھیں اور انگریز وہیں سے ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے، اس لیے قوی اندیشہ تھا کہ یہاں ہندستان پہنچنے پر انھیں گرفتار کر لیا جائیگا۔ انھوں نے خفیہ پولیس سے چھٹکارا پانے کے لیے دار العلوم ندوۃ العلما میں تکمیلِ حدیث

کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ریاست علی بھی وہاں طالب علم تھے، اور ان کے بزرگ ان کے سابق نگران ڈاکٹر سید شاہ زین العابدین پیر بگھوی مرحوم کے لکھنؤ سے چلے جانے کے باعث مشوش تھے کہ انھیں اب کس کی نگرانی میں چھوڑا جائے۔ ملیح آبادی مرحوم کے وہاں پہنچ جانے سے ان کی مشکل حل ہوگئی۔ یہ بھی اسی کمرے میں رہنے لگے، جس میں ریاست علی مقیم تھے۔

ملیح آبادی سیاسی خیالات میں انگریز دشمن تو تھے ہی، وہ طریق کار کے لحاظ سے بیباری اور انقلابی بھی تھے۔ بلکہ مجھے شبہہ ہے کہ خفیہ طور پر غالباً ان کا بنگال کے دہشت پسند عناصر سے بھی تعلق تھا۔ بہر حال، ان کے نوجوان ریاست علی مرحوم کے ساتھ رہنے کا وہی نتیجہ نکلا، جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ملیح آبادی مرحوم بڑے لسّان اور بذلہ سنج آدمی تھے، ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور حافظہ بھی قوی۔ وہ ہنسی مذاق میں بڑے پتے کی بات کہہ جاتے تھے۔ ریاست علی کے ساتھ ان کا دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لاشعوری طور پر ان کا ملیح آبادی کے سیاسی خیالات سے متاثر ہو جانا لابدی تھا۔ قصہ کوتاہ، یہ بھی انگریز دشمنی کے رنگ میں رنگ گئے۔ حکومت کے کارندے جو ملیح آبادی کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ خود ملیح آبادی تو خاموش ہیں، کہیں آتے جاتے نہیں؛ لیکن ان کا یہ شاگرد ان کے بھی کان کاٹنے لگا ہے۔ قدرتاً یہ معتوب سرکار ہو گئے؛ بلکہ سنا ہے کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ تک جاری ہو گئے تھے۔

خاندان کے بزرگوں تک خبر پہنچی، تو انھوں نے انھیں وطن طلب کیا۔ پہلا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کی شادی کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید اکرم امام کی سنجھلی بیٹی سعیدہ خاتون سے ان کا عقد کر دیا گیا؛ یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ سید اکرم امام ان کے والد سید بشارت علی کے سگے ماموں تھے اور پہلی بیوی (بنت سید امید علی) کی وفات کے بعد ان کی دوسری شادی اپنے انھیں ماموں کی منجھلی بیٹی سے ہوئی تھی۔ انھیں کی چھوٹی ہمشیرہ سے اب ریاست علی کی شادی ہوئی؛ گویا ان کی سگی بڑی سالی،

ان کی سوتیلی ماں بھی تھیں۔
شادی کے بہانے سے گھر والوں نے انھیں مکان پر روک لیا اور چند مہینے لکھنؤ نہیں جانے دیا۔ ادھر ملک کی سیاسی سرگرمیاں بھی رفتہ رفتہ کچھ سرد پڑ گئیں اور غالباً وارنٹ بھی منسوخ کرا دیا گیا۔ اس کے بعد یہ دوبارہ ندوہ پہنچے اور ۱۹۲۴ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔
مولانا شبلی کی وفات (۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) کے ساتھ ہی دارالمصنفین، اعظم گڑھ کی باگ ڈور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ وہ اس تلاش میں تھے کہ کچھ ہونہار نوجوانوں کو اپنے اردگرد جمع کریں، جو تصنیف و تالیف کے کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں، اور استاد کے لگائے ہوئے اس پودے کی آبیاری کر سکیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ریاست علی ندوی ہر طرح اس کام کے اہل ہیں، تو وہ انھیں اگست ۱۹۲۴ء میں اپنے ساتھ دارالمصنفین لے گئے۔
دارالمصنفین میں ان کا قیام تیرہ برس رہا (اگست ۱۹۲۴ء تا جون ۱۹۳۷ء)۔ اس زمانے میں وہ دوسرے کاموں کے علاوہ معارف کی ترتیب و تدوین میں بھی مدد دیتے رہے۔ ان کی دو مشہور کتابیں تاریخِ صقلیہ (دو جلدیں) اور تاریخِ اندلس (جلد اول) اسی زمانے میں لکھی گئی تھیں۔
۱۹۳۷ء میں وہ اپنے وطن گیا واپس آئے۔ اور اسی سال انھوں نے ماہنامہ "ندیم" کی ادارت کی ذمے داری قبول کر لی۔ چار سال یعنی ۱۹۴۱ء تک یہ پرچہ ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں وہ دوبارہ دارالمصنفین میں بطور رفیق چلے گئے اور اب کے ۱۹۴۹ء تک وہاں رہے۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اگلے تقریباً دس سال (مارچ ۱۹۵۹ء) تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ اسی زمانے میں وہ حکومتِ بہار کے شعبۂ اسلامی تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی رہے (۱۹۵۲ء-۱۹۶۲ء) شمس الہدیٰ کی ادارت سے سبکدوش ہونے کے بعد (مارچ ۱۹۵۹ء میں) انھیں عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ کا

صدر اور پروفیسر بنا دیا گیا۔ یہاں وہ سات برس تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد (۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے گیا کالج، مگدھ یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر رہے۔
ان کی وفات اتوار ۱۴ نومبر ۱۹۷۶ کو بلگرام اسپتال میں بعارضۂ قلب ہوئی اور اسی دن اپنے آبائی قبرستان (آگلہ) میں سپردِ خاک کیے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔
پانچ صاحبزادے ان کی یادگار ہیں: (سید اسد علی، سید ارشد علی، سید اشہد علی، سید امجد علی، سید شوکت علی) ماشاء اللہ سب خوش و خرم اور معزز عہدوں پر ممتاز ہیں۔
تاریخ صقلیہ (دو جلدیں) اور تاریخ اندلس (جلد اوّل) کے علاوہ، جن کا اوپر ذکر ہوا، ان کی دوسری مطبوعہ کتابیں یہ ہیں: عہدِ اسلامی کا ہندستان؛ اسلامی نظامِ تعلیم؛ ائمۂ اسلام؛ سرگزشت ادبِ ترکی۔ ان کی دو کتابیں (چند نقدس اور عہدِ رسالت و خلافت راشدہ) زیر طبع ہیں۔ ابھی پندرہ سولہ کتابیں منتظر طباعت ہیں۔ متعدد مقالات ان کے علاوہ ہیں، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف علمی مجالس میں پڑھے تھے۔ لازم ہے کہ یہ سب چیزیں محفوظ کر دی جائیں

فانی بلگرامی، سیّد وصی احمد

غالب کے شاگردوں میں سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی کا نام بہت مشہور ہے۔ انھوں نے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا اور ان کی بدولت بہار میں اُردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ان کا ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ رمضان ۱۳۰۷ھ) کو پٹنے میں انتقال ہوا اور وہ اپنے آبائی وطن آرہ میں دفن ہوئے۔ ان کے اکلوتے صاحبزادے سیّد نور احمد بھی شعر کہتے۔ اور گرامی تخلص کرتے تھے۔ سیّد وصی احمد بلگرامی انھیں کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان سے ایک بڑے بھائی سیّد عنایت اللہ تھے، وہ دلگیر تخلص کرتے تھے۔

فانی ۱۶ دسمبر ۱۸۸۹ء (۲۲ ربیع الثانی ۱۳۰۷ھ) کو اپنے خاندانی مکان واقعہ پھاٹک میر صاحب آرہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم آرہ ٹاؤن اسکول میں پائی اور ۱۹۰۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کی سند لی۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں انٹر کا امتحان جی بی بی کالج مظفر پور (بہار) سے اور ۱۹۱۱ء میں بی اے کا پٹنہ کالج سے پاس کیے۔ ہر مرتبہ امتیاز اور وظیفہ حاصل کیا۔ بی اے کے بعد پٹنہ کالج کے ایم اے (تاریخ) کے درجے میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن عین امتحان کے دنوں میں بیمار ہو جانے کے باعث ۱۹۱۳ء میں امتحان دینے سے قاصر رہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم کا دور ختم ہو گیا

۱۹۱۸ء میں سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے؛ اور ان کا تقرر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ہو گیا۔ تقریباً ۲۸ سال کی ملازمت کے بعد مئی ۱۹۴۷ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی ہنگامہ آرائی کا تھا۔ اسی وقت انھوں نے نقل مکان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ماخذ: تذکرہ مسلم شعرائے بہار (۶)؛ سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی، علی گڑھ

چنانچہ پورے خاندان کے ساتھ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی چلے گئے۔ وہاں سے مہینا بھر کے بعد حج کے لیے روانہ ہوئے، جہاں سے اواخر نومبر ۱۹۴۷ء میں واپس آئے۔

فانی کے دورانِ ملازمت کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے؛ اس سے اکبر الہ آبادی مرحوم کے ایک نئے شعر کا بھی سراغ ملتا ہے۔ یہ ہمیں فانی کے بھانجے سید مرتضیٰ حسین بلگرامی (علی گڑھ) نے عطا کیا ہے۔

فانی کا سرکاری دورے پر الہ آباد جانا ہوا۔ ایک دن اکبر الہ آبادی سے ملنے ان کے مکان پر گئے۔ اکبر نے دورانِ گفتگو میں شکایتی انداز میں فانی سے کہا:

دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی اکبر!
ہم اکیلے ہیں، محبت کو نبھائیں کیونکر!

مدعا یہ کہ آپ راہ و رسم رکھا کیجیے۔ جناب فانی اس وقت ادباً خاموش رہے، مگر جب رخصت ہو کر باہر نکلے تو اکبر الہ آبادی کے ملازمِ خاص کو ایک کاغذ کے پرزے پر یہ شعر لکھ کر دیا کہ اکبر کی خدمت میں پیش کر دے:

چٹکی تو بجا کرتی ہے اک ہاتھ سے فانی!
تالی نہ سہی، وہ کبھی چٹکی تو بجاتے

اکبر الہ آبادی یہ شعر پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے اور کہا: بات سے بات پیدا کرنا اس کو کہتے ہیں۔

اتوار ۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء رات ساڑھے نو بجے کراچی میں رگھرائے عالمِ فانی ہوئے۔ اگلے دن (۱۵ نومبر) انھیں ان کے برادرِ اکبر سید عنایت احمد دگیر بلگرامی (ف مئی ۱۹۷۶) کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ دادھیال اور ننھیال میں متعدد شاعر ہوئے۔ فانی مرحوم نثر بھی خوب لکھتے تھے اور اس میدان میں سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ ان کا مضمون "س، ش، ص" جس میں انھوں نے شاد عظیم آبادی کے تلمذِ صفیر پر بحث کی گئی ہے،

خاصے کی چیز ہے جس زمانے میں یہ پہلی مرتبہ ندیم، گیا اور نگار لکھنؤ میں چھپا ہے اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ ان کے دوسرے مضامین الف، گل داؤدی، ملک خطا کے شہزادے وغیرہ بھی نثری شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے تھے۔

افسوس کہ مجموعۂ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔ دراصل انھوں نے بعد کے زمانے میں شعر کہنا تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ بمشکل چند شعر ملے، جو بطور نمونہ درج ذیل ہیں پہلی نظم "خانہ باغ" سید مرتضیٰ حسین بلگرامی سے ملی اور غزل جناب مشفق خواجہ، کراچی سے:

صوبۂ بہار کے ضلع شاہ آباد اور سہسرام کے وسط میں ایک قصبہ کواتھ نامی آباد ہے۔ ہمارے مورث اعلیٰ سید نور الحسن بلگرامی نے بلگرام سے ترک وطن کر کے اس سرزمین کو آباد کیا تھا۔ یہاں ان کی اولاد کا شمار شرفائے خاص میں ہوتا ہے اور ہندو مسلمان ان سے ادب و احترام کا سلوک کرتے ہیں۔

کواتھ میں سادات کے گھر گڑھ میں ہیں۔ اسی محلہ گڑھ میں سید آل حسین بلگرامی مرحوم کے جد اعلیٰ سید علی حسین ڈپٹی کلکٹر نے ۲۳ کمروں کا ایک وسیع مکان تعمیر کیا، جس کی دیواروں کی چوڑائی ۲ ½ فٹ ہے۔ اس مکان سے ملحق چمن اور اس سے متصل خانہ باغ ہے، جس کا رقبہ کم و بیش دو بیگھ پختہ ہے۔ امتداد زمانہ سے اس خانہ باغ کی چہار دیواری شکستہ ہو گئی۔ جب اس کی از سر نو تعمیر کے لیے سید ابو محمد اور سید جان محمد پسران سید آل حسین بلگرامی نے ارادہ کیا، تو ساکنان کواتھ نے مانعت کی کہ اب یہ زمین افتادہ ہے اور عوام الناس کے مصرف کی ہے، اس لیے دیوار نہ اٹھائی جائے۔ اس نزاع نے مقدمے کی صورت اختیار کر لی۔ اس پر ایس، ڈی، او اور کلکٹر ضلع نے خود موقع پر معاینہ کیا اور کاغذات و حق ملکیت اور اہل خاندان بلگرام کی قبور دیکھنے کے بعد فیصلہ دیا کہ چہار دیواری اٹھانے کا حق سید ابو محمد بلگرامی کو دیا جاتا ہے؛ اگر کسی

نے مزاحمت کی تو وہ کارِ سرکاری میں دخل اندازی کا ملزم قرار دیا جائیگا ۔
چنانچہ چہار دیواری اٹھ گئی اور آج تک باقی اتصالیات کے طور پر موجود ہے ۔
یہ نظم خانہ باغ اس واقعے کا منظوم قصہ ہے ۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

بردرت حاضر مونگیر ۔۔۔ السلام، اے سہسرام
صلح آمد، جنگ رفت ۔۔۔ صد درود و صد سلام
دَر دہانم صد گہر ۔۔۔ بَر زبانم صد کلام
با تو گویم چند حرف ۔۔۔ از کتابِ ننگ و نام
باغ تھا اک گواتھ میں ۔۔۔ بار آور، شید کام
شہد سے سینچا گیا ۔۔۔ تھا یہ ادنا اہتمام
ہائے رے انجامِ باغ ۔۔۔ باغ تھا خورشید شام
باغ کا چشم و چراغ ۔۔۔ خاتمہ بالخیر آم
وہ بھی اجڑا، جس طرح ۔۔۔ خاندانِ بلگرام
شام اس کی ننگِ شب ۔۔۔ صبح اس کی ننگِ شام
نام تک اس کا مٹا ۔۔۔ مثلِ نامِ بلگرام
چند قبریں تھیں وہاں ۔۔۔ پائمالِ خاص و عام
نوحہ خواں تھی بیکسی ۔۔۔ رات دن اور صبح شام
انقلابِ دہر سے ۔۔۔ شامِ عبرت ان کی شام
بارے ان کے دن پھرے ۔۔۔ ہو گئی کافور شام
تحت میں آئی زمیں ۔۔۔ تھی جو گویا فرشِ عام
ہو گئیں پھر ملکِ خاص ۔۔۔ تھی جو اب تک ملکِ عام
حد میں لانے کے لیے ۔۔۔ تھا مناسب انتظام
مثلِ فانی تھی ضرور ۔۔۔ این و آں کی روک تھام
چار دیواری نے تب ۔۔۔ بند کر دی راہِ عام

کھنچ گئی دیوار جب | مثلِ شمشیر از نیام
برق چمکی کو اتھ میں | تار پہنچا سہرام
تار والوں کی، مگر | ہو گئی تر کی تمام
چار دیواری کو تھی | قوت حا ئرم امام
اس لیے اٹھ کر رہی | وہ خدا کا لے کے نام
اور کہا: اے صاحبو! | کون ہو تم، کیا ہے نام؟
اس نے اُٹھتے ہی کہا | قبر والوں کو سلام
غیب سے آئی صدا | اس سے تجھ کو کون کام!
الامان والحفیظ | انقلابِ صبح و شام
اس کے دو روشن گواہ | مہر اور ماہِ تمام
ہم بتائیں کیا تجھے؟ | کون ہیں ہم، کیا ہے نام
ہے بہارِ بلگرام | درِ مزارِ بلگرام
آج ہیں زیرِ زمیں | تاجدارِ بلگرام
طوطیائے چشمِ ہند | تھا غبارِ بلگرام
فخرِ یوناں تھا کبھی | ننگ و عارِ بلگرام
دین تھا، دنیا کے ساتھ | ہم کنارِ بلگرام
یا الٰہی، کیا ہوا | وہ وقارِ بلگرام
تھا کبھی ابرِ بہار | آب دارِ بلگرام
کیا ہوا وہ، اے خدا! | کاروبارِ بلگرام
مرثیہ ہے مرثیہ | حال زارِ بلگرام
اے خزاں کب آئیگی | پھر بہارِ بلگرام
ہم نہیں، تو پھر کہاں! | اعتبارِ بلگرام
آج ہیں آلِ حسین | سوگوارِ بلگرام

پاس جن کے آٹھ پھل ایک پختہ ، سات خام
باقیات الصّالحات ہوں وہ پختہ یا کہ خام
پوچھ لے آٹھوں سے تو کون ہیں ہم ، کیا ہے نام
بڑھ کے آٹھوں نے کہا "خاتمہ بالخیر آم" ۱۹۳۰ + ۸ = ۱۹۳۸ء
عیسوی تاریخ کا ہوگیا جھگڑا تمام
ہوگیا پھر "جشن باغ" سال ہجری لا کلام ۱۳۵۶ھ
کلکِ فانیؔ کو دعا
اور فانیؔ کو سلام

برہمن کی چوکھٹ پر گر کر آنکھیں ملتے ہیں
آنکھیں بند ہوتے اقربا کے ہاتھوں جلتے ہیں

جوان و پیر کے زیب گلو ہے طوقِ نادانی
کھلونے موت نے چھینے ، تو طفل آسا مچلتے ہیں

وہی ہیں بھیس میں خورشید کے دن کو کرم فرما
لباس ماہ و انجم میں جو راتوں کو نکلتے ہیں

جو دکھلائیں تو غش ہوں سب ، نہ دکھلائیں تو منکر ہوں
وہ یکتائی پہ اپنے حُسن کی خود ہاتھ ملتے ہیں

یہ کیا ضد ہے کہ بے دیکھے نہیں مانینگے اُس کو ہم
یقیں بالغیب رکھ کر کو رمادر زاد چلتے ہیں

نہ چلنا اور چلنا پاؤں ہونے پر نہیں موقوف
شجر بھی کیوں نہیں چلتے ، تارے جیسے چلتے ہیں

انا لیلیٰ کی منزل میں بھی لیلیٰ دو رتھی کو سوں
کہ جتنی آگ بڑھتی ہے ، وہ اتنا اور جلتے ہیں

یقین و شک پہ ٹھہرا ہے وہاں کا فیصلہ فانیؔ!
کہ شک والے پھسلتے ہیں ، یقیں والے سنبھلتے ہیں

سید وقار عظیم، پروفیسر

ان کا خاندان در اصل انبہٹہ کا تھا، جو گنگوہ (یو پی) کے قریب ایک قصبہ ہے: نانھیال میرٹھ میں تھی۔ لیکن وقار عظیم دسمبر ۱۹۱۰ء (۱۳۲۷ھ) میں الہ آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان دنوں ان کے والد سید مقبول عظیم پولیس میں ملازمت کے باعث مقیم تھے سید مقبول عظیم شاعر بھی تھے عرش تخلص تھا۔ وہ بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے۔ بیان کا نعت اور غزل میں بہت بلند مقام ہے۔ عرش کو بھی نعت رسول صلعم سے زیادہ مزاولت تھی۔ وقار عظیم ان کا تاریخی نام ہے، جس سے (۱۳۲۷) برآمد ہوتے ہیں (اسکول کے سرٹیفکٹ میں درج "تاریخ ولادت ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء غلط ہے)

۱۹۱۶ء / ۱۹۱۷ء میں سید مقبول عظیم کا کانپور تبادلہ ہو گیا۔ خاندان بھی ان کے ساتھ آ گیا۔ یہیں وقار عظیم کی تعلیم شروع ہوئی؛ اور اس کا انتظام گھر پر کیا گیا۔ والدہ کے علاوہ پڑھانے کو ایک پنڈت مقرر ہوئے، جن کا نام تیواڑی جی تھا۔ پنڈت جی اُردو نہیں جانتے تھے، لہٰذا ساری پڑھائی ہندی میں ہوتی تھی۔ اسی لیے وقار عظیم کی ہندی کی واقفیت بہت اچھی تھی؛ اور آخر تک ان کا ہندی کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ والدہ سے انھوں نے اردو، قرآن شریف اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ فارسی بھی ان سے پڑھی۔ اس کے بعد مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ تیسرے درجے میں تھے، جب ۱۹۱۹ء میں ان کے والد تبدیل ہو کر اٹاوہ چلے گئے، یہاں بھی گورنمنٹ ہائی اسکول میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں مڈل اسکول (آٹھویں درجے) کے امتحان یونیورسٹی کی طرف سے ہوا کرتے تھے اور اچھے نمبروں میں کامیاب طلبہ

ماخذ: ماہِ نو، کراچی؛ سید وقار عظیم از معین الرحمان، لاہور؛ میری دنیا از پروفیسر اعجاز حسین، الہ آباد۔ نوائے وقت (روزنامہ) لاہور

کو وظیفہ ملتا تھا۔ وقار عظیم نے ۱۹۲۴ء میں یہ امتحان پاس کیا اور وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔

اناؤ کی تعلیم کے زمانے ہی میں انھیں مطالعے اور اس کے بعد لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھیں جو وظیفہ ملتا، اس سے نئی نئی کتابیں خریدتے اور معلومات وسیع کرتے رہے۔ ان کے اسکول کا رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔ جس میں کبھی کبھی لکھتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ شہر سے ایک ہفتہ وار اخبار "آفتاب" نکلتا تھا۔ اسکول کے رسالے کے باہر ان کا سب سے پہلا مضمون اسی آفتاب میں چھپا۔ یہ ایک مشاعرے کی رُوداد تھی جو صفی پور کے سالانہ عرس کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔

اناؤ سے یہ دسویں کی سند لے کر لکھنؤ پہنچے اور گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھیں حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، مولوی محمد حسین، اختر علی تلہری جیسے بلند مرتبہ اور فاضل اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ جس نے ان کے ادبی ذوق کی تکمیل میں سونے میں سہاگے کا کام کیا۔

حامد اللہ افسر اور علی عباس حسینی کی دیکھا دیکھی انھوں نے افسانے لکھنا شروع کیے۔ ان کے افسانے "پریم رس" اور "جو میں ایسا جانتی" اسی زمانے میں لکھے گئے اور شائع ہوئے۔ لیکن دس بارہ افسانے لکھنے کے بعد ان کی تمام تر توجہ تنقید کے لیے وقف ہو گئی اور یہ کوچہ ان سے چھوٹ گیا۔

۱۹۳۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا اور اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے (اُردو) کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ۱۹۳۴ء میں درجۂ اوّل میں ایم اے کی سند حاصل کی اور کامیاب طلبہ میں اوّل آئے۔ اپنے استاد پروفیسر سید اعجاز حسین (ف: فروری ۱۹۷۵ء) کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ اس یونیورسٹی کے دو اور استادوں کا بھی ان پر گہرا اثر رہا۔ اوّل، پروفیسر ایس سی. دیب اور دوسرے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری؛ یہ دونوں یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں پڑھاتے تھے۔ دونوں بے پناہ مطالعے کے شائق اور ہمہ جہتی علم کے مالک تھے۔ وقار عظیم کے

کردار اور ادبی رجحانات کی تشکیل میں ان دونوں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔
اپنے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں ان کا بہت گہرا تعلق جوبلی کالج کے پروفیسر سید علی عباس حسینی (ف: ستمبر ۱۹۶۹ء) سے رہا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھیں شروع سے افسانہ اور فنِ افسانہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی، اور اس صنف میں ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق ہو گیا، کہ انھوں نے قیامِ الٰہ آباد کے دوران میں دو کتابیں "ہمارے افسانے" اور "اردو افسانہ نگاری" تصنیف کیں۔ یہ کتابیں اول مرتبہ الٰہ آباد ہی سے بالترتیب ۱۹۳۵ اور ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئیں۔ یہ دونوں آج بھی مقبول ہیں، حال آں کہ یہ ان کے طالب علمی کے دور کی یادگار ہیں۔ دراصل یہ انھیں دونوں کتابوں کی تصنیف تھی، جس نے انھیں فراق سے اتنا قریب کر دیا۔ فن افسانہ نگاری پر اردو میں کوئی مواد نہیں تھا۔ انگریزی میں جو کچھ تھا، اس تک کسی کی رہبری کے بغیر رسائی ممکن نہیں تھی۔ ان دونوں استادوں کی مشورت اور دستگیری ان کے لیے اپنے کام میں بہت مفید ثابت ہوئی۔
ایم اے کے بعد ان کا ارادہ ڈاکٹریٹ کی سند لینے کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے "اردو شاعری پر مقامی اثرات" کے موضوع پر کام شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے ۱۹۳۵ء میں سال بھر کے اندر یکے بعد دیگرے والد اور والدہ کا انتقال ہو گیا اور گھر کی ساری ذمّے داری ان کے کندھوں پر آپڑی۔ لامحالہ انھیں تحقیق کا منصوبہ ترک کر کے ملازمت تلاش کرنا پڑی۔
الٰہ آباد سے ایم اے کی سند لینے کے بعد وہ علی گڑھ آئے اور یہاں سے ۱۹۳۷ء میں بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ جب سب تعلیمی منازل طے ہو گئیں، تو کسبِ معاش کا مشکل مرحلہ سامنے آیا۔ چونکہ تعلیمی دور بہت کامیاب رہا تھا اور وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی داخل ہو چکے تھے، اس لیے ملازمت کے حصول میں کسی دقّت کا سامنا نہیں ہوا۔ ان کی سب سے پہلے تقرری ۱۹۳۸ء میں بحیثیتِ استاد اردو جامعہ ہائی اسکول، دلّی میں ہوئی۔ اس زمانے میں یہاں سے ماہنامہ "جامعہ" ڈاکٹر عابد حسین

رف : دسمبر ۱۹۷۸ء) کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر صاحب موصوف انجمن ترقی اردو کے سکٹری مولوی عبدالحق مرحوم (ف : اگست ۱۹۶۱) کی فرمائش پر اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی تیاری میں مصروف تھے۔ چونکہ وہ جامعہ" کی ترتیب و تدوین پر پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے، انھوں نے رسالے کی ادارت پر سید وقار عظیم کو مقرر کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ بسا اوقات وہ اپنے طلبہ کو بھی ان کے پاس مشورے کے لیے بھیج دیتے تھے۔

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا نام بڑا تھا، لیکن اس کی اس زمانے کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہاں کے کسی استاد کو سوا سو سے زیادہ مشاہرہ نہیں ملتا تھا۔ سید وقار عظیم کو بھی جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھی۔ لیکن آدمی متحمل مزاج اور ایثار پرست واقع ہوئے تھے، اس لیے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی۔ آخر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم شیخ الجامعہ (ف مئی ۱۹۶۹ء) نے حالات کا اندازہ کر کے از خود ایک دن کہا کہ اگر آپ چاہیں تو کسی دوسری جگہ ملازمت کا انتظام کر لیں، تاکہ آپ کی مالی دشواریاں بھی کچھ کم ہو جائیں، اور لکھنے کے شوق کی تسکین بھی ہو سکے۔ اتفاق سے انھیں دنوں سرکار نے پولی ٹیکنک کے نام سے دلی میں ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے کرتا دھرتا حکومت ہند کے تعلیمی امور کے مشیر سر جان سارجنٹ تھے۔ ان کے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے بہت قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ہمیں اس ادارے کے لیے ایک اردو کا مستعد اور محنتی استاد چاہیے۔ ذاکر صاحب نے وقار عظیم صاحب کا نام پیش کر دیا اور سر جان نے اس پر صاد کر دیا۔ ذاکر صاحب نے وقار عظیم صاحب کو بلا کر ان سے کہا کہ آپ کے مستقبل کے لیے بہتر ہے کہ آپ پالی ٹیکنک کی پیشکش قبول کر لیں۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵) کے دوران میں (۱۹۴۲ء) حکومت وقت نے پراپیگنڈے کے لیے پندرہ روزہ "آجکل" جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ مختلف اوقات

میں پندرہ روزہ اور ماہانہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا، تاآں کہ ۱۹۴۸ء میں مستقلاً اس کی شکل ماہانہ کی ہوگئی۔ اس کے سب سے پہلے ایڈیٹر آغا محمد یعقوب دواشی تھے ۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا ترقی پر تبادلہ ہوگیا اور ایڈیٹر کی جگہ خالی ہوگئی۔ سیّد وقار عظیم نے بھی درخواست بھیج دی، اور یوں وہ ۱۹۴۶ء میں "آجکل" کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے۔ اگلے ہی برس ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا اور وہ کراچی چلے گئے۔ حکومتِ پاکستان نے بھی تھوڑے دن بعد ۱۹۴۸ء میں "آجکل" کے انداز کا ماہنامہ "ماہِ نو" جاری کردیا۔ "آجکل" کی ایڈیٹری سیّد وقار عظیم کے کام آئی، اور "ماہِ نو" کی ادارت ان کے سپرد کردی گئی۔

کراچی کا یہ قیام بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کسی ماہنامے (خاص کر اردو ماہنامے) کی ادارت بھی مدیر کو پورا وقت مصروف رکھنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ سیّد وقار عظیم نے خالی اوقات میں تنقیدی اور ادبی مضامین کے علاوہ متعدد درسی کتب اسی زمانے میں لکھیں۔ لیکن کراچی کی مرطوب آب و ہوا نے ان کی تندرستی پر برا اثر ڈالا۔ وہ شروع سے قوام کے کمزور اور دھان پان تھے۔ اب ان پر دمہ کا مرض مسلّط ہوگیا۔ پہلے تو انھوں نے کوئی پروا نہ کی، لیکن تابہ کے، بالآخر ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ انھوں نے کراچی سے لاہور منتقل ہوجانے میں عافیت دیکھی۔ خوش بختی سے فروری ۱۹۵۰ء میں یہاں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اردو کی مدرسی مل گئی۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر معلّم تھے؛ اس لیے اس تبدیلی سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔

اورینٹل کالج میں وہ تقریباً ۲۰ برس رہے۔ لیکچرر سے ریڈر ہوئے، اور ریڈر سے پروفیسر اور ۱۹۶۱ء میں کالج کے پرنسپل۔ وہ ۱۹۷۵ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔

صحت بالعموم تسلّی بخش کبھی نہیں رہی، لیکن انھوں نے کبھی مایوسی یا افسردگی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، اور نہ کبھی محنت سے جی چرایا۔ ظاہر ہے کہ روح خواہ کتنی ہی مضبوط اور طاقتور ہو، جسم کب تک اس کا ساتھ دے سکتا ہے! ۷ نومبر ۱۹۷۶ء

کو یرقان کا حملہ ہوا، اور بیحد شدید۔ گُردوں میں بھی کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ بغرض علاج لاہور کے ہاجرہ کلینک میں داخل ہو گئے۔ دوا دوش میں کمی نہیں ہوئی، لیکن بیسود، حالت تیزی سے بگڑتی گئی۔ ایک مرحلے پر فیصلہ ہوا کہ انھیں خون دیا جائے اس پر کلنک کے باہر ان کے دوستوں اور مداحوں کا تانتا لگ گیا، جو اپنا خون پیش کر رہے تھے۔ چہارشنبہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء شام کے وقت جاں بحق ہو گئے۔ تجہیز و تکفین اگلے دن ۱۸ نومبر کو ہوئی۔ لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے منظور حسن عباسی نے ہجری میں تاریخ کہی:

ازاں کہ ہر نفسش بودہ فیض بارِ عظیم
تراوش قلمش گشتہ شاہکارِ عظیم
چو رخت بست ز دنیائے دوں بگفت حسن
ز سالِ رحلتِ او "نوحۂ وقارِ عظیم"
(۱۳۹۶)

جسمانی اولاد میں پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے

سید وقار عظیم نے اپنی زندگی میں افسانے بھی لکھے اور شعر بھی۔ انھوں نے سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ ہندستان میں "آجکل" کی اور پاکستان میں "نقوش" اور "ماہِ نو" کی ایڈیٹری بھی کی، وہ ریڈیو اور ٹی وی کی بھی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ غرض ان کی ذات کئی پہلوؤں کی حامل تھی۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ، جس کے لیے وہ تاریخ ادب اردو میں یاد کیے جائینگے، ان کی تنقید ہے، خاص طور پر افسانے اور غزل کے میدان میں۔ افسانے میں تو ان کا کام اتنا وقیع ہے کہ شاید ہی کوئی اور نقاد ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اگرچہ اور بہت اصحاب نے بھی افسانے کی تاریخ و تنقید پر لکھا ہے مثلاً احتشام حسین اور احسن فاروقی وغیرہ ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کا پلہ سب پر بھاری ہے۔ وقار عظیم تاریخ تنقید میں ایک طرح سے حالی اور ترقی پسند نقادوں کے درمیان برزخ کا کام دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیشک کلاسیکی تھا

اور وہ حالی سے متاثر بھی تھے ؛ لیکن ان میں حالی کی مقصدیت اور اصلاح کی خواہش کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے، بلکہ کچھ زمانہ ان اصحاب کے ہمراہ بھی چلے، لیکن وہ کبھی ان کی تخریبی تنقید اور انقلابی روش سے اتفاق نہ کر سکے۔ انھوں نے دونوں کی افراط و تفریط سے دامن بچایا اور اپنی انفرادیت کا سکّہ منوالیا۔

معزؔ لکھنوی، میرزا محمد عزیز

میرزا محمد عزیز مرحوم برادرِ بزرگ تھے، مشہور مزاح نگار میرزا محمد اقبال ماچس لکھنوی کے، جن کا ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا تھا۔ ماچس مرحوم کے مفصل حالات قلمبند کر چکا ہوں (تذکرۂ معاصرین (۱): ۲۲۸-۲۳۷)، وہیں خاندان کا ذکر بھی شرح و بسط سے کیا گیا ہے۔ مختصراً انھیں کا اعادہ یہاں کرتا ہوں۔

میرزا محمد عزیز کے والد مرزا مہدی حسین (ف: ۱۹۴۹ء) پوتے تھے، میرزا فرخندہ بخت کے جو بادشاہِ اودھ محمد علی شاہ کے بیٹے تھے۔ محمد علی شاہ کے بعد ان کے بڑے بیٹے امجد علی شاہ تخت پر بیٹھے تھے، اور بقیہ اولاد کے لیے وظائف مقرر ہو گئے۔ یہ وظیفے بھی اس وقت بند ہو گئے، جب انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں امجد علی شاہ کے بیٹے، آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتے میں نظربند کر دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے خاندانِ شاہی کے افراد کے وثیقے مقرر کر دیے۔ جو اصحاب حکمران کی براہِ راست اولاد تھے، انھیں مزید برآں کچھ سیاسی پنشن بھی ملتی تھی۔

مرزا مہدی حسین کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا تھا۔ آمدنی قلیل اور کنبہ بڑا؛ پس انداز کرنے کا کیا سوال تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اولاد کی معقول طریقے پر تعلیم نہ ہو سکی۔ معزؔ کی بھی (ماچس کی طرح) سرپرستی ان کے نانا پرنس میرزا محمد ابراہیم عیشؔ نے کی تھی؛ انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم انھیں سے حاصل کی۔ لیکن یہ عیشؔ مرحوم کا دورِ انحطاط تھا؛ اس لیے دونوں بھائی ان سے بہت کم استفادہ کر سکے۔

مآخذ: تذکرۂ شعر و نغمہ؛ مکاتیب نگار لکھنوی، بمبئی۔

لکھنؤ کا وہ ماحول، اس پر گھر میں ہر وقت شعر و سخن کے چرچے؛ معزز نے بھی بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ روایت ہے کہ انھوں نے شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۲۲ء میں کی، جب ان کی عمر ۱۲ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اور یہ ابتدا بھی ایک سلام سے ہوئی۔

شروع میں چندے صدق لکھنوی سے اصلاح لی۔ پھر دو برس بعد (۱۹۲۴ء) جب غزل کی طرف توجہ ہوئی، تو اس پر سید انور حسین آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے شاگرد رشید وقار لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ وقار کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔ اس دوران میں حکیم منّے آغا صاحب آفتاب فیض آباد سے لکھنؤ آئے، تو معزز ان کی خدمت میں پہنچے۔ آفتاب فارسی، عربی میں منتہی اور پرانی وضع کے استاد تھے، جو فن کی تعلیم فن کی خاطر حاصل کرنے کے قائل تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ شاگرد ہونہار ہے، لیکن فنِ شعر میں اسے مزید تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے معزز کو عروض باقاعدہ پڑھایا۔ کچھ مدت بعد آفتاب واپس فیض آباد چلے گئے، تو اب معزز نے خبیر سے اصلاح کی درخواست کی۔ لیکن خبیر کو غزل سے دلچسپی نہیں تھی، نہ وہ غزل کہتے ہی تھے، لہٰذا معزز نے صفی لکھنوی (ف: جون ۱۹۵۰ء) سے رجوع کیا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک چلا۔ لیکن صفی کی پیرانہ سالی اور صحت کی خرابی کے باعث ۱۹۴۰ء میں اسے مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا کلام کسی کو نہیں دکھایا۔ البتہ کوئی علمی مسئلہ یا فنی نکتہ حل طلب ہوتا تو میرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی (ف: جون ۱۹۶۷ء) سے استفسار کر لیتے۔

اثر مرحوم جب ۱۹۴۵ء میں سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہو کر مستقلاً لکھنؤ میں مقیم ہو گئے، تو معزز نے ۱۹۴۷ء میں مجلسِ شعر و ادب قائم کی۔ اثر اس مجلس کے صدر مقرر ہوئے اور معزز نائب صدر۔ اس مجلس کے ماہانہ مشاعرے اثر کے مکان پر دکشمیری محلے میں ہوا کرتے تھے۔

معزز کی شادی صادق حسین صدق لکھنوی کی بیٹی صولت آرا بیگم (عرف چینی بیگم) سے ۱۹۳۰ء

میں ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے: میرزا احمد عزیز عرف فرخ نواب سگار
لکھنوی (ولادت: ۱۹۳۱ء) اور میرزا احسن عزیز عرف شہنشاہ نواب (ولادت: ۱۹۳۵ء)۔
یہ دونوں کمسن تھے، جب مختصر علالت کے بعد جبینی بیگم مئی ۱۹۳۶ء میں اللہ کو پیاری
ہوگئیں۔ معززؔ نے عہد کیا کہ میں نکاحِ ثانی نہیں کروں گا اور ان بچوں کے لیے والد
اور والدہ دونوں ثابت ہوں گا۔ اس وقت وہ ۲۶ برس کے جوان تھے۔ لیکن انھوں
نے یہ عہد نباہا اور واقعی ان بچوں کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت میں اپنی جان
کھپا دی۔ دونوں بحمدہٖ تعالیٰ کامران و کامیاب، خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔
بڑے فرخ نواب سگار اپنے چچا ماچس مرحوم کی طرح مزاح نگار ہیں۔ اور اس
میدان میں ہر طرح قابلِ قدر۔ آج کل بمبئی میں قیام ہے۔

معززؔ مرحوم کی علالت کا سلسلہ جولائی ۱۹۷۵ء سے شروع ہوا۔ گلے کے بائیں طرف
ایک گلٹی نمودار ہوئی۔ کسی کو معاملے کی نزاکت کا احساس نہیں ہوا۔ اِدھر اُدھر
کا علاج ہوتا رہا۔ جب تکلیف کسی طرح رفع نہ ہوئی، تو لکھنؤ کے ایک مشہور ڈاکٹر
سے رجوع کیا گیا؛ انھوں نے کینسر تشخیص کیا۔ اب تگ و دو شروع ہوئی۔ بڑے
بیٹے سگار کی درخواست پر ٹاٹا میموریل اسپتال، (پریل بمبئی) میں علاج کے لیے
گئے۔ وہاں گلٹی کا آپریشن ہوا۔ لیکن معاملہ حد سے گزر چکا تھا۔ وقتی افاقہ ضرور
ہوگیا، لیکن مرض جڑ سے نہیں گیا۔ واپس لکھنؤ چلے آئے اور یہیں منگل ۲۳ نومبر
۱۹۷۶ء کی سہ پہر میں جان بحق ہوگئے۔ اسی دن رات کے نو بجے تجہیز و تکفین کے بعد
کربلائے امداد حسین خاں میں اپنے برادرِ خورد ماچس مرحوم کے پہلو میں دفن ہوئے
اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا الیہ راجعون۔ پرتو لکھنوی (تلمیذ آرزو لکھنوی) نے "تاریخِ وفات"
کہی:-

ہوئی ہے لکھنؤ کی آج بزمِ شعر سونی — مرض یہ کینسر کا جیسے پیغامِ قضا ہے
ہیں سب اس کے لیے غمگین، پرتو! — "عزیزِ قوم جو شاعر معززؔ اٹھ گیا ہے"

(۱۳۱۶)

افسوس، ان کا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ ذیل کے چند شعر ان کے صاحبزادے سگا لکھنوی نے مہیّا کیے ہیں:

اک سحر آتی ہے اور ایک سحر جاتی ہے
تیرہ بختوں کی اندھیرے میں گزر جاتی ہے

شکوہ قسمت کا، مقدّر کی شکایت نہ کرو
حسن تدبیر سے تقدیر سدھر جاتی ہے

لاکھ ملیے کفِ افسوس، پلٹنے کی نہیں
ہائے وہ عمر جو غفلت میں گزر جاتی ہے

ایک پرتَو حسن کا ہے، ایک پرتَو عشق کا
شمع ان کو دیکھتی ہے اور پروانہ مجھے

تحسین سروری، میر کاظم علی

ان کے خاندان کا حیدر آباد (دکن) کے اچھے خاصے زمینداروں میں شمار تھا! کچھ موروثی جاگیر بھی تھی۔ لیکن اس کا بہت بڑا حصّہ تحسین کے والد میر سرور علی سے پہلے ہی خالصے تک جا چکا تھا۔ کچھ معمولی رقبہ بچا تھا، جسے وہ سینے سے لگائے رہے؛ اور کسب معاش کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ تحسین اپنی خاندانی جاداد ہی پر ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو ایک مضافاتی گاؤں قطب اللہ پور کے پرائیوٹ اسکول میں بھیج دیے گئے، جہاں تلگو کے سوا اور کچھ پڑھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ پرائمری کے درجوں کے بعد بلدے آگئے، اور یہاں دسویں کی سند لی۔ اسی زمانے میں والد کا انتقال ہو گیا، جس سے نہ صرف آیندہ اعلیٰ تعلیم کا خواب منتشر ہو گیا، بلکہ اب شرکا نے آبائی جاداد کے بارے میں بھی مقدمہ بازی شروع کر دی۔ کئی برس اسی میں ضائع ہو گئے، اور مالی زیر باری اس پر مستزاد۔ جب اس مخمصے سے نجات ملی اور سانس لینے کے قابل ہوئے، تو انھوں نے ادیب فاضل (اردو) اور منشی (فارسی) کے امتحانات پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیے۔

گھر کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ دن تک کچھ کمانے کی فکر سے بے نیاز رہ سکتے۔ اولاً نظام شوگر فیکٹری میں ملازمت ملی۔ لیکن محض کلرکی ان کے بس کی بات نہیں تھی؛ مزاج ادبی ڈھب کا تھا۔ اس لیے جلد ہی وہاں سے علیحدگی اختیار کر لی اور دکن نیوز سروس میں ملازم ہو گئے۔ اسی زمانے میں ہفت روزہ "آزاد" اور "دور جدید" کے ادارۂ تحریر سے بھی تعلق پیدا کر لیا۔ یہاں سے ایک قدم آگے بڑھے، تو دکن ریڈیو

ماخذ: خود نوشت حالات مطبوعہ قومی زبان، کراچی؛ حیدر آباد کے شاعر (۲)

کے پراپگنڈہ سیکشن میں مسودہ نگار کی اسامی مل گئی۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت نظمیں لکھیں، جو روزانہ ریڈیو سے نشر ہوتی تھیں۔ حیدر آباد کا پولیس ایکشن اسی زمانے میں ہوا۔ ریاست کے ہندستان میں شامل ہو جانے کے بعد وہ جنوری ۱۹۴۹ء میں بمبئی کے راستے جہاز سے کراچی چلے گئے۔

کراچی میں بھی اولاً ریڈیو ہی میں ملازمت ملی۔ یہاں مسودے (اسکرپٹ) لکھنے اور گانے والوں (اور والیوں) کو صحیح تلفّظ سے کلام پڑھانے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ دو سال بعد اپریل ۱۹۵۱ء میں وہ انجمن ترقی اُردو میں ملازم ہوگئے۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے، جس نے انھیں شاعر سے نثر نگار بنا دیا۔ یہاں انھیں مولوی عبدالحق (ف: اگست ۱۹۶۱ء) اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی (ف: اگست ۱۹۵۵ء) کی صحبت میسّر آئی۔ دونوں جس پایے کے ادیب اور ادیب گر تھے، وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحسین نے شاعری ترک کر دی، اور تحقیقی مضامین لکھنے لگے، مطالعے کا دامن بھی وسیع تر ہوگیا۔

پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں اعزّہ و احباب سے ملنے حیدر آباد آئے تھے۔ پانچ مہینے یہاں ٹھہرے اور واپس کراچی چلے گئے۔ دوسری مرتبہ جنوری ۱۹۵۹ء میں آئے۔ اب کے کچھ ایسا پیچ پڑا کہ وہ واپس نہ جا سکے؛ ڈھائی سال تک یہاں سے نکلنے کی صورت نہ بن سکی، بلکہ ان پر حکومتِ ہند کی طرف سے غیر قانونی اقامت کے جرم میں مقدمہ چلا، اور چار مہینے قید کی سزا بھگتنا پڑی۔ خدا خدا کر کے کہیں اگست ۱۹۶۱ء میں واپس جانا نصیب ہوا۔

اب کے کراچی میں کہیں جم کر کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ رسالوں میں مضمون نگاری سے کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ آخر گلڈ کے ماہنامے "ہم قلم" میں جگہ ملی؛ ساتھ ہی انجمن ترقی اُردو میں بھی جز وقتی کام مل گیا۔ بہت دن بعد وہ انجمن کے شعبۂ مطبوعات سے مستقلاً وابستہ ہوگئے۔

انھیں مدّت سے تنفّس کا عارضہ تھا۔ کثرتِ کار اور مالی بے اطمینانی کے باعث کبھی یکسوئی

سے علاج نہ کرا سکے۔ اسی میں اچانک منگل ۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کو راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ ان کی شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا یادگار ہیں۔ افسر امروہوی نے ہجری میں تاریخ کہی۔ "بسوئے خیاباں رفت تحسین" آہ (۱۳۹۶ھ)
عیسوی تاریخ بھی انھیں کی کہی ہوئی ہے:

کس درجہ خوش نصیب ہیں تحسین سروری — پائی وفات حج کے مہینے میں ایک بیک
افسر نے عیسوی میں کہا مصرعِ وفات — "جنت نشیں لبیب ہیں تحسین سروری" (۱۹۷۶)

جب تک حیدر آباد میں رہے، ان کا شمار وہاں کے خوش گو نوجوان شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کے خاندان میں شعر و سخن کا چرچا تھا، اسی لیے انھیں بھی شعر کہنے کی تحریک ہوئی۔ تحسین تخلص رکھا، اور رشیدے تحسین حیدر آبادی کے نام سے لکھتے رہے۔ بعد کو تخلص کے ساتھ کوئی دُم چھلّا لگانے کا خیال آیا، تو اپنے والد (میر سرور علی) کے نام کی رعایت سے تحسین سروری ہو گئے۔ انھوں نے کلام پر شوکت بلگرامی (تلمیذ امیر مینائی) کے ایک شاگردِ رشید سے اصلاح لی تھی۔

کراچی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے بعض پرانی کتابیں مرتب کر کے شائع کی تھیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:
مسدسِ رنگین (سعادت یار خان)؛ چند ہم عصر (مولوی عبدالحق)؛ نادر نامۂ غالب؛ معراج العاشقین (گیسو دراز)؛ پری خانہ (واجد علی شاہ)۔ مضامین کی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہے۔

ان کے کلام کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گزرا؛ غالباً شائع ہی نہیں ہوا۔ مندرجۂ ذیل چند شعر حیدر آباد کے شاعر (جلد دوم) سے لیے گئے ہیں:

گزر رہے ہیں کسی کی گلی سے ہم ہو کے — نہ دیر راہ میں آئے، نہ اب حرم رو کے
ہمارے چاک گریباں پہ کوئی کیوں ٹوکے — اگر چمن میں ہمارا نہیں ہے دخل کوئی
تمھاری بزم سے جاتا ہے جو بھی دل کھو کے — پھر اس کا کوئی پتا دور تک نہیں ملتا

کھو گئی ہے کہیں نظر اب تو
ہو گئے خود سے بے خبر اب تو
شورشِ انتظار ختم ہوئی
چپ ہے ہر ایک رہگزر اب تو
دیر و کعبہ نہیں ہے یہ نہ کہیں!
ان کا در ہے، جھکا دو سر اب تو

ہماری چاک دامانی نہ دیکھو
کبھی آباد تھا ویرانہ ہم سے

چاک جیب و دامن ہی، حاصلِ جنوں کب ہے
دل بھی چاک ہوتا ہے، اس کو کوئی کیا جانے

ماضی و حال

نظامِ زندگی برہم جو پہلے تھا، سو اب بھی ہے
وہی رنگِ رخِ عالم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
وہی اترے ہوئے چہرے، وہی ویران سی نظریں
دلوں کا زخم بے مرہم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
وہی سوئی ہوئی محفل، وہی بجھتی ہوئی شمعیں
لبوں پہ نالہ، ماتم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
نہ جانے سلسلے ٹوٹے ہیں کتنے شادمانی کے
مگر وہ اک غمِ پیہم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
وہی انداز ہیں اب تک، فریبِ دلربائی کے
وہی زلفوں کا پیچ و خم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
ابھی تک امتیازِ خار و گل کا ہے جنوں طاری
تضادِ شعلہ و شبنم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
ابھی مفلوج ہاتھوں میں توانائی نہیں آئی
حقیقت کا نگوں پرچم، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

عبدالماجد دریابادی، مولانا

دریاباد اتر پردیش کا مشہور اور قدیم قصبہ، لکھنؤ سے فیض آباد جانے والی ریلوے لائن پر ان دونوں کے عین وسط میں کوئی ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قصبہ غالباً پندرھویں صدی میں شاہانِ شرقی کے ایک صوبیدار دریا خاں نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ اسلامی دور کے بعد مدتوں انگریزی عہد میں بھی دریاباد ضلع کا صدر مقام رہا۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بہت مضر تھی۔ شہر نشیب میں واقع تھا، اس لیے برسات کے موسم میں یہاں ہر طرف بہت پانی جمع ہو جاتا، جس سے بعد کو ملیریا وبائی شکل میں پھیل جاتا۔ انگریزوں نے اولاً ضلع کا صدر مقام نواب گنج بنایا اور بعد کو ضلع بھی بارہ بنکی قرار دے دیا۔ اور یوں دریاباد کی حیثیت محض ایک قصبے کی سی رہ گئی۔

دریا خاں نے جب یہ قصبہ آباد کیا، تو اسی کے ساتھ اس نے ایک عارف کامل حضرت شیخ محمد کو اس جگہ کے قریبی قصبے محمود آباد سے یہاں آنے کی دعوت دی۔ حضرت شیخ صاحب کشف و کرامات تھے، ان کے حالات متعدد تذکروں میں محفوظ ہیں۔ چونکہ وہ بالعموم کنؤیں سے پانی بھر بھر کر لوگوں کو پلاتے رہتے اور نمازیوں کو وضو کراتے تھے، اس سے ان کا لقب "مخدوم آبکش" پڑ گیا۔ ان کا انتقال ۱۴۸۸ء میں ہوا؛ "آفتاب کشف" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ یہی مخدوم آبکش، مولانا عبدالماجد دریابادی کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ان کا مزار بھی مولانا دریابادی کے جدی مکان کے متصل موجود ہے۔ ان کے خاندان کے افراد کو "مخدوم زادگان" بھی انھیں کی نسبت سے کہتے ہیں۔

ماخذ: تاریخ دریاباد (دھوکن لال)؛ ماہنامہ فروغِ اردو (عبدالماجد دریابادی نمبر)، لکھنؤ؛ آپ بیتی از مولانا عبدالماجد دریابادی؛ حکیم عبدالقوی دریابادی۔

۱۸۵۷ء کے مشہور فوجی ہنگامے میں شمالی ہندستان کے متعدد علما بھی معتوب ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے جہاد کا فتویٰ دے کر افواج اور عوام کو حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔ انھیں علماء میں مولانا مفتی مظہر کریم (بن مولوی غلام بخش) بھی تھے۔ انھیں بھی نو سال کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ وہاں مولانا فضل حق خیر آبادی اور قاضی عنایت احمد (مصنف تواریخ حبیب الٰہ) اور بعض دوسرے علما پہلے سے موجود تھے۔ ایک سے ایک بڑا عالم اور صاحبِ قلم۔ مفتی مظہر کریم نے اس جلا وطنی کے زمانے میں عربی کی کتاب جغرافیا "مراصد الاطلاع" کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ وہ وہاں حکومت کے دفتر میں (بطور مشقت) کچھ محرری کا کام بھی کرتے تھے، اس "خوش اطواری" کے جلد ہی قید کی میعاد میں کچھ تخفیف ہوگئی اور انھیں پونے سات برس بعد رہا کر دیا گیا۔ ۱۸۶۵ء میں جزیرۂ انڈمان سے وطن واپس آئے۔ یہی مفتی مظہر کریم، مولانا عبدالماجد دریابادی کے دادا تھے۔ ان کا ۱۰ شعبان ۱۲۸۹ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۷۲ء) کو انتقال ہوا۔ "دخل جنات النعیم" سے ہجری تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ان سے بڑے بھائی مولوی حکیم نور کریم تھے، جو اپنے عہد کے مشہور حکیم اور "طبیب گر" تھے۔ طب کے علاوہ ادب میں بھی کئی مشہور اشخاص ان کے شاگرد ہوئے۔ مثلاً عماد الملک سید حسین بلگرامی، شمس العلما سید علی بلگرامی وغیرہ۔ وہ خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ کئی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان میں سے بہت سی ان کے خاندان میں آج تک موجود ہیں۔ وہ جمعہ ۶ رجب ۱۲۸۸ھ (۲۲ ستمبر ۱۸۷۱ء) کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نانا بھی تھے۔

منجھلے بھائی حافظ مرتضیٰ کریم بڑے عالی ہمت بزرگ تھے۔ ان کی خوشنویسی کا خاص طور پر شہرہ تھا۔ روایت ہے کہ وہ حج کے سفر پر روانہ ہوئے۔ بمبئی پہنچے، تو خدمتگار نے مال و متاع کے لالچ میں انھیں زہر دے دیا اور جو کچھ ہاتھ لگا اسے لے کر چمپت ہوگیا۔ بارے ان کی جان بچ گئی۔ لیکن اس قلاشی کے عالم میں بھی ہمت نہیں ہارے۔ وطن واپس آنے کی بجائے وہیں بمبئی میں معلمی کر لی، اور دو تین برس میں زادِ راہ فراہم کر کے

پھر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ غرض بڑے عالی حوصلہ اور صاحبِ عزم انسان تھے۔ ل
سب سے چھوٹے بھائی کرم کریم عرف چھیدا میاں تھے۔ وہ خاندانی زمینداری کی دیکھ بھال
کرتے تھے۔ ان کا انتقال ۳ دسمبر ۱۸۷۹ء کو ہوا۔ دریا بادہی میں مدفون ہے۔
مفتی منظر کریم کے دو صاحبزادے ہوئے؛ بڑے عبد الرحیم، چھوٹے عبد القادر۔ عبد الرحیم
بڑے ہر فن مولا شخص تھے۔ پیشے کے لحاظ سے جون پور کلکٹری میں نقل نویس تھے لیکن
اس کے علاوہ فارسی کے ادیب اور اردو کے مزاح نگار بھی تھے، کاغذ کے بیل بوٹے
بڑے خوبصورت بناتے تھے، پھول قینچی سے تراش کر بناتے۔ بڑے مخیر بزرگ تھے
اپنے خرچ سے دوائیں تیار کر کے مفت تقسیم کرتے۔ آخر عمر میں نوکری سے مستعفی ہو
کر وطن آ گئے اور آبائی زمینداری پر بسر اوقات کرنے لگے۔ وہیں دسمبر ۱۸۹۷ء میں
انتقال ہوا۔
چھوٹے عبد القادر اس سلسلۃ الذہب میں بھی نمایاں حیثیت کے مالک ہوئے۔ اپنی دل و
دماغ کی خوبیوں کے باعث وہ ایک مستقل سوانح عمری کے مستحق ہیں۔ مئی ۱۸۴۸ء میں دریا باد
میں پیدا ہوئے تھے۔ مختلف علماء فرنگی محل سے تکمیلِ تعلیم کے بعد انگریزی پرائیوٹ
طور پر پڑھی اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس پیشے میں جھوٹ بولنے
سے مفر نہیں، تو اسے اختیار کرنے سے انکار کر دیا، اور عربی فارسی پڑھانے کو ترجیح
دی۔ بعض انگریزی حکام بھی ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ انھیں صاحبِ اثر تلامذہ
میں سے ایک قدردان افسر نے خوش ہو کر انھیں سررشتہ دارِ عدالت مقرر کرا دیا۔ آدمی
تھے ذہین اور محنتی، اس پر بحد فرض شناس اور دیانت دار، حکامِ اعلیٰ نے جوہرِ قابل
دیکھا، تو انھیں ترقی دے کر تحصیلدار بنا دیا۔ اور ترقی ہوئی، تو ڈپٹی کلکٹر مقرر
ہو گئے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں کسی ہندستانی کے لیے گویا معراجِ کمال کے مرادف
تھا۔ بڑی عزت و آبرو سے زمانۂ ملازمت بسر ہوا۔ پانسو روپے ماہانہ پنشن پر ۱۹۰۴ء
میں سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ فریضۂ حج ادا
کرنے کے لیے ارضِ حجاز کی راہ لی۔ ۱۱ ذی الحجہ (۱۳۳۰ھ) کی شام منیٰ میں ہیضہ میں

مبتلا ہوئے اور تین دن بعد (۱۴ ذی الحجہ / ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء) عین صبح صادق کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مکّہ معظمہ کے مشہور قبرستان "جنت المعلّیٰ" میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق کی پائینتی آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے دیرینہ دوست اکبر الہ آبادی نے قطعۂ تاریخ کہا:

پیشوائے قوم، والا مرتبت — شیخ عبدالقادر عالی صفات
آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے وہ — سمجھے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جاہ و منصب میں وہ گو ممتاز تھے — کرتے تھے یادِ خدا، دن ہو کہ رات
ان کے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر — "شغل" ہی میں نکلی تاریخِ وفات

ڈپٹی عبدالقادر کا نکاح اپنے بڑے چچا مولوی حکیم نور کریم کی صاحبزادی نصیر النسا کے ساتھ ہوا تھا (وفات: اپریل ۱۹۴۱ء) اولاد میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے، بڑے عبدالمجید ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کی سند لی اور اس کے بعد نائب تحصیلداری سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۹۲۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ یو پی کے متعدد اضلاع میں نیکنامی سے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں پنشن پائی، اور ۱۹ دسمبر ۱۹۶۰ء کو واصل بحق ہوئے۔

مرحوم کو اپنی خاندانی روایت کے مطابق ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ انگریزی عہد میں حکومت ہر سال کی کارگزاری کے کوائف میں ایک انگریزی کتاب بعنوان "انڈیا" نشر کیا کرتی تھی۔ اس کا ترجمہ منجملہ اور زبانوں کے اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی دو سال کی جلدوں کا اردو ترجمہ انھیں عبدالمجید نے کیا تھا۔

ڈپٹی عبدالقادر کے چھوٹے بیٹے عبدالماجد تھے، جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سے دور و نزدیک ایسے مشہور ہوئے، کہ "مولانا دریابادی" گویا ان کا علَم ہو گیا۔ ان کی ولادت وسط مارچ ۱۸۹۲ء[۵] میں دریاباد میں ہوئی۔ عام دستورِ خاندان پانچویں برس

---

۵ ہجری تقویم کی رو سے شعبان ۱۳۰۹ھ تھا۔ وہ خود تاریخ کبھی ۱۵ کبھی ۱۶ اور کبھی ۱۷ لکھتے رہے؛ آخری مرتبہ ۱۶ لکھی تھی۔ حسنِ اتفاق سے یکم مارچ بھی یکم شعبان کو تھی۔

کی بسم اللہ کا تھا، لیکن طے پایا کہ ان کی بسم اللہ چوتھے برس ہی کر دی جائے۔ یہ ۱۸۹۵ء کی بات ہے ان کے والد ڈپٹی عبد القادر اس زمانے میں ضلع لکھیم پور کھیری میں تعینات تھے۔ وہیں یہ تقریب عمل میں آئی۔ اس کا واقعہ انھوں نے خود ایک جگہ بیان کیا۔ لکھتے ہیں:

ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی اور وطن کے ایک خوش اوقات و خوش صفات عالم صاحب جو بھائی صاحب (عبد المجید) کی اتالیقی پر مامور تھے، وہ زنانہ مکان کے صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے۔ مٹھائی کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں نوکروں چاکروں کا گروہ حلقہ جمائے ہوئے۔ مولوی صاحب بیچارے نے پیار اور شفقت کے لہجے میں کہا کہ کہو بسم اللہ۔ یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔ سب نے اپنی والی سمجھائی بجھائی۔ لیکن اس ضدی یا شرمیلے لڑکے کی زبان پر بدستور قفل لگا ہوا تھا۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا، اور کب تک نہ آتا، سمجھانے بجھانے، اور چمکارنے کی حد ہو چکی تھی۔ چھڑی ہاتھ میں لے، انھوں نے جانا شروع کر دی۔ لوگوں نے بائیں بائیں کر کے کسی طرح جان بچائی۔ چلمنوں کی آڑ سے والدہ و ہمشیرہ یہ دردناک تماشا دیکھ رہی تھیں۔ خیر، اندر بلایا، سمجھایا، آخر میں جو میری کھلائی تھیں، ان لُوا بچاری نے کہا: میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا نہیں آتا؟ لڑکے نے کہا: آتا کیوں نہیں! اور بس ان کے ساتھ جا، مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے انھیں کڑاک کر سنا آیا۔ اُداسی خوشی سے بدلی، چہروں پر ہنسی اور مسکراہٹ آئی۔ اسی کو کہتے ہیں: ٹیڑھا لگا ہے قط قلم نوشت کو۔

حسب رواج تعلیم نجی طور پر ہونے لگی اور یہ زیادہ تر فارسی اور عربی تک محدود رہی؛ اُردو کی حیثیت محض ذیلی تھی۔ جب ناظرہ قرآن ختم کر لیا اور عربی فارسی میں بھی چل نکلے تو ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخلہ لے لیا۔ عربی کا اصلی اور دیرپا شوق یہیں کے ایک معلّم مرزا محمد ذکی مرحوم کے ہمّت بڑھانے سے پیدا ہوا۔ اس کے بعد پختگی مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی کی شاگردی میں پیدا ہوئی۔

تعلیمی دَور یوں تو ٹھیک رہا اور سب درجوں میں کامیاب بھی ہوتے رہے، لیکن ریاضی (حساب) میں کمزور تھے۔ بہرحال ۱۹۰۸ء میں دسویں کی سند ملی اور اسی سال کیننگ کالج، لکھنؤ میں داخلہ ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں بی، اے کی سند دوسرے درجے میں ملی اور اب ایم، اے (فلسفہ) کی تیاری ہونے لگی۔ علی گڑھ کالج پہنچے۔ پہلے سال کا امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے دیا (علی گڑھ میں ہنوز یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی، اور یہاں کے طلبہ الٰہ آباد جا کر امتحان میں بیٹھتے تھے) بدقسمتی سے امتحان میں ناکام رہے۔ اس کے بعد دلّی کے سان سٹیفنس کالج میں داخل ہوئے کہ یہاں سے ایم، اے کریں گے۔
نومبر ۱۹۱۲ء میں والد کا انتقال ہو گیا اور یوں خاندان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ جاتا رہا۔ تھوڑا بہت جو پس انداز ہوا تھا، وہ پیپلز بنک (لاہور) میں جمع تھا۔ بدقسمتی سے یہ بنک ٹوٹ گیا اور یوں ان کی ساری پونجی اس میں ڈوب گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد تعلیم کے جاری رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یوں بھی انھیں دلّی کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ لکھنؤ کی صحبتیں اور یادیں نیند حرام کیے ہوئے تھیں۔ بنک کا ٹوٹنا گویا ادھ گھٹتے کو ٹھیلتے کا بہانا ہو گیا، یہ تعلیم کو خیرباد کہہ کر وطن آ گئے۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔
بارے، مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو (ف: اگست ۱۹۶۱ء) نے دستگیری کی، انھوں نے بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے کا کام دے دیا۔ "تاریخ اخلاق یورپ (ترجمۂ لیکی) اسی عہد کی کتاب ہے۔" فلسفۂ جذبات" اور" فلسفۂ اجتماع" بھی انھی زمانے میں تالیف کیں۔ یہی زمانہ ہے، جب مولانا شبلی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۱۴ء) نے سیرۃ النبی کی تالیف کی داغ بیل ڈالی۔ سیرت پر انگریزی میں جو ذخیرہ ہے، اسے کھنگالنے اور اس میں سے متعلقہ مقامات کے اخذ و ترجمہ کا کام انھوں نے عبدالماجد صاحب کے سپرد کیا، اور اس کے لیے پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر دیا۔ غرض اس طرح کام چل نکلا اور یہ بیکاری کی کوفت سے بچ گئے۔
۱۹۱۶ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) نے جو اس زمانے میں

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکتر تھے، انھیں بطور ادبی معاون علی گڑھ طلب کرلیا، ۷۵ روپے مشاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن کسی وجہ سے ان کا دل یہاں بھی نہ لگا۔ وہ دو ہی مہینے میں خرابیِ صحت کے بہانے سے مستعفی ہو گئے۔
۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کی اسکیم مقرر ہو گئی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ یونیورسٹی کے مختلف درجوں میں پڑھانے کے لیے نصاب تیار کیا جائے۔ لامحالہ اس میں سوال اٹھا کہ انگریزی کتابوں سے ترجمہ کیا جائے کیونکہ اردو میں تو کتابیں تھیں ہی نہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق مرحوم کی نظامت میں دارالترجمہ قائم ہوا۔ مولانا عبدالماجد کی ان سے پرانی یاد اللہ تھی۔ انھوں نے تین سو ماہانہ تنخواہ پر انھیں دارالترجمہ میں مترجم فلسفہ مقرر کر دیا، اور یہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو حیدرآباد پہنچ گئے۔
ان کا یہ دور مذہبی پہلو سے بقول خود ان کے الحاد وارتداد کا تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں کالج میں داخلہ لیا تھا۔ یہاں ان کے دل پسند مضمون فلسفہ اور منطق اور نفسیات تھے۔ چونکہ ان مضامین کا بیشتر ذخیرہ انگریزی میں ہے، لہٰذا انگریزی کتب کا وسیع مطالعہ ناگزیر تھا۔ ان موضوعات کے بارے میں جو معلومات مہیا ہوئی ہوں اور ان میں جو مہارت پیدا ہوئی ہو، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کا ایک مخفی اور غیر محسوس اثر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ مذہب سے برگشتہ ہو گئے اور اپنے آپ کو فخریہ "لاادری" اور "عقلیت پسند" کہنے لگے؛ اسلام بھی بس برائے نام رہ گیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے "فلسفۂ اجتماع" تالیف کی تھی، جس میں اسلام اور شارعِ اسلام کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا، جو کسی صحیح العقیدہ مسلمان کا اعتقاد نہیں ہو سکتا۔
جب یہ حیدرآباد پہنچے، تو وہاں کی ریاستی فضا میں یوں بھی "بیرونیوں" کے خلاف جذبہ تو موجود تھا ہی، ان کی بیباک گفتگو نے لوگوں کو اور بھی ان سے بدظن کر دیا۔ رہی سہی کسر "فلسفۂ اجتماع" نے پوری کر دی۔ ان کے مخالفین نے محاذ قائم کر کے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حیدرآباد میں رہنا محال ہو گیا، تو جولائی ۱۹۱۸ء میں رخصت پر وطن آئے اور یہاں سے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔
لیکن بیکار تو نہیں رہ سکتے تھے۔ مختصر قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں ان کے منجملہ اور

عمائد کے سر امین جنگ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ حضور نظام کے صدر المہام پیشی (یعنی چیف سکرٹری) کے عہدے پر فائز تھے اور انگریزی کا سارا کام ان کے ہاتھ میں تھا۔ جب ۸ - ۱۰ مہینے تک اور کہیں روزگار کی صورت پیدا نہ ہوئی، تو انھوں نے "گزارش احوال واقعی" کے طور پر انھیں لکھا کہ کسی مناسب موقع پر حضور نظام کی توجہ مبذول کرائیں، تاکہ زندگی آسان ہو سکے۔ چند ہفتے بعد سر امین جنگ کا تار ملا کہ حضور نے طلب فرمایا ہے، چلے آئیے۔ یہ پہنچے تو باریابی ہوئی۔ حضور نظام نے فرمان جاری فرمایا کہ حین حیات سو اسو ماہانہ کی پنشن منظور کی جاتی ہے؛ حیدرآباد کے قیام کی کوئی شرط نہیں، جہاں جی چاہے، رہیں؛ البتہ آیندہ اپنی تصنیفات کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کریں۔ امین الملک سر میرزا محمد اسمٰعیل کی مدار المہامی کے زمانے میں (۱۹۴۲ء)، ہوشیار جنگ بلگرامی (ف: دسمبر ۱۹۵۵ء) کی سفارش پر یہ پنشن بڑھا کر دو سو ماہانہ کر دی گئی۔ جب ۱۹۴۸ء میں ریاست کا جمہوریۂ ہند سے انضمام ہوا، تو یہ بند ہو گئی۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) اور پنڈت جواہر لال نہرو (ف: مئی ۱۹۶۴ء) کی ذاتی مداخلت پر دوبارہ جاری ہوئی، لیکن وہی ابتدائی رقم سو اسو کی۔ اس کے بعد یہ ان کی وفات تک انھیں لکھنؤ کے خزانے سے ملتی رہی۔

ان کا دور الحاد ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک رہا تھا۔ اس زمانے میں وہ مسٹر عبدالماجد بی اے اور مغربی فلسفے کے ماہر کہلانے پر فخر کرتے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے ہندو فلسفے اور یوگ کا مطالعہ شروع کیا۔ بنارس کے مشہور فاضل ڈاکٹر بھگوان داس (ف: ستمبر ۱۹۵۸ء) سے ملاقات اور ان کی تصانیف کے مطالعے نے خیالات کا رخ بدلا۔ والد کے دوست اور خود ان کے بزرگ اکبر الہ آبادی (ف: ستمبر ۱۹۲۱ء) بلطائف الحیل ان کی گمرہی پر ٹوکتے ہی رہتے تھے۔ مولانا محمد علی (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) سے انھیں عشق تھا؛ وہ بھی ڈانٹ ڈپٹ سے گریز نہیں کرتے تھے۔ غرض زمین آہستہ آہستہ تیار ہو رہی تھی کہ کہیں مولانا محمد علی لاہوری احمدی (ف: اکتوبر ۱۹۵۱ء) کا انگریزی ترجمۂ قرآن ان کی نظر سے گزرا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بحمدہٖ الحاد کے بادل

چھٹ گئے۔ ۱۹۲۰۔ ۱۹۲۱ء کے دو سال گویا ایمانی برزخ کا زمانہ تھا۔ اب وہ دوبارہ مسلمان ہو گئے۔ پھر تو اسلام کی بڑی خدمت کی۔ قرآن کے دو دو ترجمے اور تفسیریں (اردو اور انگریزی)، تصوف اسلام؛ بشریت انبیاء؛ سیرۂ نبوی قرآنی؛ حیوانات قرآنی؛ شخصیات قرآنی؛ مشکلات قرآن ان سے یادگار رہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہفتہ وار سچ یا صدق یا صدقِ جدید بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

اس "دوبارہ" مشرف باسلام ہونے کا ان پر جو ردِ عمل ہوا، وہ انھیں دوسرے سرے پر لے گیا۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہو سکتا ہے:

بچپن میں انھوں نے اپنے بازو پر نام گُدوایا تھا۔ اب جو اسلامی رنگ چڑھا، اور مطالعۂ اسلام بڑھا، تو ان کی نظر سے وہ حدیث گزری، جس میں حضور شارع اسلام علیہ السلام نے گودنے اور گُدوانے والے پر ناراضی کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ پڑھنا تھا کہ انھوں نے فوراً بازو کے اتنے حصے کی جلد کٹوا دی، جہاں وہ نام لکھا تھا۔ اس سے کتنی اذیت پہنچی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے بطیبِ خاطر برداشت کر گئے۔ شعائرِ اسلام کے احترام کے علاوہ، اس سے ان کی قوتِ ارادی کا بھی غیر معمولی مظاہرہ ہوتا ہے۔

۱۹۲۸ء میں وہ حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی (ف: جولائی ۱۹۴۳ء) کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی درخواست کی۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ مولانا حسین احمدؒ مدنی (ف: دسمبر ۱۹۵۷ء) سے بیعت کر لیجیے۔ تعمیلِ ارشاد میں انھوں نے حضرت مدنی کی بیعت تو کر لی، لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ انھیں قلبی تعلق حضرت تھانوی ہی سے تھا اور جو کچھ کسبِ فیض انھوں نے کیا، وہ بھی انھیں کی ذات سے۔ اس پر ان کی کتاب "حکیم الامت: نقوش و تاثرات" شاہدِ عادل ہے۔

صحت ساری عمر درمیانے درجے کی رہی، نہ بہت اچھی نہ بُری۔ جمعہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو اچانک بعد مغرب جسم کے سیدھے حصے پر فالج کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن نہ صرف بنیادی تکلیف رفع نہیں ہوئی، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس حال میں بھی اپنے معمولات نباہنے کی کوشش جاری رکھی۔ دو ڈھائی سال اسی طور گزرے۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔ بدقسمتی سے وسط اکتوبر ۱۹۷۶ء میں دوسرا حادثہ پیش آیا کہ رات کے وقت لغزش پا سے گر گئے، جس سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ابھی پلاسٹر کھلا بھی نہیں تھا کہ وسطِ دسمبر (۱۹۷۶ء) میں فالج کا دوسرا حملہ ہوا، جس سے زبان اور دماغ دونوں بری طرح متاثر ہوئے۔ اب وہ گویا جسد بے جان ہو کے رہ گئے تھے، بیشتر وقت غفلت طاری رہتی۔ جمعرات ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کی شب میں (دو بجے) طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور دو گھنٹے بعد سوا چار بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق بعد نماز ظہر دار العلوم ندوۃ العلماء کے میدان میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے پڑھائی۔ لاش لاری کے ذریعے ان کے وطن دریاباد (ضلع بارہ بنکی) گئی۔ یہاں دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ شب جمعہ ذاتی مکان کے متصل اپنے جدِ اعلیٰ حضرت مخدوم محمد آبکش کے پہلو میں اُلٹے ہاتھ دفن ہوئے۔ یہی ان کی خواہش تھی۔

متعدد احباب نے تاریخ کہی۔ میر غلام رسول نازکی (سرینگر) نے آیۂ قرآن (دو رفعنا لک ذکرک) سے ہجری تاریخ نکالی (۱۳۹۷ھ)۔ اس میں بعض اور اصحاب کو بھی توارد ہوا۔ مغیث الدین فریدی نے قطعہ کہا:

تاریخ رحلت بے ہنگام

(۱۹۷۷)

مُحبِ اسلام حضرت عبد الماجد دریابادی

(۱۹۷۷)

عالم دیں، مفسّر قرآں	مردِ حق، محرمِ رموزِ حیات
اپنے خالق سے جا ملا آخر	چھوڑ کر یہ جہانِ مکروہات
بے کم و بیش" ہے یہی تاریخ	"پاک دل، پاک ذات، پاک صفات"
۳۷۸	(۱۹۷۷ = ۳۷۸ : ۱۳۹۷)

اُس زمانے کے دستور کے مطابق اُن کی نسبت بھی بچپن میں والدہ نے ان سے استصواب

کیے بغیر خاندان کی کسی لڑکی سے طے کر رکھی تھی۔ جب کالج کے زمانے میں ان پر انگریزیت اور صاحبیت کا غلبہ ہوا، تو انھیں خیال گزرا کہ اگر کہیں اس دیہاتی لڑکی سے شادی ہو گئی، تو زندگی اجیرن ہو جائیگی، جو نہ انگریزی سے واقف، نہ شہر کی بول چال اور رہن سہن سے آشنا؛ اس کے ساتھ کیسے کٹیگی! اُنھوں نے اپنا عندیہ والدہ کے کان تک پہنچا دیا۔ وہ بیچاری پرانے زمانے کی وضعدار قسم کی خاتون۔ دھک سے رہ گئیں کہ اب میں لڑکی کی والدہ کو منھ کیونکر دکھاؤنگی! اس سے بھی بڑھکر انھیں شبہہ گزرا کہ صاحبزادے کسی کرسٹان لڑکی کے جال میں پھنس گئے ہیں، اور نہیں معلوم اب کیا گل کھلاتے ہیں! بارے، خدانے اپنی حفظ وامان میں رکھا۔ انھیں ایام میں انھوں نے کہیں کسی تقریب میں اپنی حقیقی خالہ کی پوتی کو دیکھ لیا۔ لڑکی پڑھی لکھی، شہری معاشرت سے خوب واقف، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اسے دیکھنا تھا، کہ یہ جی جان سے اس پر فدا ہو گئے۔ کسی طرح والدہ سے بھی کہلوا دیا۔ انھوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ بہت خوش ہوئیں، اور فوراً اپنی منظوری دے دی۔ یہ لڑکی باندے کے رئیس شیخ یوسف الزمان آنریری مجسٹریٹ کی صاحبزادی تھیں؛ اس کے بھائی شیخ مسعود الزمان بیرسٹر کالج کے دور میں دو برس تک مولانا عبدالماجد کے ہمجماعت بھی رہے تھے۔ ان کا نام عفت النسا تھا۔ غرض ہجر کی راتیں جلد کٹ گئیں اور رہم جون ١٩١٦ءکو بڑی دھوم دھام سے لکھنؤ میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ زندگی بہت اطمینان اور آرام و آسائش سے گزری۔ ان کا ۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو باندہ میں انتقال ہوا۔

ان سے کئی بچے ہوئے، لیکن مشیتِ ایزدی سے صرف چار بیٹیاں زندہ رہیں: رافت النسا؛ حمیرہ خاتون؛ زہیرا خاتون؛ زاہدہ خاتون۔ یہ چاروں علی الترتیب مولانا عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید مرحوم کے چاروں صاحبزادوں، حکیم عبدالقوی (عرف آفتاب احمد)، حبیب احمد ایم اے؛ محمد ہاشم قدوائی ایم اے، پی، ایچ، ڈی، ریڈر شعبۂ سیاسیات علیگڈھ مسلم یونیورسٹی؛ اور عبدالعلیم قدوائی ایم اے، ایل ایل بی کے عقدِ نکاح میں آئیں۔

سب بفضلہ خوش و خرم ہیں۔
مولانا عبدالماجد نے ۱۹۳۰ء میں ایک جوان سال مرحوم دوست عبدالرحمٰن نگرامی (ف: ۶ مارچ ۱۹۲۶ء) کی صاحب اولاد بیوہ سے نکاحِ ثانی بھی کیا تھا۔ لیکن اس خاتون سے نبھ نہ سکی، گھر میں بدمزگی رہنے لگی تھی۔ اس لیے مجبوراً چند ماہ بعد جون ۱۹۳۱ء میں اسے طلاق دے دی۔ اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔
مولانا دریابادی کی پوری عمر لکھنے پڑھنے میں گزری۔ آغاز قدرتاً پڑھنے سے ہوا۔ شروع میں اچھے بُرے کی تمیز تو تھی نہیں، جو رطب و یابس ہاتھ لگا، بس پڑھ لیا۔ آٹھویں درجے میں تھے کہ عیسائیوں کے بعض اعتراضات کے جواب میں ایک رسالہ ہی مرتب کر ڈالا (۱۹۰۵)۔ پھر وقت کے مختلف رسائل و جرائد میں مراسلہ نگاری اور پھر مضمون نگاری شروع ہوگئی۔ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں، ہندستان میں بھی اور انگلستان میں بھی۔ ان کی تصنیفات اور تراجم کی فہرست خاصی طویل ہے: ۶۰ کے قریب کتابیں ہیں۔ قرآنِ کریم کی تفسیر بھی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی۔ اپنی سوانح عمری بھی لکھی تھی، جو ان کی وصیت کے مطابق وفات کے بعد "آپ بیتی" کے عنوان سے ۱۹۷۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔
ان کے بعد بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ مثلاً "معاصرین" اس میں اپنے ان ہمعصروں کے مختصر حالات ہیں، جن سے ان کے تعلقات رہتے تھے۔ دوسری کتاب "وفیاتِ ماجدی" ہے۔ اس میں وہ نثری مرثیے ہیں، جو انھوں نے احباب کی وفات پر اپنے رسالوں میں شائع کیے تھے۔
وہ صحافی بھی کچھ کم پایے کے نہیں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے مولوی اسحاق علی ظفرالملک علوی کے ساتھ مل کر ہفتہ وار "سچ" جاری کیا۔ بوجوہ ۱۹۳۳ء میں اسے بند کرنا پڑا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۳۵ء میں بلا شرکتِ غیرے، خود اسے دوبارہ 'صدق' کے نام سے جاری کیا۔ یہ پہلے ہفتے میں دو بار نکلتا رہا، بعد کو ہفتہ وار ہوگیا۔ ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کے باعث "صدق" بھی بند ہوگیا۔ لیکن اب کے تعطل چند ہی ماہ کا رہا؛ اسی سال

یہ "صدقِ جدید" کے نام سے منظرِ شہود پر آیا۔ آخری دن تک وہ اس کے مدیر رہے۔
اب یہ پرچہ ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے حکیم عبدالقوی دریابادی کی ادارت
میں شائع ہو رہا ہے۔ اللّٰھم زِد فزد۔
انھوں نے کسی زمانے میں شاعری بھی کی تھی، ناظر تخلص تھا۔ اس میں اپنے بزرگ اکبر
الٰہ آبادی سے کچھ مشورہ بھی رہا۔ اسی زمانے میں ایک ڈراما بھی "زود پشیماں" کے نام سے
لکھا تھا۔ جسے بعد کو انھوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ ان کا
مختصر مجموعۂ کلام "تغزلِ ماجدی" کے نام سے حکیم عبدالقوی صاحب نے شائع کر دیا ہے۔
(لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۹ء)

اس میں شبہ نہیں کہ وہ صاحبِ طرز نثر نگار ہیں، خصوصاً طنز اور پھبتی میں ان کا جواب
نہیں۔ انھوں نے سیاسی اور مذہبی قسم کے حد درجہ سنجیدہ اور خشک موضوعات پر بھی
لکھا ہے۔ لیکن کسی موقعے پر شگفتگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، ادبی چاشنی ہر جگہ
موجود ہے۔ ان کے پائے کے انشا پرداز ہماری زبان کو بہت کم نصیب ہوئے ہیں۔
ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ان کی گرانقدر علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی بھرپور ہوا، حکومت کی سطح پر بھی،
اور اہلِ علم طبقے کی طرف سے بھی۔ عربی کا راشٹر پتی اوارڈ انھیں ۱۹۶۷ء کے یومِ آزادی
پر دیا گیا، اور اسے مرحوم ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپریل ۱۹۶۷ء کی ایک خصوصی تقریب
میں انھیں پیش کیا! ایک شال اور رمان پتر اس کے علاوہ۔ اس زمانے میں اس کی رقم
دو ہزار سالانہ تھی، اب چند برس سے یہ بڑھا کر پانچ ہزار کر دی گئی ہے۔ اسی طرح
یو پی حکومت کی طرف سے بھی یکمشت پانچ ہزار روپے کا انعام ملا تھا۔ مارچ ۱۹۶۷
میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی سند سے نوازا۔
غرض یہ کہ سب حلقے ان کی ادبی عظمت کے معترف تھے۔ اب بطور نمونہ ان کے چند اشعار
سنیے:

نامرادی مری ہمزاد تھی، تو کیوں، یارب! میری قسمت میں لکھا صاحبِ ارماں ہونا

زینتِ حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا
نازشِ زخمِ جگر رہنِ نمکداں ہونا

دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہے کیا، تیر ہے کیا
اس کو بسمل ترے انداز و ادا نے رکھا
شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پہ کبھی
تجھ کو دھوکے میں تری شرم و حیا نے رکھا

ہر شے سے ٹپکتا ہے مرا جذبِ تمنّا
نالے کا اثر دیکھ کہ تاثیرِ دعا دیکھ
حد سے نہ گزر مشغلۂ جور میں اے یار!
نازک ہے بہت رشتۂ پیمانِ وفا دیکھ
آشفتہ سری پہ مری، کیوں طنز ہے اتنا
تو خود تو ذرا برہمیٔ زلفِ دوتا دیکھ

اس نے خودداریٔ ناظر کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بیقراریاں نہ گئیں

اور آخر میں ایک نعت کے چند شعر:

آہ اک شب تو با اثر ہوتی
وہ تجلیٔ حق ادھر ہوتی
پائے اقدس پہ چشمِ تر ہوتی
شب گزرتی یونہی سحر ہوتی
نالۂ نارسا، رسا ہوتا
سُرمۂ چشم خاکِ در ہوتی
کچھ تو ارمانِ دل نکل جاتا
کچھ تو تسکینِ چشمِ تر ہوتی
نقشِ پا کو لگاتے آنکھوں سے
یوں دوائے دل و جگر ہوتی
حسرتِ دید دل میں، لب پہ درود
اب تو ہر شب ہے یوں بسر ہوتی
ہے حضوری نصیب میں شاید
ہند میں اب نہیں بسر ہوتی

مختار ہاشمی ، سیّد مختار الدّین ہاشمی

ان کے اجداد ولایتی تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں قندھار پر پے در پے ایرانی حملوں کے باعث جب وہاں کی زندگی بہت مخدوش ہوگئی، تو ہاشمی صاحب کے مورثِ اعلیٰ ہجرت کرکے ہندوستان چلے آئے اور آنولہ (ضلع بریلی) میں علی محمد خان بانیٔ ریاست رام پور (ف: ستمبر ۱۷۴۹ء) کے سایۂ عاطفت میں مقیم ہوگئے۔ یہ غالباً ۱۷۳۰ء کا واقعہ ہے۔

ہاشمی صاحب کے والد سید عزیز الدین ہاشمی عالم آدمی تھے۔ درس و تدریس کے سوا ان کا کوئی شغل نہ تھا۔ اپنے ہی مکان پر اچھے پیمانے پر ایک مکتب قائم کر رکھا تھا، جہاں طلبہ ان سے دین و دنیا کے علوم کا درس لیتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے؛ خنداں تخلص تھا۔ ان کے تین بچے ہوئے: فصیح الدین فصیح، مختار الدین مختار ہاشمی، اور آفتاب بیگم۔ تینوں ماشاء اللہ شعر کہتے تھے۔

مختار الدین آنولہ (محلہ کٹرہ نخیتہ) میں اتوار ۱۶ جنوری ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم بیشتر اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے ہی میں پائی۔ شاید بعد کو "منشی کامل" (فارسی) کا سرکاری امتحان بھی پاس کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر انگریزی میں بھی اتنی لیاقت پیدا کرلی تھی کہ کاروباری لین دین کے زمانے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کی۔

ہاشمی صاحب نے قیامِ آنولہ کے دوران میں وہاں کی مختلف تجارتی فرموں میں بطور منیم اور منیجر کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ اور یہاں انھوں نے تالے بنانے کا کام شروع کیا۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، اور کارخانہ بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے وہیں علی گڑھ میں ایک فرم (جنیکو) میں منیجری کی ملازمت کرلی۔ لیکن ان کے

دل سے آزادانہ زندگی بسر کرنے کی آرزو ختم نہیں ہوئی تھی۔ جب ذرا اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے، تو نوکری ترک کردی، اور ۱۹۵۸ء میں دوبارہ "تالے بنانے کا کام کرنے لگے۔ تین سال بعد، ۱۹۶۱ء میں کام کو وسعت دینے کی خاطر ایک صاحب کو اپنا شریک کار بنالیا۔ بدقسمتی سے فروری ۱۹۶۲ء کے آغاز میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ بہت دن تک صاحب فراش رہے۔ اس سے کاروبار پر بھی اثر پڑا۔ ادھر شریک کار نے بددل ہو کر علاحدگی اختیار کرلی۔ لیکن ان مخالف حالات کے باوجود مختار ہاشمی ہمت نہیں ہارے، اکیلے ہی کام پر ڈٹے رہے۔ خدائے کریم نے ان کے حوصلے کی لاج رکھی۔ وہ ہر طرح کامیاب رہے، اور کاروبار بھی منافع پر چلتا رہا۔

۱۵/۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ فوراً مقامی جواہر لال میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا۔ لیکن سارے دن کی کشمکش کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ۱۶/۱۷ جنوری کی شب میں فجر سے کچھ پہلے (یعنی دوشنبہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء کے اولین وقت) داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ۱۷ جنوری ہی کو قبرستان شاہ جمال، علی گڑھ میں اُن کا جسدِ خاکی دفن کیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہ راجِعُون۔ ان کے شاگرد حکیم محمد شکیل جعفری آنولوی کے قطعۂ "تاریخ وفات کے آخری دو شعر درج ذیل ہیں۔ پہلے شعر سے عیسوی تاریخ (۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء) اور دوسرے سے تخرجے کے بعد، ہجری (۱۳۹۷) برآمد ہوتی ہے:

ظاہر ہوا گراں ہے سترہ کی ابتدا — اُردو کو داغ دے گئی جب سترہ جنوری

تاریخ انتقال کی ہو فکر گر، شکیل! — کھا کر قسم" یہ کہیے کہ "مختار ہاشمی"

(۱۵۹۷ - ۲۰۰ = ۱۳۹۷)

ان کی شادی آنولے کے سید محی الدین کی صاحبزادی انوری بیگم سے ہوئی تھی (بیوی کا ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو انتقال ہوا)۔ تین بیٹے (ہلال اختر اور جمال انور اور ہلال اصغر) اور دو بیٹیاں (انتخاب بیگم، اور رضیا النسا) ان سے یادگار ہیں۔ بڑے بیٹے ہلال، اختر شعر بھی کہتے ہیں۔

---

۵ یہ حالات بھی انھیں سے حاصل ہوئے۔

مختار ہاشمی مرحوم کو شعر گوئی کا شوق ہوا، تو مدتوں کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ پھر معلوم نہیں کیسے ۱۹۵۰ء میں ابر احسنی گنوری (ف: نومبر ۱۹۷۳ء) کے حلقۂ تلامذ میں شامل ہو گئے۔ ابر مرحوم جس پایے کے سخت گیر استاد اور صاحبِ فن سخنور تھے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ مختار ہاشمی بھی روایت کی پابندی اور پاسداری، عروض کی مہارت، زبان کی صحت اور ردو بدل کے باعث خود اُستادی کے درجے کو پہنچ گئے۔ ان کے کلام کا مختصر انتخاب بعنوان "گردشِ رنگ" اتر پردیش اُردو اکاڈیمی کے اشتراک سے شائع ہوا تھا (علی گڑھ، ۱۹۷۵ء)؛ یہ ان کے شاعرانہ مقام کا شاہدِ عادل ہے۔ اس کتاب پر انھیں یو پی اردو اکاڈیمی نے ایک ہزار روپے کا انعام بھی دیا تھا۔ ملک کے مختلف مقامات پر ان کے متعدد شاگرد زبان و ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

"گردشِ رنگ" سے یہ مختصر انتخاب بطورِ نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے:

میرا زاہد سے تقابل نہ کر، اے داورِ حشر! وہ تو مایوس تھا رحمت سے، میں مایوس نہ تھا

یہ ظرف میرا ہے، اے رہبرِ رہزن! کہ چل رہا ہوں ترے ساتھ پے بہ پے اب بھی

ذوقِ سجدہ! تری منزل ہے کہاں کچھ تو بتا حرم و دیر بہت پیچھے رہے جاتے ہیں

اس اعتماد پہ ہر غم میں مسکراتا ہوں ہوئی ہے شام تو، مختار! صبح بھی ہو گی

ہر ذرہ کائنات کا ہے مرکزِ جمال ہم جستجوئے حسنِ حقیقت کہاں کریں!

شرف حاصل ہے مخلوقاتِ عالم پر انساں کو مگر انسانیت سر در گریباں ہے نہ جانے کیوں

فرشِ گل پر سونے والے! عیشِ فانی پر نہ بھول یہ بھی ممکن ہے کہ کانٹوں پر بسر کرنی پڑے

آج رحمت نے نوازا ہے کچھ ایسی شان سے — پھر خطا شاید، بعنوانِ دگر کرنی پڑے

محبتِ غم، محبت دافعِ غم — کبھی تریاق ہے یہ مے، کبھی سم

سکونِ ذوقِ بندگی کہیں تو مل ہی جائیگا — حرم ہو یا صنمکدہ، کہیں بھی سر جھکاؤ تو

آپ تکلیفِ توجہ نہ کریں، بہرِ خدا — زندگی جیسے بھی گزرے گی، گزر جائیگی

موت بھی عشق، زندگی بھی عشق — داستاں ایک ہے، زمانے دو

شکوہ بھی اک ثبوتِ محبت سہی، مگر — یہ نغمہ سازِ شُکر پہ گاؤ، تو بات ہے!

وفا نے ہیچل بھی ہے، پیامِ مرگِ خود داری — تحمل وصفِ انسانی ہے، لیکن اس قدر کیوں ہو

جاننا کاش یہ بھی تو زاہدِ معرفت پناہ — سجدہ بزعمِ بندگی کفر ہے، بندگی نہیں

انا الحق لفظِ مبہم ہی رہا، یہ خیریت گزری — کوئی دیوانہ اس کو عام کر جاتا، تو کیا ہوتا

اسے جو بنا لے انساں، اسے جو سمجھ لے دنیا — یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانا

ابھی سے دستِ جنوں کی نظر ہے دامن پر — خدا نکردہ بہار آ گئی، تو کیا ہوگا!

غمِ حیات سے آگے، غمِ نجات بھی ہے — ابھی تمام نہیں زندگی کے افسانے

خیالِ مرگ بڑی شے ہے زندگی کے لیے　　اندھیرا جیسے ضروری ہے روشنی کے لیے

اپنا کردار بھی کچھ، غازیٔ گفتار بنائے　　منزلِ دار پہ ہم خاک بسر پہنچیں تو

تری پست ہمتی نے لیا خضر کا سہارا　　اسی گمرہی سے ورنہ کئی راستے نکلتے

حیات میں وجہِ سربلندی نہ ضعیفی ہے، نہ گوسفندی
جبینِ خوددار میں جلاؤ چراغِ حسنِ نیاز مندی

شیخ و برہمن دیر و حرم تک چل کر ہی تھک جاتے ہیں
خیر، یہاں تک تو بیچارے ساتھ ہمارے آتے ہیں

بیتابیٔ دل پر جب ان کی نظروں کا تصرف ہوتا ہے
جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے، مرنے میں تکلف ہوتا ہے

دلیلِ غم بن کے رہ گیا ہے جو آج طوفان آنسوؤں کا
بشکلِ یک موجۂ تبسم یہی تھا دورِ نشاط میں بھی

بے سبب لطف و عنایت کا نہ سمجھیں مفہوم　　ہم پریشاں ہیں، مگر اتنے پریشاں بھی نہیں
خیر وہ تو بُتِ کافر ہے، اسے کیا کہیے　　صاحبِ ذوقِ وفا کوئی مسلماں بھی نہیں

موت کے حشر بر دوش ماحول میں کیوں نہ ہم چھیڑ دیں نغمۂ زندگی
جب کہ برسات کی ایک تاریک شب ناخدا بنتی ہے جگنوؤں کے لیے

لاکھوں دشمن مگر دوست کوئی نہیں جو سہارا بنے زندگی کے لیے
سوچتے ہیں، انھیں دشمنوں میں سے ہم کوئی دل ڈھونڈلیں دوستی کیلیے

ایک دنیا میں سب رہ رہے ہیں، مگر خواہشیں مختلف، آرزوئیں جدا
موت کی چاہ میں جی رہا ہے کوئی، مر رہا ہے کوئی زندگی کے لیے

مشعلیں داغِ دل کی فروزاں تو ہیں، آنسوؤں کے ستارے درخشاں تو ہیں
اور کیا چاہتی ہے تُو، اے شامِ غم! اپنا گھر پھونک لیں روشنی کے لیے!

صبح کی فکر نے ہمیں مارا ورنہ کچھ لطفِ شام ہی لیتے

حرم و دیر کی حد سے تو نکل آیا ہوں دیکھیے، اُن سے ملاقات کہاں ہوتی ہے!

حیرت ہے کہ کانٹے ہی رسوائے گلستاں ہیں کانٹوں ہی نے رکھّا ہے پھولوں کا بھرم اب تک

نزاکتِ گل و شیشہ نہ محترم ہو جہاں وہاں معاملۂ خشت و سنگ بہتر ہے

رشید احمد صدیقی، پروفیسر

"حضرت، آپ کا سالِ ولادت کیا ہے؟ کوئی ۱۸۹۸ء لکھتا ہے، کوئی ۱۸۹۶ء، کوئی ۱۸۹۴؛ ایک صاحب نے ۱۸۹۲ء بھی لکھا ہے۔ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟"

"۱۸۹۲ء"

"مہینا؟"

"دسمبر"

"تاریخ؟"

"۲۴"

"سبحان اللہ! آپ تو حضرت یسوع مسیح سے بھی ایک دن پہلے پیدا ہوئے"۔

چونکہ یہ فقرہ ان کے مذاق کے مطابق تھا، اس پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص انداز میں کھُل کر مسکرا دیے۔ یہ گفتگو میرے اور جناب رشید احمد صدیقی مرحوم کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے، مہینا غالباً مئی کا تھا۔

تو یہ طے ہو گیا کہ ان کی تاریخ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء ہے۔ اس کے بہت دن بعد انھوں نے بتایا کہ اپنے پرانے کاغذوں میں خاندان کے کسی بزرگ کی کوئی یادداشت ملی ہے، اس میں بھی یہی تاریخ ولادت درج تھی۔

مشرقی اتر پردیش کے ضلع جونپور میں ایک قصبہ مریاہو[۵]؛ یہ جونپور سے ۱۱ میل دور مرزاپور

ماخذ: آشفتہ بیانی میری؛ نقوش (شخصیات نمبر)؛ نیاز احمد صدیقی (برادر رشید احمد صدیقی مرحوم)؛ پروفیسر کمال احمد نقوی، علی گڑھ (مرحوم رشید احمد صدیقی کے بھانجے) ۵ دیکھیے اگلا صفحہ

جانے والی سڑک پر تحصیل کا صدر مقام ہے۔ حضرت پیر زکریا داد اکا مزار یہاں کا بہت مشہور زیارتی مقام ہے۔ اب تو تعلیم کا رواج عام ہو گیا؛ اور لوگ خاص کر تعلیم یافتہ لوگ، ہر ایک چیز کے انکار اور روایت شکنی ہی کو روشن خیالی کی دلیل سمجھنے لگے ہیں؛ پہلے مریاہو میں شادی بیاہ کے موقع پر یہ مسلمہ رواج تھا کہ دولھا پہلے اس مزار پر حاضری دیتا، سلام کر کے نذر پیش کرتا، اور اس کے بعد بارات روانہ ہوتی۔ ان بزرگ کے اخلاف جس محلے میں مقیم ہیں؛ وہ آج بھی محلہ پیر زکریا کہلاتا ہے۔

یہی حضرت پیر زکریا رشید صاحب کے جدِ اعلیٰ تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ سترھویں صدی عیسوی میں تبلیغ دین کی غرض سے ترک سے آئے تھے۔ پہلے چند سے پنجاب میں قیام کیا۔ جب وہاں کے حالات نے مجبور کیا، تو آگے بڑھے، اور دلی اور الٰہ آباد میں رکتے ہوئے جونپور پہنچ گئے، اور بالآخر مریاہو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد حکومتِ وقت کی ملازمت میں داخل ہو گئی، اور بیشتر نے فوج اور سپہگری کے پیشے کو ترجیح دی۔ انھیں میں رشید صاحب کے اسلاف بھی تھے۔

رشید احمد صدیقی کے والد جناب عبدالقدیر پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ وہ مدتوں بلیا اور غازی پور اور جونپور کے اضلاع میں تھانیدار رہے۔ پولیس کا محکمہ اپنی سخت گیری اور بدعنوانیوں کے لیے مشہور، بلکہ بہت حد تک بجا طور پر، بدنام ہے لیکن عبدالقدیر صاحب کی نیکی اور دیانتداری کا شہرہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند، اور مشہورِ زمانہ صوفی حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی (ف: ستمبر ۱۸۹۵) کے مرید تھے۔ اسی سے ان کے عام رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عبدالقدیر صاحب کا نکاح بھدوئی (ضلع بنارس) کے سید باسط علی کی صاحبزادی

(۵ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مریاہو سے متعلق جونپور گزٹ میں یہ دلچسپ اندراج ملتا ہے کہ مریاہو آباد ہونے سے پہلے یہاں ایک مختصر جنگل تھا، جس میں آہوؤں کے مانند کثرت سے تھے۔ جب ہرن نکال دیے گئے اور یہ جگہ آباد ہوئی، تو ماند کا لفظ بگڑ کر آبادی کا نام ہی منڈیاہو پڑ گیا۔ مرورِ زمانہ سے یہی بدل کر "مریاہو" کہلانے لگا۔

چھنکا بی بی سے ہوا تھا۔ ان سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں: سائرہ، طاہرہ، آمنہ، عبدالصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی، نذیر احمد صدیقی۔ چھنکا بی بی کا ۱۹۱۸ء میں انتقال ہوا۔ خود عبدالقدیر صاحب نے ۱۹۴۸ء میں رحلت کی۔

جناب عبدالقدیر اپنی ملازمت کے سلسلے میں بیریا (ضلع بلیا) میں تعینات تھے، جب خدا نے انھیں دوسرا بیٹا دیا اس کا نام انھوں نے رشید احمد رکھا۔ یہی بعد کو پروفیسر رشید احمد صدیقی ہوئے۔ ان سے بڑے بھائی عبدالصمد تھے۔ سنجھلے نیاز احمد صدیقی بہت دن محمد حسن کالج، جونپور کے پرنسپل رہے؛ بفضلہ حیات ہیں۔ سب سے چھوٹے نذیر احمد کم عمری ہی میں رحلت کر گئے تھے۔

رشید احمد صدیقی اپنے بچپن میں بہت کمزور اور نحیف الجثہ تھے۔ مدتوں مختلف عوارض کا شکار رہے۔ طرح طرح کے علاج معالجے اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، لیکن ان کی علالت کا سلسلہ بہت دن تک چلا۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی دیر میں شروع ہوئی، گھر والوں کو اندیشہ تھا کہ جسمانی کمزوری کے باعث یہ ذہنی بار اٹھانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے شریف گھرانوں کا دستور تھا؛ ان کی تعلیم بھی گھر ہی پر ہوئی، اور وہ بھی دینیات اور عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ اس دوران میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی کچھ کتابیں، عربی کے چند رسالے، دینیات کے کچھ اسباق اور قرآن شریف ناظرہ پڑھا۔ جب یہاں سے فارغ ہوتے، تو اردو اور حساب، پہاڑے وغیرہ سیکھنے کے لیے مقامی پرائمری اسکول میں چلے جاتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس اسکول میں جو مدرس انھیں اردو پڑھاتے تھے، وہ خود اردو سے بالکل نابلد تھے، اردو میں ان کی ساری کائنات دستخط کر لینے تک محدود تھی۔

اگرچہ ان مدرس کو نہ پڑھنے سے کچھ تعلق تھا، نہ پڑھانے سے؛ اور مذہباً بھی وہ کٹر قسم کے برہمن تھے؛ لیکن بحیثیت انسان بہت بلند تھے، شریف النفس اور خادم خلق اور ہمدرد۔ جب وبائی طاعون کا موسم آتا (اور یہ ہر سال ہی آتا تھا) تو مدرسہ اپنی عمارت سے اٹھ کر گاؤں کے مندر میں منتقل ہو جاتا۔ ماسٹر صاحب کی روزانہ کی صحبت اور سال بسال

اس مندر میں مہینوں بسر کرنے، بلکہ مندر کے بعض چھوٹے چھوٹے کام بھی سرانجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید صاحب کے دل میں ہندو دھرم، بلکہ تمام دوسرے مذاہب کے لیے رواداری کے جذبات پیدا ہو گئے، اور خوشگوار لینت اور نرمی، تحمل اور بردباری ان کے مزاج کے گویا اجزائے ترکیبی بن گئے۔

پرائمری اسکول سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول، جونپور بھیجا گیا۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ یہ سند تو انھوں نے جوں توں حاصل کر لی، لیکن ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جہاں اور تمام مضامین میں ان کا نتیجہ ہمیشہ اچھا رہا، ریاضی میں وہ ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں زندگی بھر ریاضی اور حساب کتاب سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

جونپور کو "شیراز ہند" کہا گیا ہے، اور واقعی وہ اس نام کا مستحق تھا۔ شاہان شرقی کے عہد میں اس نے مختلف علوم و فنون میں جو ترقی کی، اس کے آثار آج تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ حکومت وقت کی سرپرستی نے جونپور میں یگانۂ روزگار علما و فضلا کو جمع کر دیا تھا۔ انھوں نے یہاں مدارس و مکاتب کھول دیے، رشد و ہدایت کی مجلسیں قائم کر دیں، اور یوں ہر طرف علم اور اس کی تمام شاخوں کا چرچا عام ہو گیا۔

حکومت نے شہر کی ظاہری تزئین و تہذیب پر بھی خاص توجہ کی۔ عالیشان عمارات، مساجد، مقابر، سرائیں جو اس زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں سے بیسیوں کی باقیات آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ سطوت و جلال ماضی کے یہ آثار رشید احمد صدیقی نے دیکھے۔ ان کا اپنا خاندان بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا، ان کی ابتدائی گھریلو تعلیم بھی بیشتر مذہبی نوعیت کی تھی، طبیعت بھی حساس اور دردمند اور غور و فکر کی عادی تھی۔ اس پر جونپور میں جن ساتھیوں سے اور ان کے واسطے سے ان کے خاندانوں سے تعلق پیدا ہوا، وہ بھی اسی کاروان رفتہ کی یادگار تھے۔

جونپور میں بیشتر پرانے گھرانے شیعی عقائد کے تھے۔ رشید صاحب کے ساتھ پڑھنے والے انھیں خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ساتھ یہ ان کے گھروں پر جاتے۔ ان سے

محبت اور شفقت کا سلوک تو ہونا ہی چاہیے تھا؛ اس کے ساتھ وہاں انھیں شعرا کا کلام، مرثیے اور سوز اور سلام سننے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے گویا ان کی اردو دوستی کی بنیاد پڑی اور اردو ادیب بننے کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ وسطِ شہر میں دریائے گومتی بہتا ہے۔ اس کے کنارے ایک دو منزلہ عمارت میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ تھا۔ رشید صاحب باقاعدگی سے اس کتب خانے میں جاتے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے اور اردو انگریزی کے ناول اور افسانے پڑھا کرتے۔ یوں رہی سہی کسر اس مطالعے نے پوری کردی، اور وہ اردو ادب کے خاصے بڑے حصے سے واقف ہو گئے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب سے بےتکلفانہ ملنے کا موقع ملا ہے، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ معنوی پہلو سے زندگی بھر ان کے شوق و شغف کے موضوع تین رہے: اسلامیت، پرانی اقدار اور تہذیب، اردو۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد ان کے قیامِ جونپور کے زمانے میں پڑی تھی۔ بعد کو وسیع ذاتی مطالعے اور دوست احباب سے تبادلۂ خیالات، نیز تہذیب کے انحطاط اور نئی نسل کی اخلاق باختگی کے نظارے سے ان میں ان موضوعات کے زمانۂ حال سے تقابل اور ان کے بارے میں غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی۔

جونپور گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد مستقبل کا مسئلہ درپیش تھا۔ گھر کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ ان کی کالج کی تعلیم کا بار برداشت کرسکتی۔ اس دوران میں ایک افسوسناک ناگہانی حادثے کے باعث گھر کی مالی حالت بہت سقیم ہوچکی تھی؛ جس سے ان کا اعلیٰ تعلیم کا خواب منتشر ہوگیا۔ اس کی تفصیل، میری درخواست پر، مرحوم کے برادرِ خورد جناب نیاز احمد صدیقی نے مہیا کی ہیں۔

ہوا یہ کہ ان کے والد عبدالقدیر صاحب ضلع بلیا و غازی پور میں تعینات تھے؛ وہاں سے ان کا بحیثیت سب انسپکٹر پولیس شاہ گنج تبادلہ ہوگیا۔ جونپور میں تین تھانے تھے: بدلا پور، بادشاہ پور، شاہ گنج۔ چندے بعد شاہ گنج سے ترقی پاکر وہ (غالباً ۱۹۰۷ء میں) صدر کوتوالی جونپور میں کوتوال کے عہدے پر مقرر کیے گئے۔ ان کے حسنِ کارکردگی

اور دیانت و امانت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ان کا اپنے ضلع میں، اور وہ بھی وطن سے اتنا قریب کوتوال کے اعلیٰ اور مقتدر عہدے پر تقرر عمل میں آیا۔

اسی زمانے میں، ان کے جانے کے بعد، شاہ گنج تھانہ میں ایک قتل کا مقدمہ چلا۔ جس میں ملزم ناکافی ثبوت کی بنا پر چھوٹ گئے۔ لیکن اس فیصلے کے نتیجے میں حسّاد نے عبدالقدیر صاحب پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۹۳ کے تحت جھوٹے گواہ بنانے کے الزام میں مقدمہ قائم کرا دیا۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ نے حکم صادر کیا کہ اس مقدمے کی سماعت مرزا پور میں ہو۔ یہاں اس زمانے میں ایک صاحب سید محمد علی جج تھے، جن کا اپنی مہارتِ قانون اور انصاف پسندی کے لیے دور دور شہرہ تھا۔ مخالفین کے دل میں اندیشہ گزرا کہ اگر انھوں نے مقدمے کی سماعت کی، تو نہ صرف عبدالقدیر صاحب بری ہو جائینگے، بلکہ خود ان کی ریشہ دوانیاں بھی طشت از بام ہو جانے کا امکان ہے۔ اس پر جونپور کے مخالف انگریز جج مسٹر موائر کی تحریک اور کوشش سے مقدمہ مرزا پور سے بنارس ججی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کے جج نے فیصلہ شیخ عبدالقدیر کے خلاف دے دیا، اور انھیں ۱۹۰۸ء میں چھ مہینے قید سخت کی سزا ہو گئی۔ اپیل پر الہ آباد ہائی کورٹ میں بھی فیصلہ بحال رہا۔ یہ چھ مہینے کی سزا انھوں نے الہ آباد نینی جیل میں کاٹی۔ اس دوران میں ہاں کھانے وغیرہ کا خرچ گھر سے جاتا رہا۔

یوں ملازمت بھی جاتی رہی، اور پنشن بھی نہ ملی۔

یہ پورا مقدمہ کس نوعیت کا تھا، اس کی حقیقت جونپور کے آئی سی ایس ضلع مجسٹریٹ/کلکٹر کی سالانہ رپورٹ کے اس فقرے سے عیاں ہے: "سب انسپکٹر عبدالقدیر پر مقدمہ غلط چلایا گیا تھا۔" ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

ہندستان میں مقدمہ بازی جتنی گراں اور پریشان کن ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس حادثے نے خاندان کی مالی حالت دگرگوں کر دی۔ بھرا پُرا خوشحال گھر کہاں سے کہاں پہنچ گیا! سب سے بڑے بیٹے عبدالصمد اس وقت کرسچین کالج، الہ آباد میں ایف اے

کے درجے میں زیرِ تعلیم تھے؛ ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ گھر پر آ گئے، اور انھیں مجبوراً ملازمت کے لیے تگ و دو کرنا پڑی۔ برسوں کسی طرح کے پاپڑ بیلنے کے بعد بالآخر انھوں نے مختاری کا پیشہ اختیار کیا، اور بحمدہٖ اس میں کامیابی کے ساتھ بقیہ عمر بحسن و خوبی بسر کی۔ وہ قانونِ فوجداری کے ماہر مانے جاتے تھے۔ لیکن تجربے کے بعد انھوں نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس سے کنارہ کشی کر لی اور اپنے آپ کو دیوانی معاملات اور صیغۂ مال کے لیے وقف کر دیا، اور وہ بھی صرف بقدرِ ضرورت۔ غرض بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کا ۱۹۲۰ء میں انتقال ہوا۔

یہ تھے گھر کے حالات جب رشید احمد صدیقی نے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ ایسے میں بھلا مزید تعلیم کا کیا امکان تھا! مجبوراً انھیں بھی نوکری کی تلاش ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑا؛ وہیں جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک مقرر ہو گئے۔ یہ ملازمت عارضی تھی اور مشاہرہ بھی ۱۵۔ ۲۰ روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ اگرچہ سب لوگ ان کے ملازم اور گھر کا کماؤ فرد بن جانے پر مطمئن اور خوش تھے، لیکن رشید صاحب خود اس سے سخت بیزار تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر سال بھر بعد وہ رسّی تڑا کر بھاگ نکلے اور علی گڑھ آ کر دم لیا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔

اسکول کے زمانے میں انھیں کھیل کود کا لپکا تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ان کے دل پسند کھیل تھے، اور وہ اپنے اسکول کی ان تینوں ٹیموں کے کپتان تھے۔ علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کھیلوں پر خاص توجہ تھی؛ اور یہاں کے طلبہ کی اس میدان میں ملک بھر میں شہرت تھی۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، وہ علی گڑھ دراصل اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے تھے، جتنا کہ یہاں کے کھیلوں کا چرچا سن کر۔ لیکن یہاں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں ان کھیلوں کے کھلاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور کالج میں ان کا ایک سے ایک اچھا کھیلنے والا موجود تھا۔ ناچار انھوں نے ٹینس پر توجہ کی، اور رفتہ رفتہ اس میں بھی بہت اچھی مہارت پیدا کر لی۔ اندرونِ خانہ کھیلوں میں انھیں برج کا بھی شوق تھا۔

علی گڑھ کالج میں وہ چھ برس پڑھے، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک؛ ۱۹۱۹ء میں بی اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم، اے۔ اس زمانے میں یہ کالج الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں کے طلبہ کو وہاں کا نصاب پڑھایا جاتا تھا؛ وہیں جاکر امتحان بھی دینا پڑتا تھا۔ رشید صاحب نے بھی یہ امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیے تھے۔
طالب علمی کا دَور مالی پہلو سے بہت پریشان کُن رہا۔ اس کا حل رشید صاحب نے یہ نکالا کہ ہر سال گرمی کی لمبی تعطیلات میں نوکری کرکے اتنا کما لاتے کہ تنگی ترشی سے سال بھر کے خرچ کے لیے کفایت کرتا۔ کالج میں ۱۵ جولائی سے ۱۵ اکتوبر تک تین مہینے گرمی کی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ ان ایام میں بنارس جاتے اور وہاں سے دیوانی کی کشتی عدالتوں میں کلرکی کرتے۔ ان کا کام بیشتر مسلوں کی نقل کرنا تھا۔ یہ اسی زمانے کی مشق کا نتیجہ تھا کہ رشید صاحب زود نویس بھی ہو گئے اور خوشخط بھی۔ یہ "مشقّت" پانچ برس تک جاری رہی۔ نہایت صبر و شکر سے انھوں نے یہ زمانہ بسر کیا، اور جس آن بان سے انھوں نے ہمچشموں میں اپنا سر اونچا رکھا، یہ ان کا قابلِ فخر کارنامہ تھا۔
علی گڑھ ایم، اے او کالج محض ایک درسگاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تہذیبی ادارہ، ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنگ میل، اور ہندستانی مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہاں ملک کے ہر گوشے سے نونہالانِ قوم جمع ہوتے اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے تیاری کرتے۔ رشید صاحب جب یہاں پہنچے، تو قدرتی طور پر وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصّہ بن گئے۔ حسنِ اتفاق سے ان کی اس سے پہلے کی سادہ تعلیم و تربیت نہ صرف علی گڑھ کی روایات کے منافی نہیں تھی، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا نقطۂ عروج ہونا ہی علی گڑھ ہونا چاہیے تھا۔
رشید صاحب کے حلقۂ احباب میں اقبال احمد خاں سہیل (ف: نومبر ۱۹۵۵ء) بھی تھے۔ سہیل اردو، فارسی کے فاضل اور برگزیدہ شاعر، اور غیر معمولی طور پر ذہین و فطین شخص تھے۔ رشید صاحب اور سہیل مرحوم کا تقریباً چار سال ساتھ رہا؛ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا، رہن سہن ایسا کہ مَن تو شدم، تو مَن شدی کا مضمون ہو گیا۔ بلاخوفِ تردید و شبہہ

کہا جاسکتا ہے کہ رشید صاحب کی تصنیفی صلاحیتوں کے اُبھارنے اور اُجاگر کرنے اور بڑھانے میں سہیل مرحوم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ رشید صاحب اپنے جونپور کے زمانۂ طالبعلمی ہی میں نثر لکھنے لگے تھے۔ شاہ نذیر غازیپوری اس زمانے کے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے نوجوان رشید کی رہنمائی کی، اور انھیں ادب میں راہ راست پر لگا دیا۔ علی گڑھ آئے، تو یہاں سہیل نے انھیں اس اسلوب تحریر کی راہ دکھلائی، جس کے لیے وہ ازل سے منسوب ہو چکے تھے یعنی طنز و مزاح کا اسلوب۔

رشید صاحب پہلے کالج یونین کے سکریٹری مقرر ہوئے؛ اور پھر "علی گڑھ منتھلی" (کالج کا سرکاری جریدہ) کے مدیر۔ یہ ماہانہ انگریزی اور اُردو، دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے کہنے پر اس کا نام "منتھلی" سے بدل کر "میگزین" رکھا گیا۔ ان سے پہلے دونوں حصّوں کے الگ الگ مدیر اساتذہ میں سے ہوا کرتے تھے؛ پہلی مرتبہ انگریزی اور اُردو دونوں کی ادارت ایک ہی شخص اور وہ بھی ایک طالبعلم (رشید صاحب) کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب دونوں حصّوں کے لیے مضمون لکھا کرتے تھے۔ اُردو میں اپنے نام سے اور انگریزی میں "بوہیمین" (آوارہ گرد) کے قلمی نام سے۔ سہیل ہی نے انھیں سب سے پہلے طنزیہ مضمون لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں علی گڑھ میں ان کا قیام "کچی بارک" نامی ہوسٹل میں تھا۔ رشید صاحب نے اس سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین "گِل منزل" کے عنوان سے قلمبند کیا۔ یہی مضمون ان کے طنز و مزاح کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔

کالج میں ایک ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) تھی؛ اسے سرسید کی زندگی ہی میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں (۱۸۹۰ء) شروع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد کالج کے نادار، لیکن ہونہار طلبہ کی مالی امداد کے لیے مستقل سرمایہ جمع کرنا تھا۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ جو وفد روپیہ جمع کرنے کو باہر جائیں؛ وہ کالج کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔ رشید صاحب اس انجمن کے ممتاز رکن تھے۔ اس کے وفد ہر سال چھٹیوں کے ایام میں ملک کا دورہ

کرتے تھے ۔ وہ چندہ بھی جمع کرتے، اور تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعے سے کالج کے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ۔ رشید صاحب نے انجمن کے ۱۹۱۷ء کے وفد کے ساتھ شمالی ہندستان کے مختلف شہروں کے علاوہ برما میں میمیو تک کا سفر کیا ۔ واپسی پر انھوں نے "سیاحت برما" کے عنوان سے چند مضامین لکھے تھے، جو میگزین میں شائع ہوئے ۔

ڈیوٹی سوسائٹی کی خط کتابت بھی بہت حد تک رشید صاحب ہی کے سپرد تھی ۔ نیز مختلف مباحث اور موضوعات پر مضامین اور خطبے اور کتابچے بھی لکھنا پڑتے تھے ۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا فائدہ پہنچا اور ان کی تحریر اور اسلوب میں کیسے پختگی پیدا ہوگئی ۔

کالج کے زمانۂ طالبعلمی میں ان کے انگریزی کے مدرس انعام اللہ خان صاحب تھے ۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز اور ماہر انگریزی داں سمجھے جاتے تھے ۔ لیکن انگریزی ایسی مرصّع اور مسجّع اور ثقیل بولتے تھے کہ سننے والے کا منھ کھلا کا کھلا رہ جاتا ۔ رشید صاحب پروفیسر انعام اللہ خان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے ۔ اُن کے بیشتر انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ رشید صاحب کا کیا ہوا ہے ۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دسمبر (۱۹۲۱ء) میں عارضی طور پر صرف تین مہینے کے لیے اردو پڑھانے پر مقرر ہوگئے ۔ یہ عہدہ اس زمانے میں "اردو مولوی" کہلاتا تھا ۔ اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ جگہ مستقل نہیں تھی، اور معلوم نہیں تھا کہ اصحاب مجاز کس دن، کس بات پر ناراض ہو کر نکال باہر کردیں ۔ اس کے بعد جب یونیورسٹی بنی اور اس میں اردو لیکچرار کی جگہ نکلی، تو انھوں نے بھی درخواست دی ۔ بعض اصحاب نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح کے اعتراض کیے ۔ ان کے اس مستقل اسامی پر تقرر کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی ۔ اس پر اتمامِ حجت کے لیے انھوں نے مقالہ "طنزیات و مضحکات" لکھا ۔ جو پہلے ہندستانی اکیڈمی، الٰہ آباد کے ماہی رسالے "ہندستانی" میں بالاقساط

چھپا اور پھر کتابی شکل میں بھی وہیں سے شائع ہوا۔ خیر قرعۂ فال ان کے نام پڑا، اور ان کا عارضی تقرر ہوگیا۔ ان کے انتخاب کا ایک لطیفہ محفوظ کر دینے کے قابل ہے۔
حسبِ قاعدہ ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی گئی تھی، جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ مختلف امیدوارں کی درخواستوں کا جائزہ لے، اور ان سے ذاتی بات چیت کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کون صاحب اس اسامی کے لیے موزوں ہیں۔ امیدواروں میں رشید صاحب کے علاوہ مشہور مصنف اور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر (ف: دسمبر ۱۹۲۶ء) بھی تھے۔ کمیٹی کے اراکین کی اکثریت ان کے حق میں تھی۔ بیشک، ان کا تدریسی اور تعلیمی تجربہ صفر تھا، لیکن ناولوں کی کھیپ کی کھیپ ان کی پشت پر تھی، اور یہی ان کی سب سے بڑی سفارش تھی۔ خود وائس چانسلر صاحب بھی رشید صاحب کے حق میں نہیں تھے۔ کمیٹی کے صرف ایک رکن حمید الدین خاں⁵ جو ان کے خاص دوست تھے، وہ پورا زور لگا رہے تھے کہ مدرسی کے لیے رشید صاحب ہی موزوں ترین آدمی ہیں، لہٰذا انھیں کا انتخاب ہونا چاہیے لیکن دوسرے سب لوگ ان کے مخالف تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اب ان کے بازی جیتنے کی کوئی توقع نہیں رہی، تو انھوں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ فرمایا: حضرات! مولانا شرر کی قابلیت میں شبہہ نہیں اور آپ بھی مجاز ہیں کہ جسے چاہیں، مقرر کر دیں۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ رامپور ریاست کے کالج پر جو احسانات ہیں، وہ اظہر من الشمس ہیں۔ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں مرحوم کے زمانے سے اس ریاست نے ہر موقع پر، دامے، درمے، قدمے ہماری جو مدد کی ہے، کالج کے در و دیوار اس کے شاہدِ عادل ہیں۔ نواب محمد حامد علی خاں بالقابہ موجودہ والیِ ریاست بھی ہمارے سرپرست (پیٹرن) ہیں اور مولانا شرر نے ایک ناول "اسرارِ دربارِ حرامپور" کے عنوان سے ان کے خلاف لکھا ہے۔ ان کے انتخاب سے کہیں نواب صاحب ناراض تو نہیں ہو جائیں گے! ان کا اتنا کہنا تھا کہ مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ ہر ایک ان کا شکریہ ادا کرنے لگا کہ حضرت، آپ نے

---

⁵ یہ لفٹننٹ کے عرف سے مشہور تھے۔ مدتوں یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پڑھاتے رہے۔ یہ "لفٹنی" نیشنل کیڈٹ کور کا عطیہ تھی۔

ہمیں ایک بڑے خطرے سے بچالیا۔ اور اس کے بعد سب نے اتفاق رائے سے رشید صاحب کے تقرر پر صاد کر دیا۔
بڑے جوڑ توڑ اور سازشوں کے بعد کہیں ۱۹۲۶ء میں وہ مستقل لیکچرار (مدرّس) مقرر ہوئے۔ اس موقع پر منجملہ اور اصحاب کے علّامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء) نے بھی ان کی سفارش کی تھی۔ نو سال بعد ترقی ملی اور ریڈر ہوئے؛ اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر، جو کسی یونیورسٹی میں گویا نقطۂ معراج ہے۔ یہیں سے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی؛ یہاں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔
اپنی طالبعلمی کے زمانے میں رشید صاحب کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۹ء) سے بھی، جو ان سے تین برس پہلے ۱۹۱۲ء میں کالج میں آچکے تھے، بہت گہرے تعلّقات تھے۔ دونوں اکثر اس بات پر افسوس کیا کرتے کہ اردو میں معیاری رسالے ناپید ہیں؛ اور پھر خود ایک اچھا رسالہ جاری کرنے کی اسکیم مرتّب کرتے۔ دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کا نام "شمع" ہو یا "سہیل"، کہ دونوں میں روشنی کا تصوّر ہے؛ اور نہ صرف خود روشن ہیں، بلکہ اپنے چاروں طرف بھی نور کی بارش کر دیتے ہیں۔ اسی سے خیال کیجیے کہ ان کے نزدیک پرچے کا مقصد اور معیار کتنا بلند تھا۔ تو خیر، ذاکر صاحب ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ اب پروفیسر محمد حبیب مرحوم (ف: جون ۱۹۷۱ء) نے بعض احباب کے تعاون سے آگرے سے ایک ماہنامہ جاری کیا، جس کا نام "شمع" رکھ دیا۔ رشید صاحب نے سنا، تو افسوس کیا کہ وہ جو دو ناموں میں سے ایک کے انتخاب میں لذّت تھی، وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ لیکن انھیں اطمینان تھا کہ خیر، "سہیل" تو ہے ہی؛ جب پرچہ جاری کرینگے، اس کا یہ نام رکھ لینگے۔ اس زمانے میں سیّد سجاد حیدر یلدرم (ف: اپریل ۱۹۴۳ء) یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ ایک دن رشید صاحب ان کے پاس بیٹھے اظہار افسوس کرنے لگے کہ اُردو میں اچھے پرچے کم ہیں؛ ایک پرچہ "سہیل" کے نام سے نکالنے کا خیال ہے۔ اس پر یلدرم مرحوم نے کہا: "ہاں، یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں بھی ہے۔" یہ سن کر رشید صاحب ٹسٹپائے کہ

"شمع" تو ہاتھ سے گیا ہی تھا، یلدرم نے کہیں "سہیل" پر بھی ہاتھ صاف کر دیا، تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائینگے؛ ڈاکٹر صاحب بھی یورپ میں ہیں، ان سے کسی اور نام کے لیے مشورہ کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ عنقریب سہ ماہی "سہیل" شائع ہونے والا ہے۔

سہیل انجمن اردوے معلّیٰ، مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی آرگن کی شکل میں ۱۹۲۶ء کے شروع میں جاری ہوا۔ لیکن آج تک کسی اچھے پرچے کو اِلّا ماشاء اللہ اُردو دانوں اور اردو حلقوں کی فضا راس نہیں آئی: نہ ان کا تعاون حاصل ہوا۔ یہی حشر "سہیل" کا بھی ہوا۔ سب نے اس کے مضامین کے بلند معیار، اعلیٰ کتابت وطباعت، دیدہ زیب شکل وصورت کی تعریف کی لیکن ان سب باتوں کے باوجود صرف چھ شمارے ہی شائع ہوسکے اور ۱۹۲۷ء میں اس نے مالی مشکلات کے باعث دم توڑ دیا۔
رشید صاحب اس پر بھی ہار نہیں مانے۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں انھوں نے پھر اسے جاری کیا۔ اب کے ارادہ یہ تھا کہ اسے ہر سال کے آخر میں یعنی دسمبر میں ایک مرتبہ شائع کرینگے۔ لیکن افسوس کہ دسمبر ۱۹۳۵ کا شمارہ اس نئے سلسلے کا بھی اکلوتا پرچہ ثابت ہوا۔

رشید صاحب بجا طور پر اردو ادب کے مسلّمہ اور مایۂ ناز نثر نگار، اور طنز و مزاح کے منفرد مصنف تھے۔ انھوں نے اپنے بیشتر مداحوں اور پڑھنے والوں کو خوش وقت کیا ہے؛ ان کی زندگی کی اُداس اور بے کیف گھڑیوں کو مسرّت و انبساط سے رنگین کیا ہے۔ وہ خود بہت کم آمیز اور کم سخن تھے، لیکن انھوں نے دوسروں کو آپس میں ملنے جلنے کا طریقہ اور شائستہ بات چیت کرنے کا ہنر سکھایا۔ یوں، ان کی طویل تصنیفی زندگی کا جائزہ لیا جائے، تو اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے: اگر آپ وسیع و عریض کھارے سمندر کو متھ کر اس میں سے خالص شیریں امرت کا ایک گھونٹ بھی پیدا کر لیں، تو اس کی ابدی کیفیت پر سمندر کی ناپیدا کنار کمیت سو مرتبہ قربان کی جا سکتی ہے۔ یہی مثال رشید صاحب کی نگارشات پر صادق آتی ہے۔

ان کی ادبی فتوحات کی جو پذیرائی اور قدردانی، اور خود ان کی ذات سے ملک کے اہلِ علم و

فن طبقے نے جو محبت کی ہے اُس کی آدنیٰ بازگشت "پدم شری" کا وہ اعزاز ہے جس سے حکومت ہند نے انھیں یوم جمہوریہ ۱۹۶۳ء کے موقع پر نوازا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں ساہتیہ اکاڈیمی نے اپنا پانچ ہزار کا انعام ان کے غالب صدی کے نظام خطبات کے مجموعے "غالب کی شخصیت اور شاعری" پر دیا۔ دو برس بعد ۱۹۷۳ء میں یوپی اردو اکاڈیمی نے انھیں پانچ ہزار کا خصوصی انعام دیا، جو وہ ہر سال ممتاز مصنفوں کو ان کی مجموعی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کرتی ہے۔

ان کی مندرجۂ ذیل چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

(۱) طنزیات و مضحکات (الہ آباد)؛ (۲) مضامین رشید (دلّی ؛ ۱۹۴۱ء)؛ خندان (دلّی ۱۹۴۰ء)؛ (۴) سہیل کی سرگزشت (حیدرآباد، ۱۹۴۷ء)؛ (۵) گنجہائے گرانمایہ (۱۹۵۱ء)؛ (۶) ذاکر صاحب (دلّی)؛ (۷) ہمارے ذاکر صاحب (نئی دلی: ۱۹۷۳)۔ اس میں (۶) پر اضافہ ہے)؛ (۸) جدید غزل (علی گڑھ، ۱۹۵۵ء)؛ (۹) شیخ نیازی (علی گڑھ، ۱۹۵۸ء)؛ (۱۰) آشفتہ بیانی میری (علی گڑھ، ۱۹۵۸ء)؛ ہمنفسان رفتہ (علی گڑھ، ۱۹۶۶ء)؛ (۱۲) عزیزان ندوہ کے نام (لکھنؤ)؛ (۱۳) علی گڑھ کی مسجد قرطبہ (علی گڑھ، ۱۹۶۷ء)؛ (۱۴) غالب کی شخصیت اور شاعری (دلّی، ۱۹۷۰ء)؛ (۱۵) علی گڑھ: ماضی و حال (علی گڑھ، ۱۹۷۰ء)

ان کتابوں اور رسالوں کے علاوہ ان کے کچھ خطبات اور بہت سے مضامین بھی مختلف رسالوں میں منتشر حالات میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں جمع کر کے محفوظ کر دیا جائے۔ یہ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ظلم ہوگا اگر وہ اصحاب نظر کی دسترس سے باہر رہیں۔

ان پر ۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد نقل و حرکت اور خورد و نوش میں اپنے معالجوں کی ہدایت کے مطابق بیحد احتیاط کی زندگی بسر کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اتنے برس کسی خاص تکلیف کا سامنا نہیں ہوا۔ ہفتہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء صبح ساڑھے چار بجے اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر پہنچ گئے۔ انھوں نے تشخیص

کی کہ خون کا دباؤ بہت کم ہے۔ دوا دوش ہونے لگی، لیکن دوپہر تک گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ خون چڑھایا گیا اور جو کچھ مزید ہو سکتا تھا، وہ بھی کیا گیا۔ لیکن ان کا وقت آ گیا تھا، کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اسی میں تین بجے سہ پہر جان بحق ہو گئے۔ اِنّا للہ وَ اِنّا الیہ راجعون۔ جنازہ اگلے دن (۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء) اٹھا اور انھیں مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کی قبر اردو کے ایک اور پرانے خادم قاضی عبدالغفار (ف: جنوری ۱۹۵۶ء) کے پہلو میں ہے۔

مغیث الدین فریدی نے عیسوی میں تاریخ کہی:

تاریخ وفات دردناک

(۱۹۷۷)

رحلت پروفیسر رشید احمد صدیقی

(۱۹۷۷)

دل ظرافت کا سوگوار ہے آج — طنز کی آنکھ اشکبار ہے آج

اٹھ گیا ناقدِ حیات و ادب — قلب اردو کا داغدار ہے آج

گلفشاں تھے جہاں رشید احمد — رخصت اُس باغ سے بہار ہے آج

قدرِ تہذیب ان کے دم سے تھی — روحِ تہذیب بیقرار ہے آج

جس زباں میں وہ بات کرتے تھے — اُس زباں کا جگر فگار ہے آج

دفع ہوتا ہے لطفِ طنز و مزاح — بذلہ سنجی تہِ مزار ہے آج

نکتہ دانی کا آج ماتم ہے — ذوقِ تنقید اشکبار ہے آج

کان میں گونجتی ہے اُن کی صدا — دامنِ ہوش تار تار ہے آج

"آہ" کے ساتھ لب پہ ہے تاریخ

"رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج"

(۶ + ۱۹۷۱ = ۱۹۷۷ء)

اولاد میں مرحوم کے آٹھ بچے ہوئے: پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں۔

۱۔ سب سے بڑے بیٹے اقبال رشید صدیقی ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے۔ مختلف انگریزی قوموں میں ملازمت کی۔ بنگلہ دیش بننے کے پہلے مشرقی پاکستان میں تھے۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی میں منتقل ہو گئے۔ آج کل اپنی ذاتی فرم کے مالک ہیں۔

۲۔ احسان رشید: ۱۹۶۲ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات میں ریڈر تھے۔ ۱۹۶۳ء کے شروع میں کراچی چلے گئے اور وہاں یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات میں پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر مقرر ہو گئے۔ پھر تین سال کے لیے اسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۸۰ء میں سبکدوش ہونے پر ہارورڈ یونیورسٹی (امریکا) میں وزٹنگ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ آج کل وہیں مقیم ہیں۔ احسان رشید کی شادی مسٹر مسعود مرحوم (ف: ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء) کی صاحبزادی نادرہ سے ہوئی تھی۔ نادرہ کی وفات کے بعد دوسری شادی کی۔

۳۔ سلمیٰ صدیقی: اردو میں ایم اے کرنے کے بعد چندے مسلم یونیورسٹی کے خواتین کالج میں لکچرر رہیں۔ آج کل بمبئی میں مقیم ہیں۔

۴۔ عذرا: بی ایس سی: آج کل اپنے شوہر کے ساتھ لندن میں ہیں۔

۵۔ اسماء صدیقی: ۱۹۵۸ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

۶۔ نیازی رشید صدیقی: ۱۹۶۲ء میں کراچی گئے۔ آج کل اپنے بڑے بھائی اقبال کی فرم میں منیجر ہیں۔ رشید احمد صدیقی مرحوم کی کتاب "شیخ نیازی" انھیں سے متعلق ہے۔

۷۔ احمد رشید صدیقی: ۱۹۷۰ء سے کراچی میں ہیں۔ آج کل ایک پاکستانی فرم میں ملازم ہیں۔

۸۔ اکبر رشید صدیقی: فلم کے شوق میں بمبئی میں مقیم ہیں۔

سخاوت مرزا (محمد سخاوت مرزا)

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں ان کی حکیموں کی گلی میں سکونت تھی۔ یہ قوم کے چغتہ (مغل) اور سپاہی پیشہ لوگ تھے۔ سخاوت مرزا کے دادا مرزا امیر بیگ کی شادی مولوی احمد خان شیفتہ (شاگرد نظیر و اسیر اکبر آبادی) کی بھانجی اللہ جلائی سے ہوئی تھی۔ جب غلام امام شہید اللہ آبادی (ف: جنوری ۱۸۷۹ء) حیدر آباد (دکن) کے بعض عمائد کی دعوت پر وہاں گئے ہیں، تو شیفتہ بھی ان کے ہمرکاب تھے اور غالباً انھیں کی سفارش پر یہ ریاست کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اولاً کچھ دن دارالانشا میں کام کیا، پھر نواب مختار الملک میر تراب علی خان سالار جنگ دوم (ف: فروری ۱۸۸۲ء) نے انھیں اپنی مصاحبت کا شرف عطا کیا اور اپنے فرزند اکبر (سالار جنگ سوم) امیر لائق علی خان بہادر منیر الدولہ (ف: جولائی ۱۸۸۹ء) کا "اتالیق" مقرر کر دیا۔ شیفتہ نے ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲-۱۸۹۳ء) میں حیدر آباد ہی میں رحلت کی۔ ان کی اولاد آج تک وہیں مقیم ہے۔

مرزا امیر بیگ بھی اپنے خسر بزرگوار شیفتہ ہی کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے۔ ان کی اولاد میں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ چھوٹے بیٹے علی مرزا عین عنفوان شباب میں داغِ مفارقت دے گئے۔ بڑے محمد آغا مرزا (عرف آغا صاحب) کا نکاح رحیم خان اکبر آبادی کی دختر نیک اختر نظیر بیگم سے ہوا تھا۔ یہی محمد سخاوت مرزا کے والدین تھے۔ سخاوت مرزا کے علاوہ ان کے اور تین بیٹے (افضل مرزا، خورشید مرزا، لطیف مرزا) اور تین بیٹیاں (حمیدہ بیگم، رشید بیگم، صغیرہ بیگم) تھیں۔ آغا مرزا مدتوں بلدیہ حیدر آباد میں محاسب اور مددگار ٹیکس کے

ماخذ: مخزنِ اسرارِ حقیقت (سخاوت مرزا)؛ مکاتیبِ مشفق خواجہ، کراچی؛ حیدر آباد کے ادیب (۲) از زینت ساجدہ

عہدے پر فائز رہے۔
محمد سخاوت مرزا رمضان ۱۳۱۵ھ (جنوری/فروری ۱۸۹۸ء) میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔
ابتدائی تعلیم نجی طور پر والد سے پائی اور پھر چادرگھاٹ اسکول سے آٹھویں کا امتحان
پاس کیا۔ دسویں کے امتحان سے قبل اتنے سخت بیمار ہو گئے کہ انھیں مجبوراً اسکول کا
تعلق منقطع کر لینا پڑا۔ تھوڑے دنوں بعد نظامت کوتوالی اضلاع میں ملازمت
مل گئی۔ لیکن انھوں نے ملازمت کے ساتھ پرائیویٹ طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور
اپنے زورِ بازو سے اولاً فارسی کا امتحان "منشی" پاس کیا پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے (۱۹۲۷ء)
اور ال، ایل، بی (۱۹۲۹ء) کی اسناد حاصل کیں۔
اسی تعلیم کے بل بوتے پر انھیں ریاست کی ملازمت میں مختلف عہدوں پر کام کرنے کا
موقع ملا۔ مدتوں محکمۂ جیل خانجات اور دفتر ہوم سکٹر اور عدالت عالیہ میں کام کرتے رہے۔
بالآخر ۲۹ سال ملازمت کے بعد عدالت ضلع و سشن جج سے قبل از وقت ۱۹۵۱ء میں پنشن
لے لی۔
۱۹۳۶ء میں نواب سالار جنگ چہارم یوسف علی خان بہادر (ف: ستمبر ۱۹۶۲ء) اور زعم والیافعی
(ف: ۲۷ اگست ۱۹۶۱ء) اور ان کے ساتھیوں کی مساعی سے حیدرآباد دکن میں دکنی
ادب کی بازیافت کی تحریک شروع کر دی۔ محمد سخاوت مرزا بھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔
چنانچہ ۱۹۳۹ء میں ان کا پہلا مضمون (شاہ کمال الدین بخاری) انجمن ترقی اردو کے
سہ ماہی رسالے "اردو" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل دکنی ادب کی مشہور اور
معروف شخصیتوں پر لکھتے رہے۔ جب ہجرت کر کے پاکستان گئے، تو وہاں کے رسائل میں بھی
ان کے مقالے اور کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ مقالات کی خاصی بڑی تعداد مختلف پرچوں
میں منتشر پڑی ہے۔ ان کی چھوٹی بڑی مطبوعات کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں زیادہ اہم
مثنوی من لگن (بحرن)، تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، مخزن اسرار حقیقت (یعنی
مختصر حالات و ملفوظات حضرت شاہ کمال الدین حیدرآبادی) ہیں۔ دکنیات سے متعلق
ان کے متعدد مضامین دائرۃ المعارف، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں بھی شامل ہیں بقین

ہے کہ بہت کچھ ہنوز غیر مطبوعہ ان کے مسودات میں پڑا ہوگا۔
پاکستان جانے کو تو وہ چلے گئے، لیکن وہاں کا قیام انھیں راس نہیں آیا۔ کچھ ابتدائی زمانہ چھوڑ کر زیادہ تر پریشان ہی رہے۔ شروع میں چندے انجمن ترقی اُردو (کراچی) میں ملازم رہے۔ پھر ترقی اُردو بورڈ، کراچی میں بطور معاون مدیر مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ نوکری بھی زیادہ دن نہیں رہی۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف اداروں میں اجرت پر کام کرتے رہے۔ غرض بہت بے اطمینانی کا عالم تھا۔ جیسے یہ سب کچھ کافی نہ ہو شامت اعمال سے بعض خانگی پریشانیوں نے آگھیرا۔ ایک داماد کا انتقال ہو گیا، اور سب سے چھوٹا بیٹا (شجاعت مرزا) ایک قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہو گیا۔ دوشنبہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں انھیں پریشانیوں انتقال کیا۔ سخی حسن درگاہ کے قبرستان (کراچی) کی مٹی نصیب میں لکھی تھی۔
انھوں نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم خیر النسا سے دو بچے ہوئے: مرزا رضا بیگ اور رابعہ سلطانہ۔ دوسری بیگم جمیل النسا (بنت محمد علی خان سرکل انسپکٹر پولیس) سے تین بیٹے (ہمایوں مرزا، اقبال مرزا، شجاعت مرزا) اور دو بیٹیاں (اختر سلطانہ، نور سلطانہ) یادگار ہیں۔

کرشن چندر

تقسیم ملک سے پہلے وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ - پاکستان) کھتری ہندوؤں کی مختلف شاخوں کا گویا گڑھ تھا - ان میں چوپڑہ کھتری بھی تھے، جن کے ایک فرد ڈاکٹر گوری شنکر سرکاری ملازمت سے منسلک تھے - وہ پہلے بھرتپور ریاست میں رہے؛ پھر ۱۹۱۸ء میں ان کا تقرر ریاست جموں وکشمیر کی ایک ذیلی ریاست پونچھ میں ہو گیا - اگرچہ پونچھ کا راجا اس زمانے میں مہاراجا کشمیر کا باجگزار تھا، لیکن اندرون ریاست اسے وسیع اختیارات حاصل تھے - ڈاکٹر گوری شنکر نے ۱۹۴۴ء تک اپنی ملازمت کا بقیہ زمانہ پونچھ ہی میں بسر کیا - سبکدوشی کے بعد دلّی چلے آئے تھے؛ ۱۹۵۱ء میں یہیں دلّی میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر گوری شنکر خود بھی اور ان کے گھر کے لوگ بھی قدرتاً اکثر اپنے وطن وزیر آباد جاتے آتے رہتے تھے - جس زمانے میں وہ بھرتپور میں تھے، ان کی بیوی وزیر آباد چلی آئیں؛ اور وہیں پیر کے دن ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء صبح چھ بجے ان کے ہاں پلوٹھا بچہ پیدا ہوا۔ یہی ہمارے کرشن چندر تھے - ان کے بعد چار بچے اور ہوئے: مہندر ناتھ (ف: ۹ مارچ ۱۹۷۴ء)، سرلا (ف: ۸ مئی ۱۹۷۵ء)، راجندر ناتھ اور اوپندر ناتھ - راجندر ناتھ کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا؛ اوپندر ناتھ ماشاءاللہ حیات ہیں -

کرشن چندر پانچ برس کے تھے، جب انھیں قصبۂ مہنڈر (پونچھ کی تحصیل) کے پرائمری اسکول بھیج دیا گیا، جہاں ان دنوں ڈاکٹر گوری شنکر تعینات تھے - اس کے بعد والد کا تبادلہ پونچھ ہو گیا اور یہ وہاں کے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہو گئے - اور

ماخذ: شاعر ماہنامہ (کرشن چندر نمبر)؛ ریوتی سرن شرما

یہیں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد لاہور چلے آئے اور یہاں فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ والد انھیں اپنی طرح ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، اس لیے کرشن چندر نے ان کے حکم کی تعمیل میں سائنس کے مضامین نصاب میں لیے، اگرچہ ان کی اپنی دلچسپی آرٹس کے مضامین (تاریخ، ادب، فلسفہ، معاشیات وغیرہ) سے تھی۔ انٹر تو انھوں نے جوں توں کر کے سائنس کے ساتھ پاس کر لیا، لیکن بی، اے میں داخلہ لیتے وقت گزارش کی کہ وہ ڈاکٹر نہیں بننا چاہتے اس لیے انھیں اجازت دی جائے کہ بی اے میں آرٹس کے مضامین لے لیں۔ والد نے اصرار نہیں کیا اور اس طرح بالآخر انھوں نے ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم (انگریزی ادب) کی سند حاصل کی۔ اب والد نے کہا کہ اچھا ڈاکٹر نہیں بنتے تو وکیل سہی۔ اس پر انھوں نے یونیورسٹی لا کالج سے ۱۹۳۷ء میں وکالت کی سند (ایل، ایل، بی) پائی۔ لیکن یہ بھی مارے باندھے کی بیگار ثابت ہوئی۔

ان کی تعلیمی زندگی کے زمانے کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ وہ انٹر کے پہلے سال میں تھے کہ ان کا مقامی دہشت پسند حلقوں سے تعارف ہو گیا اور یہ بھی ان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے دو ساتھی گرفتار ہو کر سزا پا گئے۔ اب ان کی ملاقات مشہور انقلابی بھگت سنگھ (ف: ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء) سے ہوئی۔ اس کے بعد یہ کالج سے بھاگ نکلے اور بنگال پہنچ گئے، جو اس زمانے میں ملکی دہشت پسند سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہاں مہینا بھر کے قیام میں انھوں نے دیہات کا دورہ کیا اور عوام کی جہالت اور زبوں حالی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

ان کے کالج سے فرار کی خبر ان کے گھر والوں کو مل گئی تھی۔ والد نے ان کی کھوج میں ایک آدمی لگا دیا جس نے ٹوہ لیتے لیتے انھیں بنگال میں جا پکڑا۔ وہ تو بعض با اثر حضرات کی سفارش کام آئی، ورنہ ان کی طویل غیر حاضری کے باعث کالج سے ان کا نام کٹ گیا تھا۔ قصہ کوتاہ، یہ واپس لاہور آئے اور تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا۔ اسی زمانے میں وہ پنجاب سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اشتراکی لٹریچر کا

بھی وسیع مطالعہ کیا۔ گرمی کی تعطیلات کے زمانے میں وہ دیہات چلے جاتے اور لوگوں سے بات چیت کے ذریعے ان کے مسائل معلوم کرتے۔ کشمیر جاتے، تو وہاں بھی یہی مشغلہ رہتا

اگرچہ بعد کے زمانے میں انھوں نے عملی سیاست میں کوئی حصّہ نہیں لیا، لیکن ان کا یہ علم اور تجربہ ادبی میدان میں ان کے بہت کام آیا۔ جس آرام و آسایش اور عافیت طلبی کے وہ عادی تھے، اس میں اس زمانے کی پُرخار سیاست ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اولاً پروفیسر سنت سنگھ کے اشتراک سے انگریزی ماہنامہ "ماڈرن ریویو" جاری کیا۔ لیکن گیارہ ماہ بعد یہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد باوا پیارے لال بیدی کی انگریز بیوی فریدہ (فریڈا) (ف: ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء) کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ "دی ماڈرن گرل" (انگریزی) شروع کیا۔ یہ تجربہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا اور چند ماہ بعد پرچہ بند ہوگیا۔ اس زمانے میں وہ آٹھویں ساتویں لاہور کے مشہور انگریزی روزنامے ٹریبیون میں بھی سیاسی اور معاشی مسائل پر مضامین لکھتے رہے۔

لیکن ان کی اصلی دلچسپی اردو سے تھی، اور یہ بہت قدیم تھی۔ وہ ابھی اسکول کے درجوں میں تھے کہ انھوں نے اپنے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام پر ایک طنزیہ "پروفیسر بلبلی" کے عنوان سے لکھا۔ یہ دلّی کے مشہور ہفتہ وار "ریاست" میں چھپا تھا۔ جب ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر کو اس کا علم ہوا، تو وہ بہت خفا ہوئے۔ اس کے بعد ایم اے کے درجے میں پہنچنے تک انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ غالباً ان کا سب سے پہلا افسانہ "سادھو" ہے جو ایف سی کالج کے میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں وہ یرقان سے سخت بیمار ہو گئے۔ جب صحتیاب ہوئے، تو انھوں نے ایک افسانہ "یرقان" لکھا، جو "ادبی دنیا"، لاہور میں شائع ہوا۔ صلاح الدین احمد (ف: جون ۱۹۶۴ء)

---

۵ ہمارے مشہور سیاسی لیڈر شری گلزاری لال نندہ کے والد

رسالے کے ایڈیٹر تھے؛ انھوں نے اس افسانے کی بہت تعریف کی۔ اور واقعی یہ پہلی کوشش ہی ستارۂ درخشیدو ماہِ کامل شد کی مصداق ثابت ہوئی۔ اس افسانے نے انھیں شہرت کے اُس مقام پر پہنچا دیا، جو بیشتر لکھنے والوں کو عمر بھر کی خامہ فرسائی کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ سجاد ظہیر مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۷۳ء) نے ملک کا دورہ کیا اور ہر جگہ کے ادیبوں سے رابطہ پیدا کر کے وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم کیں۔ کرشن چندر بھی اُس میں شامل ہو گئے بعد کو وہ پنجاب شاخ کے سکتر چنے گئے تھے۔ ۱۹۳۸ء کی آل انڈیا کانفرنس کلکتہ میں انھوں نے پنجاب کے نمائندے کی حیثیت سے بھی شرکت کی۔

ان دنوں آل انڈیا ریڈیو چن چن کر اچھے ادیبوں کو اپنے ہاں ملازمت کی پیشکش کر رہا تھا۔ کرشن چندر ابھی لاہور ہی میں تھے کہ نومبر ۱۹۳۹ء میں ریڈیو نے انھیں پروگرام اسسٹنٹ کی اسامی پیش کی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ سال بھر لاہور میں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ دلی دفتر میں ہو گیا۔ یہاں وہ ۱۹۴۲ء کے آغاز تک رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ تبادلہ ہو گیا۔ اب بحیثیت افسانہ نگار اور ڈراما نویس سب ان کا لوہا ماننے لگے تھے۔ وہ لکھنؤ ہی میں تھے کہ فلمساز و۔ض۔ احمد نے انھیں اپنی کمپنی "شالیمار پکچرز" میں مکالمے وغیرہ لکھنے کے لیے پونے آنے کی دعوت دی۔ کرشن چندر سرکاری ملازمت اور اس کی پابندیوں سے تنگ آ ہی چکے تھے انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور ریڈیو سے مستعفی ہو کر پونے چلے گئے۔

پونے میں دو برس رہنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں بمبئی چلے آئے اور "بمبئی ٹاکیز" سے وابستہ ہو گئے۔ سال بھر بعد انھوں نے "نیشنل تھیٹر" کے اشتراک سے اپنی کمپنی قائم کر لی ان کا اپنا ریڈیائی ڈرامہ "سرائے کے باہر" تھا اسے فلمایا۔ پھر اپنے سرمایے سے ذاتی

---

۵ پورا نام وحید الدین ضیاء الدین احمد تھا۔ یہ "ادبی دنیا" کے مولانا صلاح الدین احمد کے بھتیجے اور سندھ کے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ کے داماد تھے۔ کمیونسٹ لیڈر زین العابدین احمد (ریڈ اے احمد) ان کے بڑے بھائی ہیں۔

کمپنی "ماڈرن تھیٹر" کے نام سے قائم کی، اور ایک فلم "دل کی آواز" تیار کی۔ اس کمپنی کی دوسری فلم "راکھ" بن رہی تھی کہ روپے کی کمی کے باعث کمپنی ٹوٹ گئی۔ کرشن چندر کا یہ فلمسازی کا تجربہ بہت ناکام رہا۔ اس میں انھیں کئی لاکھ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا، بلکہ مقروض ہوگئے۔ دراصل اس کاروبار میں بڑے جوڑ توڑ کی اور اندھا دھند شرطیہ بے کی ضرورت ہے، یہ ان دونوں صفات سے عاری تھے، بھلا کامیابی ہوتی تو کیونکر! اس کے بعد انھوں نے صرف فلم کمپنیوں کے لیے ڈرامے یا مکالمے لکھے، یا پھر اپنے شوق کا تصنیف و تالیف کا کام کیا، اور ماشاء اللہ اس میں رفتہ رفتہ اتنی ترقی ہوئی اور کامیابی حاصل کرلی کہ صفِ اول کے مصنفین میں شمار ہونے لگا۔

ملک نے ان کی ادبی عظمت کا بھرپور اعتراف کیا، اور حکومت بھی پیچھے نہیں رہی۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں انھیں سوویٹ لینڈ نہرو اوارڈ ملا۔ آٹھ ہزار روپیہ نقد اور پندرہ دن کی روس یاترا۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا۔ اسی سال بمبئی اور دلّی میں ان کے مداحوں نے ان کا جشن منایا اور ان کی خدمت میں کیسۂ زر پیش کیے: بمبئی میں پچپن ہزار اور دلّی میں بیس ہزار۔ بمبئی میں اس تقریب کی صدارت ملک کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کی تھی۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں نہرو کلچرل ایسوسی ایشن، لکھنؤ نے انعام دیا۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند نے انھیں آل انڈیا ریڈیو کا ایمریٹس پروڈیوسر مقرر کیا، جس کا مشاہرہ ۱۸۰۰ روپے تھا۔ افسوس، کہ اس سے زیادہ دن لطف اندوز ہونا ان کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ اپریل ۱۹۷۶ء سے انھیں یہ تنخواہ ملنا شروع ہوئی، اور مارچ ۱۹۷۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

کرشن چندر کی پہلی شادی ۱۹۳۹ء (یا ۱۹۴۰ء) میں لاہور میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی کا نام دیاوتی تھا (یہ زندہ ہیں) ان سے ان کے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکیاں کیپلا اور الکا، اور ایک لڑکا رنجن۔ افسوس کہ چھوٹی بیٹی الکا طالب علمی کے زمانے میں دماغ کا توازن کھو بیٹھی۔ اس کے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، بہت روپیہ خرچ ہوا

لیکن افاقہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ دوسرے بچے راضی و خوش ہیں۔

ان کی یہ شادی ناکام رہی۔ میاں بیوی میں ہم آہنگی مفقود تھی، جذباتی نہ ذہنی۔ ایسے میں شادی کا اصلی مقصود کہ دونوں کو باہمی تسکین حاصل ہو اور وہ ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی سے پیش آئیں، لازماً ضائع ہوجائیگا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی نینی تال میں سلمیٰ صدیقی سے ملاقات ہوئی، جو خورشید عادل منیر سے طلاق لے چکی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے پر دل وجان سے فدا ہوگئے۔ سلمیٰ کی والدہ کا اصرار تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ سلمیٰ کو حاصل کرنے کے لیے کرشن چندر ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ چنانچہ ان کا نام وقار ملک رکھا گیا، اور بالآخر ۷، جولائی ۱۹۶۱ء کو دونوں کا وہیں نینی تال جہانگیر آباد پیلس میں نکاح ہوگیا۔ اکیاون ہزار مہر مقرر ہوا تھا۔[۵]

کرشن چندر آخر تک اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے بھی کفیل رہے۔ پہلے کئی سال تک مکان کے علاوہ خرچ کے لیے ۷۵۰ ماہانہ دیتے رہے۔ جب گرانی کا دور آیا، تو ماہانہ رقم بڑھا کر ایک ہزار کردی۔ اپنی وصیت میں انھوں نے کتابوں کی دو تہائی رائلٹی بھی دیا وتی کے لیے لکھی ہے؛ بقیہ ایک تہائی سلمیٰ کے لیے۔

کرشن چندر کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا؛ کھانے میں بھی مرغن گوشت جو خوب چٹ پٹا اور مصالحے دار ہو۔ لذیذ غذا اور تر بتر مٹھائی اور اعلیٰ درجے کی شراب، یہ ان کی مرغوب چیزیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ثقیل غذا جوانی تک تو ہضم ہوجائیگی، لیکن رفتہ رفتہ اس کے ناخوشگوار اثرات سے بچنا ناممکن ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ان پر پہلا دورۂ قلب ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ گھر ہی پر علاج معالجہ ہوا اور وہ ٹھیک ہوگئے۔ دوسرا حملہ، جو پہلے سے شدید تر تھا، ۱۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو ہوا (۱۸ مارچ کو ان کا جشن بڑے اہتمام سے وزیر اعظم کی صدارت میں منایا گیا تھا)۔ مہینوں کے علاج کے بعد تندرستی عود کر آئی۔ لیکن اب

۵ یہ سلمیٰ صدیقی کے ایک انٹرویو پر مبنی ہے، جو کرشن چندر کی وفات کے بعد ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوا تھا۔ لیکن میں نے کرشن چندر کی وصیت دیکھی ہے؛ اس میں شادی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

معالجوں نے پابندیاں زیادہ سخت کر دیں۔ تیسرا حملہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو ہوا۔ آخری دورہ ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کا تھا۔ علاج کے لیے وہ "بمبئی اسپتال" میں داخل ہوئے۔ وہیں منگل ۸ مارچ (۱۹۷۷ء) صبح چھ بجے داعی اجل کو لبیک کہی۔ اسی شام ارتھی اٹھی اور ان کی لاش جوہو کے شمشان میں نذرِ آتش کر دی گئی۔ فیاض گوالیاری کے قطعۂ تاریخِ وفات کے آخری دو شعر ہیں:

فسانہ بن گیا، فیاض! وہ فسانہ طراز
جو تھا فسانۂ انسانیت کی روح رواں

سرِ جدائی جدا کن، برائے سالِ وصال
"کرشن چندر برفت و فسانہ حیران"
(۱۹۸۰ - ۳ = ۱۹۷۷)

۳۔ جمیل مظہری کا قطعۂ تاریخ ہے:

کرشن چندر، وہ اردو ادب کا چندرما ڈوبا
ہوئی تاریک دنیائے ادب اجڑا جہانِ دل

جگر خوں ہو رہا ہے مظہری کا یہ خبر سن کر
پگھل کر کیوں نہ آنکھوں میں بہے آنسو فغانِ دل

یہ دل شاعر کا دل ہے اس کی دھڑکن تیز ہونے دے
تھامے ہاتھ اپنا، اے خرد، اے پاسبانِ دل!

یہ فن ہے شیشہ سازی کا، یہ فن ہے دل گدازی کا
وہی سمجھیگا اس فن کو، جو سمجھیگا زبانِ دل

فضا ساکت، کہانی ناتمام، اور رات باقی ہے
نہ کیوں افسوں ہو گونگا، چپ ہوا افسانہ خوانِ دل

بڑی مشکل سے ہوگا ایسا فنکارِ ادب پیدا
جو سورج کی شعاعوں سے بنائے شیانِ دل

خطیب و خطبہ خوانِ معنی و لفظ و بیاں یعنی
ادیب و ترجمانِ دل، طبیب و نبض دانِ دل

بڑھا کر ہاتھ تارے کہکشاں سے کون توڑیگا
ابھی صدیوں تلک ویراں رہیگا آسمانِ دل

کسے آواز دیتا ہے شبستاں کا یہ سناٹا
یہ کس کو نیند آئی کہتے کہتے داستانِ دل

جمیل مظہری سے یوں سروشِ غیب کہتا ہے،
یہ کہہ دو: آج مجلس چپ خموش افسانہ خوانِ دل
(۱۹۷۷ء)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کرشن چندر ہماری زبان کے نہایت کامیاب ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ پریم چند کے بعد ان کی سی شہرت اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی کم و بیش ۸۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں؛ ان میں افسانے، ناول، ڈرامے، بچوں کے لیے کہانیاں سبھی کچھ شامل ہے۔ بیشک، سب کا معیار یکساں نہیں؛ لیکن یہ بات بھی بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی منتخب کہانیاں دنیا کی بہترین کہانیوں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ، ان کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئے، اور ہر جگہ کامیاب رہے۔

اختر اورینوی، سید اختر احمد

اورین (ضلع مونگھیر۔ بہار) میں نقوی زیدی جاجنیری سادات قدیم ایام سے آباد ہیں۔ یہ لوگ عرب سے کب آئے، کیوں آئے، راہ میں کہاں کہاں قیام کرتے آئے، یہ سب حقائق پردۂ خفا میں ہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندستان پہنچنے کے بعد اول پٹیالہ (پنجاب) میں رکے۔ یہاں انھوں نے بارہ گاؤں بسائے، جن میں مرکزی حیثیت جاجنیر کو حاصل تھی، جس سے جاجنیری کی نسبت ان کے نام کا جزو بن گئی۔

تغلق اور خلجی عہد میں خاندان کے کچھ لوگ شاہی فوج میں شامل ہو کر شرقی علاقوں میں پہنچے۔ ان میں سید احمد جاجنیری، فاتح بہار اختیار الدین بن بختیار خلجی کے لشکر میں شامل تھے۔ ان کا مزار بکساری (ضلع مونگھیر) میں موجود ہے؛ یہی اس خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کے بیٹے سید احمد جان نے اورین فتح کر لیا اور وہیں رخت سفر کھول دیا۔ ضلع مونگھیر کے بیشتر سادات انھیں کے اخلاف ہیں۔ کئی نسلوں تک سپہگری ان کا پیشہ رہا، یا رشد و ہدایت۔ پھر جب حالات بدلے، تو ان میں سے بعض لوگوں نے کشاورزی اختیار کر لی۔

حضرت سید احمدؒ بریلوی (ف: مئی ۱۸۳۱ء) نے انگریزوں کو ہندستان سے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگرچہ اپنوں اور بیگانوں کی مہربانی سے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے، اور بالاکوٹ (صوبۂ سرحد) کے مقام پر شہید ہوئے، لیکن ان کی بدولت ملک کے طول و ارض میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی، جس کے دل میں آزادی کی تڑپ، دین سے گہری وابستگی، اور خلق خدا کی خدمت کا جذبہ تھا۔ ان کے مبائعین میں سید عنایت حسین

ماٰخذ: بیگم شکیلہ اختر، پٹنہ؛ مہر نیمروز، کراچی (اختر اورینوی نمبر)

بھی تھے، جو اختر اورینوی کے پردادا تھے۔

اختر کے دادا امداد حسین دین کے ساتھ دنیا کے معاملات میں بھی ماہر تھے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے: سید خلافت حسین بیرسٹر، سید ارادت حسین، سید وزارت حسین۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میرزا غلام احمد قادیانی مرحوم (ف: مئی ۱۹۰۸ء) نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ بہار میں ان کے مسلک کے پُرجوش اور مستعد مبلغ مولوی ابوالحسن تھے۔ ان کی تبلیغ سے دونوں چھوٹے بھائیوں نے احمدیت قبول کرلی۔ سب سے بڑے بھائی سید خلافت حسین نے اگرچہ یہ دعوت قبول نہیں کی، لیکن وہ بھی اس کے مخالف نہیں تھے۔ احمدیت نے قرآن و حدیث کے مطالعے اور اسلام کی تبلیغ اور افہام و تفہیم پر جتنا زور دیا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان دونوں بھائیوں کے احمدیت میں داخل ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں صبح و شام قال اللہ و قال الرسول کا چرچا رہنے لگا۔ شعائرِ اسلام کی تکریم و تکریم اور پابندی ہر کہ و مہ کا شعار بن گئی، اور ہر وقت تبلیغ و احیاے اسلام کے منصوبے بننے لگے۔

یہ تھا وہ ماحول، جب سید وزارت حسین کے ہاں جمعہ ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء پہلوٹھا بیٹا پیدا ہوا۔ ان کی والدہ اس وقت اپنے میکے کاکو (ضلع گیا) میں تھیں، وہیں یہ ولادت ہوئی تھی۔ بچے کا نام اختر احمد رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر اختر اورینوی کے نام سے سپہرِ ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔

سید وزارت حسین کا نکاح کاکو (ضلع گیا) کے رئیس سید عبدالعزیز کی صاحبزادی خدیجہ (عرف شمسو) سے ہوا تھا۔ خدیجہ کی ننھیال آرہ (ضلع شاہ آباد) میں تھی۔ ان کے نانا سید نورالحسن حکومتِ وقت کے عہدیدار تھے، اور ان کا نجابت و شرافت اور دینی و دنیوی اعتبار سے بہار کے اعلیٰ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔

خدیجہ کے بطن سے ان کے چار بچے ہوئے: اختر احمد، فضل احمد (انسپکٹر جنرل پولیس، بہار) اور دو لڑکیاں زینب اور رقیہ۔ ۱۹۲۵ء میں بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد سید وزارت حسین نے نکاحِ ثانی کیا۔ یہ دوسری بیوی صابرہ بیگم مولوی سید

عبدالماجد مبلغ احمدیہ مدرس فارسی کی نواسی تھیں۔ ان سے بھی ماشاء اللہ چار بچے پیدا ہوئے۔

اختر کی ابتدائی تعلیم سراسر گھر پر ہوئی۔ قرآن شریف مع ترجمہ، اردو، فارسی، انگریزی کی تحصیل اپنے والد، والدہ اور چچا سے کی۔ پھر اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور بالآخر ضلع اسکول، مونگیر سے ۱۹۳۶ء میں دسویں کی سند درجۂ اول میں حاصل کی اور وظیفہ کے حقدار ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے سائنس کالج، پٹنہ میں پہنچے اور ۱۹۲۸ء میں انٹر (سائنس) کا امتحان پاس کیا، اور اب کے بھی وظیفہ پایا۔ چونکہ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے، لہٰذا میڈیکل کالج، پٹنہ میں داخلہ لے لیا۔ لیکن بدقسمتی سے تیسرے ہی سال ان پر سل کا شدید حملہ ہوا، جس سے انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ علاج کے لیے آبائی وطن اورین کا فیصلہ ہوا، چنانچہ وہ دیہات کی کھلی ہوا میں چلے گئے۔ اگلے دو برس اسی فضا میں گزرے، جہاں انھیں کھیتی باڑی، شکار اور سیر و تفریح یا کتب بینی کے علاوہ اور کسی کام سے سروکار نہیں تھا۔ شکر ہے کہ مکمل آرام اور علاج معالجے سے ان کی صحت بحال ہوگئی۔ ۱۹۳۳ء میں واپس آکر وہ پٹنہ کالج کے بی، اے کے درجے میں داخل ہوگئے، کیونکہ معالجوں نے حکم دے دیا تھا کہ اب یہ کوئی ایسا نصاب لیں، جس میں زیادہ محنت درکار ہو، لہٰذا بادل ناخواستہ ڈاکٹری کی تعلیم ترک کر کے بی اے (انگریزی آنرز) پر اکتفا کرنا پڑی۔

۱۹۳۴ء میں عین امتحان کے زمانے میں سل کا دوسرا حملہ ہوا اور اتنا شدید کہ خون تھوکنے لگے۔ لیکن آفرین ہے ان کی قوتِ ارادی کو کہ اب کے انھوں نے ہتھیار ڈال دینے سے انکار کر دیا۔ وطن میں کسی کو بیماری کی اطلاع نہ دی، اور برف چوس چوس کر امتحان کے پرچے لکھے۔ امتحان کے کمرے کے باہر ان کے ایک دوست تعینات تھے، جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے انھیں برف کے ٹکڑے اور رسنگتروں کا عرق بھجواتے رہے۔ بارے، خدا نے ان کی لاج رکھ لی، اور انھیں امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، لیکن صحت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ نہ صرف آگے تعلیم جاری رکھنا محال تھا، بلکہ ڈاکٹروں نے سینی ٹوریم

میں قیام کا مشورہ دیا۔ اس پر انھوں نے ڈیڑھ سال کے قریب رانچی کے نواحی اِٹکی اسپتال میں گزارا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کا شکیلہ سے نکاح ہوچکا تھا، وہ ان کے ساتھ رہیں۔ ان کی رفاقت، دلسوزی اور خدمت اور تیمارداری میں خدا نے برکت دی، اور یہ تندرست ہو کر واپس آئے۔ لیکن ایک پھیپھڑا وہیں اسپتال کی نذر ہوگیا۔

اِٹکی سینی ٹوریم کا قیام اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے ایم اے اردو کی تیاری بھی وہیں بستر پہ لیٹے لیٹے کی۔ القصّہ ۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) درجۂ اول میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں بھی اوّل رہے؛ سونے کا تمغہ انعام میں ملا

یہی وہ زمانہ ہے جب ملک میں ترقّی پسند تحریک کا غلغلہ بلند ہوا۔ اختر بھی اس میں شامل ہوگئے، بلکہ وہ پٹنہ کی شاخ کے نائب صدر چنے گئے تھے۔ جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے، تو انھیں اس عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔

انھوں نے ۱۹۵۶ء میں اپنا تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو ادب کا ارتقاء" لکھا، جس پر انھیں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی سند عطا ہوئی۔ وہ رفتہ رفتہ ۱۹۵۲ء میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر بن گئے تھے۔ پھر جب ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرلی تو اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی کے پروفیسر بنا دیے گئے۔ یہیں سے اگست ۱۹۷۲ء میں بیماری کے باعث قبل از وقت سبکدوش ہونا پڑا۔

ان کی صحت جیسا کہ ذکر ہوا، ۱۹۳۱ء میں بہت خراب ہوگئی تھی۔ یہ زمانہ انھوں نے اورین اورادول (ضلع گیا) میں گزارا تھا۔ ادول میں ان کا ماحول بہت رومان انگیز تھا۔ دریائے سون کا کنارہ اور اس کے قدرتی نظارے، بڑے دلکش ثابت ہوئے۔ اختر کی ایک بہن (یعنی ان کے منجھلے چچا سید ارادت حسین کی چھوٹی بیٹی) صالحہ بیگم ادول کے رئیس سید شاہ محمد توحید کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ جب بیماری کے ایام میں وہ ادول میں رہے تو ان کا شاہ محمد توحید کے خاندان سے ربط ضبط المضاعف ہوگیا۔ آدمی تھے حسین و جمیل، اس پر پڑھے لکھے اور لسان، سب چھوٹے بڑے ان کے گرویدہ ہوگئے۔

خاندان کی لڑکیاں (اور ان کی کھیپ کی کھیپ تھی) ان کے گرد جمع ہو جاتیں، اور یہ ان کے درمیان بیٹھے، راجہ اندر بنے فلسفہ بگھارتے رہتے۔ ایسی فضا شعر و شاعری کے لیے بہت سازگار ثابت ہوتی ہے۔ اختر کی متعدد رومانی نظمیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ جوانی تو "دِوانی" مشہور ہی ہے۔ القصّہ ۲۴ مئی ۱۹۳۳ء کو شاہ محمد توحید کی بڑی صاحبزادی شکیلہ کا نکاح ہو گیا۔ افسوس کہ وہ اولاد سے محروم رہے۔ شکیلہ خود بھی ادب کے میدان میں غیر معروف نہیں؛ شکیلہ اختر کے نام سے افسانے لکھتی ہیں، اور ان کے بعض مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔

اختر کے دادھیال کی خصوصیات کا ان کے کردار کی تشکیل میں نمایاں حصہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے خیالات اور نظریۂ حیات کی تشکیل اور ارتقا میں اوّلاً ان کی ننھیال کا اور اس کے بعد تعلیم احمدیت کا بڑا ہاتھ رہا۔ اختر کی صحت بچپن ہی سے خراب رہی۔ آٹھ سال کے تھے کہ تپِ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ صورتِ حال بہت تشویشناک تھی۔ ان کے والد سیّد وزارت حسین نے عہد کیا کہ اگر یہ بچ گئے تو وہ انھیں دینی خدمت کے لیے وقف کر دینگے۔ خدا نے انھیں شفا دی۔ اس کے بعد انھیں رخسار کی ہڈی میں ناسور کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ عملِ جرّاحی ہوا اور یہ اس سے بھی بچ نکلے۔ والد کی منّت کے پیشِ نظر ڈاکٹر بننے کا عزم کیا کہ آزادانہ زندگی بسر کرینگے، اور یکسو ہو کر خدمتِ دین میں لگے رہینگے۔ میڈیکل کالج میں سل کا موذی مرض آ لگا۔ پھر وجع مفاصل کی شکایت پیدا ہو گئی۔ غرض ساری عمر مختلف عوارض کی آماجگاہ بنے رہے۔ لیکن ہمیشہ ان کے مدِّنظر والد کا عہدِ وقف رہا۔ امام جماعت احمدیہ نے ۱۹۳۹ء میں اپنے متبعین سے مطالبہ کیا کہ وہ خدمتِ دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں اور اپنے ترکہ میں سے ایک مقررہ حصّے کی دینی کام کے لیے وصیّت کریں۔ اختر اپنے خاندانی ماحول میں کتنے کٹّر مذہبی آدمی تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شروع میں وہ اپنا نام سیّد اختر احمد احمدی لکھتے رہے اور نہ صرف اس پر اصرار کرتے، بلکہ فخر محسوس کرتے تھے۔ امامِ جماعت کے اس اعلان پر انھوں نے وصیّت کی۔ وقف تو پہلے

ہی سے موجود تھا) انھوں نے قرآن کا اور اپنے سلسلے کے لٹریچر کا مطالعہ خاص طور پر کیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ جب میرے دل میں کمیونزم کے وسیع مطالعے کے نتیجے میں مخفی طور پر دہریت اور الحاد کے جراثیم سرایت کرنے لگے، تو میرزا بشیر الدین محمود احمد مرحوم (ف: نومبر ۱۹۶۵ء) کی تفسیر کبیر راہ ہدایت ثابت ہوئی۔ کمیونزم کی ریڑھ کی ہڈی اس کا اقتصادی منصوبہ ہے، جسے وہ ساری دنیا میں رائج کرنے کا پرچار کرتے ہیں۔ اختر ۱۹۴۲ء میں اپنے امام کے پاس قادیان گئے۔ اور ان سے اپنے شکوک کا اظہار کیا، جس کے بعد موصوف نے اپنے دو سالانہ خطبوں میں ان مسائل پر اسلامی تعلیم وضاحت سے بیان کی۔ بعد کو یہ دونوں خطبے کتابی شکل میں "نظام نو" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کے مطالعے نے اختر کے تمام شکوک دور کر دیے، اور وہ کمیونزم کے چنگل سے رہا ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں وہ سخت اعصابی مرض میں مبتلا ہو گئے اور در اصل اسی باعث انھیں اگست ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی سے صدارت شعبۂ اردو کے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ شکایت یہ تھی کہ ان کا جبڑا مسلسل حرکت کرنے لگا تھا، جس سے وہ ٹھیک سے بات تک نہیں کر سکتے تھے۔ جب پٹنے اور رانچی کے ماہر ڈاکٹروں کے مشورے سے کوئی افاقہ نہ ہوا، تو وہ بغرض علاج کینیڈا گئے، جہاں ان کی بیوی شکیلہ کے چھوٹے بھائی آفتاب احمد ڈاکٹر ہیں۔ وہاں تقریباً چھ مہینے قیام رہا، لیکن چنداں فائدہ نہیں ہوا اور واپس چلے آئے۔ آخری چھ سات سال اسی اذیت ناک تکلیف میں گزرے۔ یہاں ہندستان میں بھی علاج معالجے میں کوئی کمی نہیں ہوئی، لیکن صحت بحال ہونا تھی، نہ ہوئی۔ اسی میں شب ۳۰/۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء میں آدھی رات کے بعد تقریباً ایک بجے (یعنی پنجشنبہ ۳۱ مارچ، ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ کے اوّلین وقت) کرچی اسپتال پٹنہ میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہ راجعون۔

موصی کی حیثیت سے وہ قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ۳۱ مارچ کی شب میں لاش قادیان گئی اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کے دیرینہ دوست

پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی نے ہجری میں تاریخ کہی:

افسوس، چہکتا ہوا بلبل نہ رہا — رونق گئی گلزارِ ادب کی صد حیف
اختر جو ادب کا اخترِ تاباں تھا — تھا ذہن رسا جس کا، زباں جس کی سیف
تنقید بھی، تحقیق بھی، افسانہ بھی — اشعار بھی ہوتے تھے نہایت پرکیف

فکرِ تاریخ میں تھا افسردہ قلم!
آئی یہ صدا غیب سے: "حیف اختر حیف!"
(۱۳۹۷ھ)

ایک دوسرے دوست جمیل مظہری کے قطعے میں عیسوی اور ہجری دونوں تاریخیں موجود ہیں:

یوں تو اپنی عمر کے لمحے دوستوں کو روتے ہی گزرے
اشک کے بدلے خون ہے لیکن، اس چشمِ نمناک میں اب

ڈوبے اردو تیرے ستارے، ایک تھے اختر وہ بھی سدھارے
تیرے گیسو کون سنوارے، ارضِ ہند و پاک میں اب

ایک چمن آرا کی کہانی، ہے سوکھے پتوں کی زبانی
کرکے خونِ جگر کو پانی، چھڑکے کون اس ہاک میں اب

ہر شاخِ گل پست و بالا، پہنیگی کانٹوں کی مالا
کون کھلائیگا گل و لالہ، اس دشتِ خاشاک میں اب

کس نے جنوں کو ہوش دیے ہیں، اس کے گریباں کس نے سیے ہیں
دیوانے اک زخم لیے ہیں، دامن کے ہر چاک میں اب

بزمِ علم و فن کا اُجالا، ماہ تھا اختر ہم سب ہالہ
رات تو کیا دن بھی ہے کالا، عہدِ ظلمتناک میں اب

جھوٹے لعل اور جھوٹے گوہر چمکینگے بازار کے اندر
کون بھریگا سرمۂ دانش، دیدۂ ہر حکاک میں اب

چپ ہے جمیلؔ خستہ و حیراں، راہ عدم میں سست خراماں
کہہ اے نطقِ پشیماں: "آہ آہ چھپ گئے اختر خاک میں اب"

پوچھا مقام اخترِ ذیشاں، از لبِ ہاتِف بولا رِضواں
"دیکھو ہے وہ مکرم مہماں قصرِ شہِ لولاک میں اب"

(۵ + ۱۳۹۲ = ۱۳۹۷ھ)

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، شکیلہ اختر سے ان کی شادی عشق کا نتیجہ تھی۔ یہ انھیں پیار سے اختر کی جگہ "تارہ یا تارن زنارو) کہا کرتی تھیں۔ انھوں نے اس حادثے سے متاثر ہوکر چند شعر کہے؛ شعر کیا ہیں، ایک غم زدہ اور دکھی دل کی کراہ ہے۔ چاہتا ہوں کہ انھیں محفوظ کر دیا جائے:

جو لرز رہے تھے اب تک، در و بام زندگی کے
وہ کھنڈر رسا رہے ہیں بڑے درد کا فسانہ
وہ بہت تھکا ہوا تھا، اسے نیند آ گئی ہے
نہ سلا سکی تھی جس کو کبھی گردشِ زمانہ
بڑے غم کی داستاں تھی، بڑے کرب کی کہانی
دلِ مضطرب تڑپ کر جو بنا تھا اک ترانہ
جو بھنور سے کھیلتا تھا، رہا غم میں مسکراتا
جو جلا تھا آندھیوں میں، وہ چراغ بجھ چکا ہے
یہ فضا دھواں دھواں ہے، کہ جلا ہے آشیانہ
جہاں بجلیاں گری تھیں، وہ چمن سلگ رہا ہے
میرا کعبۂ محبّت، میری ہر خوشی کا مرکز
میرا کاروانِ الفت، سرِ شام ہی لٹا ہے
اسے آہ! کیسے ڈھونڈوں؟ کہ ہے شب جہاں اندھیرا
انہی رفعتوں سے آگے، وہ کہاں چلا گیا ہے

مرحوم نے اردو زبان کی جو بیش بہا خدمت کی ہے، وہ بھولنے کی چیز نہیں۔ ان کی پندرہ بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک ڈراما، اور بیسیوں افسانے ہیں؛ ایک

ناول بھی ہے؛ تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے ہیں؛ تحقیقی مقالہ ہے؛ شعری تخلیقات کا ایک مجموعہ ہے۔ غرض ہر صنف کلام میں ان کے کارنامے موجود ہیں۔ غیر مطبوعہ تحریریں بھی کچھ کم نہیں، ایسے خادم ادب اور مربی زبان کو کون بھلا سکتا ہے:

اختر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انھوں نے جس رنگ کی تعلیم پائی اور جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی، اس کے بعد وہ غزل کی گوں کے رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے بعض معرکے کی رومانی نظمیں کہی ہیں، جو ان کے مجموعوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی غزل کے چند شعر دیکھیے؛ ان میں بھی نظم کا رنگ نمایاں ہے:

دارِ وے ہوش ربا نرگسِ بیمار تو ہو
اب عنانگیرِ خرد گیسوے خمدار تو ہو

حسن کا نازِ تجلی ہے نیاز آمادہ
عشق آدابِ تمنا کے سزاوار تو ہو

جرأتِ شوق سے پندارِ کرم جھک کے ملے
حوصلہ مند کوئی ایسا گنہگار تو ہو

دل ہی میزانِ محبت میں گراں تلتا ہے
آرزو رونقِ بزمِ رسن و دار تو ہو

لالہ کاری سے رگِ جاں کی گلستاں مہکے
ہر نفس ایک لچکتی ہوئی تلوار تو ہو

دل سے وہ جلوہ گہِ ناز تو کچھ دور نہیں
سینۂ شوق میں اک جذبۂ بیدار تو ہو

بامِ محبوب پہ بیتاب نظارے ہونگے
سجدہ گاہِ دل و جاں کوچۂ دلدار تو ہو

ان حسیں آنکھوں میں میخانے کی شامِ رنگیں
جگمگائیگی، مگر اختر سرشار تو ہو

مری آگہی بھی فریب ہے، مری عاشقی میں جنوں سہی
تب و تابِ قدرِ حیات بھی، یہی شوق خانہ خراب ہے

ترے حسن سے مری نغمگی، تری دلبری مری شاعری
نہ فراق ہے، نہ وصال ہے، نہ گناہ ہے نہ ثواب ہے

تری نظر کہ تجلی بھی ہے، حجاب بھی ہے
سوال صاف ہے، لیکن یہ لاجواب بھی ہے

اب ستم میں فسردگی سی ہے — کیا تعلق میں کچھ کمی سی ہے
ہو چکا جینا، اب تو خیر نہیں — آتشِ غم بجھی بجھی سی ہے

اختر! تمھارا تقویٰ، اور وہ بہارِ ناز — مینا بدوش، ہاتھ میں شیشہ لیے ہوئے

تیرے نصیب میں کہاں سوزِ یقیں، گدازِ غم — جانے تو کیا کہ دل نشیں میرے لیے ہے نازِ غم
میں نے گلے لگائی تھیں دردِ اثر خموشیاں — بول اٹھا سکوت ہی، چھپ نہ سکا یہ رازِ غم
جس کے لیے تجلیاں حسنِ خیال و دردِ زیست — جادۂ زندگی اُسے سلسلۂ درازِ غم
آرزوِ دل کی زندگی، زہر بھی ہے نشاط بھی — رقصِ حیات دم بدم، شعلہ بجاں لباسِ غم
حُسن کی بیقراریاں، یہ بھی ہے اک مقامِ عشق — میرے دلِ حزیں کو ہے تجربۂ نیازِ غم
اختر زار سے کہو، شوق کے مرحلے ہیں اور — جلوۂ خاصِ حسنِ عام، طور نہیں فرازِ غم

تم کو دیکھا ہے ابھی ایسا گماں ہوتا ہے — نقش جو دل میں ہے، آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے
ذکر خود چھیڑ کے، رو دیا کیا پہروں، اختر — نام آتے ہی ترا، اشک رواں ہوتا ہے

فضا شمسی، محمد صدر الدین سید

ریاست بہار کا قصبہ بہار شریف اس لحاظ سے مشہور اور متبرک و مقدس بھی ہے کہ یہاں آٹھویں صدی کے مشہور صوفی مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا مزار ہے۔ اسی بہار شریف میں محمد صدر الدین ایک متوسط گھرانے میں ۷ مئی ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ تین مہینے کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی تربیت اور دیکھ بھال کا فرض ان کے بڑے بھائی (ڈاکٹر) نجم الدین احمد پر آپڑا جسے انھوں نے پوری ذمہ داری سے نبایا۔

خاندان اپنے ماحول کے باعث مذہبی تھا، اس لیے جب یہ سن شعور کو پہنچے، تو چند دے گھر پر پڑھنے کے بعد مقامی مدرسۂ عزیزیہ میں دینیات اور عربی کی تحصیل کے لیے بھیج دیے گئے۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں "مولوی" کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد پٹنہ چلے آئے اور مشہور مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لے لیا۔ دو سال بعد ۱۹۳۲ء میں یہاں سے "عالم" کا امتحان پاس کیا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ جو "شمسی" کی نسبت لکھتے تھے، یہ اسی سند کے باعث تھی۔

عالم کی سند لینے کے بعد وہ سال بھر کے لیے وطن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انگریزی کے دسویں کی تیاری کی اور ۱۹۳۳ء میں میٹرک پاس کر لیا۔ واپس آکر پٹنہ کالج میں داخل ہوگئے، جہاں سے ۱۹۳۶ء میں بی اے کا امتحان فرسٹ کلاس عربی آنرز کے ساتھ پاس کیا۔ اس زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی میں عربی میں ایم اے کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، اور ایسے تمام طلبہ کو وظیفہ دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیا

ماخذ: دیباچہ نکہت و خلش

جاتا تھا ۔ چنانچہ محمد صدر الدین بھی علی گڑھ چلے آئے ، اور یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۸ء میں ایم اے (عربی) کی درجۂ اول میں سند حاصل کی ۔

اگلے تین چار برس تلاش روزگار میں سرگرداں رہے ۔ عارضی طور پر دو تین جگہ کام کیا ، لیکن کہیں مستقل صورت پیدا نہ ہو سکی ۔ ۱۹۴۱ء میں ان کا نام ڈپٹی کلکٹری کے لیے منظور ہو گیا تھا ، لیکن یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور حکومت وقت کو فوجی خدمات سرانجام دینے والوں کی دلدہی اور خوشنودی مدِ نظر تھی ۔ اعلان ہوا کہ نصف اسامیاں جنگ سے واپس آنے والے موزوں اُمیدواروں کو دی جائیں گی ۔ چونکہ مسلمانوں کے لیے صرف دو جگہیں مخصوص تھیں ، لہٰذا محمد صدر الدین سے اوپر کے مسلمان کو جگہ مل گئی اور انھیں نظر انداز کر دیا گیا ۔ اس پر بڑی حیص بیص کے بعد انھوں نے سب ڈپٹی کلکٹری قبول کر لی ۔ لیکن سرکاری ملازمت کے ماحول اور مقتضیات کو اپنے میلان طبع کے منافی دیکھ کر وہ جلد ہی اس سے مستعفی ہو گئے ۔

اس دوران میں انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے پہلے فارسی اور پھر اُردو ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا تھا ۔ ملازمت کا جوا اُتار پھینکنے کے بعد انھوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا ۔ اولاً تھوڑی مدت کے لیے گیا اور پھر مظفر پور کے کالجوں میں فارسی اور اُردو کے مدرس رہے ؛ اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں مستقلاً پٹنہ کالج کے شعبۂ اردو میں تقرر ہو گیا ۔ یہاں انھوں نے تدریس کے علاوہ تحقیق پر بھی توجہ کی ۔ شاہ آیت اللہ جوہری کے حالات جمع کیے اور ان کی مثنوی "گوہر جوہری" کو مرتب کیا ؛ اور "شاہ آیت اللہ جوہری : حیات اور شاعری" کے عنوان سے مقالہ لکھا ، جس پر انھیں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی سند عطا ہوئی ۔

جب بہار ایجوکیشنل سروس کی طرف سے شعبۂ اُردو میں درجۂ اول کی ایک اسامی کا اعلان ہوا ۔ تو سب سے پہلے اس پر اختر اورینوی کا تقرر ہوا ۔ جو اس وقت صدر شعبہ تھے ۔ جب ۱۹۶۰ء میں وہ یونیورسٹی پروفیسر مقرر ہو گئے ، تو ان کی جگہ محمد صدر الدین صاحب کو ملی ۔ یہی ۱۹۷۲ء میں بھی پیش آیا ، یعنی اختر اورینوی کے سبکدوش ہونے

پر یہ اُن کے جانشین ہوئے۔

پٹنہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں وہ چند مہینے کے لیے عارضی طور پر اس کے پرنسپل بھی رہے۔ جب ۱۹۷۳ء میں بہار اُردو اکاڈمی قائم ہوئی، تو وہی اس کے پہلے سکرٹری بھی تھے؛ وہ اس عہدے پر دو سال تک رہے تھے۔ ان کی موت اچانک اور حیرتناک حالات میں ہوئی:

۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء کے اوّلین وقت میں اختر اورینوی مرحوم کا انتقال ہوا تھا۔ ۳۱ مارچ کو ان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں محمد صدر الدین کئی مرتبہ مرحوم کے مکان پر گئے۔ اسی شام پٹنہ ریڈیو نے اختر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کو ان کے چند دوستوں کو مدعو کیا؛ ان میں محمد صدرالدین بھی تھے۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا خاتمہ اس شعر پر کیا:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

ریڈیو پر تقریر کرنے کے بعد وہ پھر اختر مرحوم کے مکان پر گئے، جہاں ان کی لاش کو تابوت میں رکھ کے قادیان لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ وہ ایک زمانے سے فشارِ دم (ہائی بلڈ پریشر) کے مریض تھے۔ دن بھر کوفت اور پریشانی میں گزرا تھا۔ اب جو انھوں نے یارِ دیرینہ کی لاش کو آخری مرتبہ دیکھا، تو تاب نہ لا سکے۔ سر چکرایا، اور طبیعت بگڑ گئی۔ فوراً انھیں مکان پہنچایا گیا۔ ان کے ایک صاحبزادے خود ڈاکٹر ہیں، انھوں نے کچھ فوری علاج کیا اور انھیں پٹنہ جنرل اسپتال لے گئے۔ وہیں شب میں اللہ کو پیارے ہوگئے (۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء)۔ اگلے دن (یکم اپریل) جب اس غیر متوقع اور ناگہانی حادثے کا اعلان ہوا، تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ بلکہ بعض لوگوں نے اسے اپریل فول خیال کیا۔ دوسروں کو شبہہ ہوا کہ غلطی سے اختر اورینوی کی جگہ محمد صدرالدین کا نام لیا جا رہا ہے۔

اسی دن شاہ گنج قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

عطا کاکوی نے، ہجری میں قطعۂ "تاریخِ وفات کہا:

کل ہی اختر کو رو چکے تھے سب آج یہ صدر دین کا غم ہے

زندگی میں رفیق تھے دونوں
مرنے پر بھی یہ ربط باہم ہے
موت کیسی ہوئی اچانک، ہائے
یہ خبر سن کے غم سے سر خم ہے
مل رہے ہیں سبھی کفِ افسوس
اور اشکوں سے آنکھ پُرنم ہے
کتنوں کو تو یقیں نہ ہوتا تھا
کتنا گیسوے اُردو برہم ہے

سرِ افسوس کو جھکا کے عطاؔ!
بولا ہاتف: "فضاؔ کا ماتم ہے"
(۱۳۹۸-۱=۱۳۹۷)

اخترؔ قادری کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے:

یاس کا سر جوڑ کر سالِ وفات
بولا ہاتف: "ہائے صدر الدین فضاؔ"
(۱۳۹۷=۱۳۸۷+۱۰)

محمد صدر الدین نے دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ اس بیوی سے دو بچے ہوئے: ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ لیکن اس بیگم سے نبھ نہ سکی اور علیحدگی ہوگئی۔ دوسری بیگم سے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔
محمد صدر الدین مرحوم نے شعر گوئی مدرسۂ عزیزیہ کی طالب علمی کے زمانے ہی میں شروع کر دی تھی۔ شروع میں کلام پر چند دن حافظ شفیع فردوسی سے اصلاح لی۔ اس زمانے میں یہ ہلالؔ تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے دوست محمد یحییٰ (دانگلہ، گیا) کا بھی یہی تخلص ہے، تو اسے ترک کر کے فضاؔ تخلص اختیار کر لیا۔ پٹنہ آئے، تو یہ شوق یہاں بھی جاری رہا۔ اس زمانے میں نوح ناروی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کا پٹنے کا اکثر پھیرا رہتا تھا۔ فضاؔ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو چار غزلوں پر ان سے اصلاح لی۔ پٹنہ کالج کی طالب علمی کے دور میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر عظیم الدین احمد بیدلؔ، اور ثمرؔ آروی سے بھی کچھ مشورہ رہا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ باقاعدہ کسی کے سامنے زانوے ادب تلمذ کیا، نہ کسی سے زیادہ مدت اصلاح ہی لی۔ کسی جگہ بھی معاملہ دو تین غزلوں سے آگے نہیں بڑھا۔ شروع میں زیادہ تر توجہ نظم کی طرف رہی، بعد کو

غزلیں بھی کہنے لگے ۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "نکہت و خلش" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے رٹپنہ : ۱۹۷۴ء) نظموں کا مجموعہ "شگفتہ کانٹے" کے نام سے تیار ہوا تھا معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا ۔ !

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؛ یہ "نکہت و خلش" سے لیے گئے ہیں :

کیا ہوش کی باتیں ہوں، اب ہوش کہاں ہم میں
اور ہوش بھی آجائے، تو ہوش سے کیا ہوگا!

رنگِ شفق میں لالۂ خونیں کفن کی بات
پہنچی کہاں کہاں یہ ترے بانکپن کی بات

ہر بات میں سلیقۂ گفتار چاہیے
وہ مکر و فن کی بات ہو یا فکر و فن کی بات

ہے مضمحل جنوں تو خرد منفعل، فضا!
کس انجمن میں چھیڑ دی، کس انجمن کی بات

ہر اضطراب حماقت، ہر انتظار عبث
کسی کے وعدۂ فردا پہ اعتبار عبث

بہار ہے کہ خزاں، کچھ پتا نہیں چلتا
ہر اک مشاہدۂ چشمِ اعتبار عبث

یہ فصلِ گل نہیں، فصلِ خزاں ہے
چبھیگا خار بن کر، ہر گلِ تر

جو کانٹوں میں وفا کی آبرو ہے
کہاں وہ بات پھولوں کو میسّر!

عشق کیا اور عقل کیا، ہے زندگی یکسر تلاش
دردِ دل سے تنگ ہو تو کرلو دردِ سر تلاش

مجبورِ احتیاط کو تابِ نظر کہاں
مایوسِ التفات کو دیدار سے غرض

صحنِ چمن میں رہنے دے، آخر چمن تو ہے
پھولوں سے کام تجھ کو، ہمیں خار سے غرض

دلِ بے آرزو دے کر، جہاں کی سیر لازم ہے
طلب جس میں ہو، اس قلبِ پریشاں کا خدا حافظ

میں نثار اس تھکن کے، ترے در پہ جو بٹھا دے
جو نہ اٹھنے دے یہاں سے، ہے وہ خستگی مبارک

اٹھتے ہی جا رہے ہیں حجاباتِ رنگ و بو
گرتے ہی جا رہے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

کتنی تم سے ہمیں محبت ہے
جانتا ہے خدا، خدا کی قسم!

ازل سے دشتِ تمنا کی گرد ہے انساں
مگر یہ گرد کدھر جائیگی، خدا معلوم!

عشق کا دردِ سر، خریدے کون!
عقل! تیرا عذاب کیا کم ہے!

پہلے جو تھی، ہماری وہ حالت ہے آج بھی
کوتاہ دستیوں سے شکایت ہے آج بھی

جب یوں ہی آہِ سرد بھرنا ہے
تو یہ جینا نہیں ہے، مرنا ہے
خار تو خار ہیں، چبھینگے، ضرور
ہم کو پھولوں سے بھی تو ڈرنا ہے

یہ موسمِ گل ہے، اے ناداں! لے پھول سے بھر دامن اپنا
رہ رہ کے تقاضہ ہوش کا ہے، گلچیں کا فقط الزام نہ لے

ہر نقشِ پا کو دیکھ کے سجدے میں جھک گئے
شاید اسی طرح سے، تری رہگذر ملے
مجبوریوں کو کوئی ٹھکانا نہ مل سکا
لیکن قدم قدم پہ، خداؤں کے گھر ملے

اشک سنبھلی، محمد ظفر، سیّد

سنبھل کے معزز اور صاحبِ علم متوّلی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے دادا سیّد حاکم علی عربی فارسی کے عالم تھے۔ اشک کے والد سید امراؤ علی مرحوم بھی ممتاز عالم اور فارسی کے استاد تھے۔ وہ اولاً محکمۂ پولیس میں ہیڈ کانسٹبل کے عہدے پر رہے۔ انگریزوں کا زمانہ تھا، یہاں ان کی نبھ نہ سکی۔ چنانچہ مستعفی ہو کر وطن چلے آئے اور ایک مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کو وظیفۂ حیات بنا لیا۔ ان کا ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو انتقال ہوا۔ محمد ظفر کے نانا سیّد محمد شاہ موجز اُردو، ہندی اور فارسی کے عالم اور ماہرِ ریاضیات تھے؛ شعر بھی کہتے تھے، ان کا دیوان موجود ہے۔

اشک ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بلکہ ماحول کی مناسبت سے قرآنِ مجید تک حفظ کیا۔ پھر تحصیلی اسکول، سنبھل سے مڈل پاس کیا۔ چونکہ خاندان کی مالی حالت تسلّی بخش نہیں تھی، اس لیے کسبِ معاش کا بار کندھوں پر آ پڑا۔ میونسپل بورڈ کے چنگی کے محکمے میں محرّر مقرر ہو گئے۔ افسوس کہ محمد ظفر کی تعلیم ناقص رہ گئی۔ کچھ خاندانی ماحول کا اثر، کچھ دوست احباب کی صحبت کی بدولت، جلد ہی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ابتدا میں چندے ظفر تخلص کیا، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ سنبھل میں پہلے سے دو ظفر تخلص کے شاعر موجود ہیں، تو اسے ترک کر کے اشک اختیار کر لیا۔ مشورہ الحاج کنور محفوظ علی خاں محفوظ سنبھلی سے رہا اور جب ان سے اصلاح لینا ترک کر دی، تو جو کچھ کہتے، خود ہی اسے بنظرِ اصلاح دیکھ لیتے۔ غزلوں کا مجموعہ "امواجِ تغزل" ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔

ماخذ: دیباچۂ امواجِ تغزل؛ جناب سعادت علی صدیقی، ایم جی ایم ڈگری کالج، سنبھل

اختلاجِ قلب کا موذی [illegible] عمر بھر سوہانِ روح رہا۔ آخر کار دوشنبہ ۱۴ اپریل ۱۹۷۷ء کو
بعدِ ظہر سنبھل میں [illegible] ہوا۔
نمونے کے طور [illegible] ملاحظہ ہوں:

یوں کھچا جار[illegible]ج تو دل — جیسے مجھ کو بلا رہا ہے کوئی

اشک ! [illegible] اس شب کی سحر — آج مایوس ہیں کچھ شام سے ہم

نہ پوچھ [illegible] سے ہے مرے فرطِ شوق کا عالم — ہر ایک غم کو ترا غم بنا لیا میں نے

محبت میں مقام ایسے بھی مجبوری کے آتے ہیں
جہاں ہر تہمتِ بیجا پہ ہاں کہنا ہی پڑتا ہے
جب انساں کی نظر میں وسعتیں ہو جاتی ہیں پیدا
تو ہر ذرّے کو پھر اُن کا آستاں کہنا ہی پڑتا ہے

کچھ توقع پہ اشک ہم جیتے — گر نہ ہوتی اُمید مرنے کی

مجھے تو دیر بھی، کعبہ بھی، میکدہ بھی عزیز — کہ سب یہ اہلِ محبت نے گھر بنائے ہیں

بیقرار دل کے کون کام آیا — نا امیدی ہی کام آئی ہے
اشک پھر دل پکڑ کے بیٹھ گیا — پھر کوئی بات یاد آئی ہے

دیکھیے کس شکل میں آئے سحر — رنگ ہے آج اور شب کا شام سے

بہر گام کانٹے ہیں راہِ جہاں میں کہاں تک [illegible]ئی دامن بچا کے

ہے اشک! جشن کسی غم کی آمد آمد کا یہ بے سبب جو م[illegible] اک خوشی سی ہے

دوست کبھی آئے، تو رسمی پرسشیں ہی کر گئے کون جاتا ہے کسی نصیبلات میں

یوں غیر کر رہے ہیں ستم ہم پہ بےخطر جیسے ہمارے سر پہ ہمارا کے داد سیں

نازعالہ

اگر دشوار ہے دنیا میں جینا تو مر کر بھی کچھ آسانی نہیں ہے

یہ اور بات، پہنچے ہر اک جا مرے قدم نسبت رہی جبیں کو ترے آستاں کے ساتھ

وہ ایک ہم ہیں جو زندہ ہیں موت کی خاطر وگرنہ لوگ تو مرتے ہیں زندگی کے لیے

اے اشک! محبت مری فطرت میں ہے شامل اور مجھ کو محبت ہی سزاوار نہیں ہے

نہ کر، اے اشک! باتیں چپکے چپکے اپنے دل سے بھی
یہ دنیا ہے، یہاں سرگوشیاں بنتی ہیں افسانہ

آ گیا عشق میں جینے کا سلیقہ مجھ کو دل کو یہ عادت صدمات کہاں تھی پہلے

اسلم لکھنوی، محمد اسماعیل

۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب محمد علی تمباکو کا کاروبار کرتے تھے گھر کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ محمد اسماعیل کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم ہو سکتی۔ لہٰذا مدرسے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کی جوانی اور قومی تحریک کا شباب گویا ہمعصر تھے۔ یہ اس زمانے میں شعر کہنے لگے تھے۔ چنانچہ کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں حصّہ لینے لگے۔ یہاں خاص طور پر مولانا محمد علی جوہر (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) اور مولانا عطا اللہ شاہ بخاری (ف: اگست ۱۹۶۱ء) کی زیر نگرانی و ہدایت کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے، جس کے باعث وہ قوم پرستانہ رنگ میں شرابور ہو گئے۔ ناممکن تھا کہ ان کی سیاسی نظمیں حکومت کی نظر سے نہ گزرتیں۔ چنانچہ گرفتار ہوئے، اور نوبت قید و بند تک پہنچی۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے کئی مرتبہ قید ہوئے۔

شعر گوئی میں انھوں نے ابوالفضل شمس لکھنوی مرحوم سے مشورہ کیا، جو خود امیر مینائی اور مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ اسلم نے ابتدا نظم سے کی تھی کیونکہ سیاسی جلسوں میں ان ہی کی مانگ تھی۔ ۱۹۴۰ء سے انھوں نے غزل کی طرف توجہ کی اور اس میں بھی امتیاز پیدا کر لیا۔

اسلم نے صحافت ملکی میں بھی دلچسپی لی۔ حافظ علی بہادر خان (ف: نومبر ۱۹۶۷ء) نے کسی زمانے میں بمبئی سے "ہلالِ نو" اور "حقیقت" دو روزنامے جاری کیے تھے۔ اسلم ان کے ادارۂ تحریر میں شامل رہے۔ پھر مختلف اوقات میں متعدد روزناموں (نقارہ، کامران، کاروان، پاسبان) کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور بالآخر ۱۹۴۰ء میں

ماخذ: قومی آواز (۱۹ جون ۱۹۷۷) ؛ سلیم عمر (پسر مرحوم)، لکھنؤ

انھوں نے اپنا ذاتی روزنامہ "منزل" جاری کیا، جو سال بھر کے اندر مالی مشکلات کے باعث بند ہوگیا۔

۱۹۳۶ء میں کانگریس نے پہلی مرتبہ دستور ۱۹۳۵ء کے تحت مختلف صوبوں میں حکومت کی تشکیل کی تھی۔ اس سلسلے میں یوپی کانگریس نے ایک پارلیمانی بورڈ بھی قائم کیا تھا۔ اس میں ہندی اور اردو کے الگ الگ نشر واشاعت کے شعبے تھے۔ ہندی طبقے کے سربراہ مرحوم لال بہادر شاستری (ف: جنوری ۱۹۶۶ء) تھے اور اردو کے اسلم مرحوم۔ اسی زمانے میں اسلم کی قومی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ بھی "ترانے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا ۱۹۴۰ء میں یحییٰ گنج وارڈ، لکھنؤ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔

ان کی پوری عمر آزادانہ گزری۔ پہلے مدتوں اپنے والد کی تمباکو کی دکان ذریعہ معاش رہی۔ جب قومی تحریک میں حصہ لینے لگے، تو قدرتاً اس پر پوری توجہ نہ دے سکے؛ اور جب جیل کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا، تو وہ بند ہی ہوگئی۔ تحریک آزادی کے دور کے متعدد حضرات جن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور جن کے ساتھ انھوں نے قید و بند کی سختیاں جھیلی تھیں (مثلاً موہن لال سکسینہ اور رفیع احمد قدوائی) بعد کو حکومت کے ممتاز عہدوں پر متمکن ہوگئے اور وزیر کبیر بن گئے۔ لیکن وہ کبھی کسی کے پاس نہیں گئے، نہ پرانی دوستی کو مطلب برآری کا ذریعہ بنایا۔ ان کا ایک شعر ہے:

عجیب اسلم کی ہے طبیعت، ملی ہے غنچوں کی ان کو فطرت
خوشی ہے تو مسکرا رہے ہیں؛ الم ہے تو مسکرا رہے ہیں

افسوس ہے کہ ان کے رفقائے دیرینہ نے بھی انھیں بھلا دیا اور ان کی خبر گیری نہ کی۔ اسی کی دبی زبان سے شکایت کرتے ہیں:

میخانے میں ساغر بھی چلے، پھول بھی برسے
میں بیٹھا رہا، میری طرف جام نہ آیا

خوددار آدمی کے لیے" دوگونہ عذاب" ہے۔ گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل۔
جب تک قوا ٹھیک رہے، کسی نہ کسی طرح کھینچ لے گئے۔ لیکن عمر کے تقاضوں کو کون روک سکتا ہے! رفتہ رفتہ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ اس پر وہ درگاہ شاہ مینا میں مقیم ہو گئے جہاں ان کے ایک شاگرد صابر علی ساغر مینائی ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ آخری ڈیڑھ دو سال بالکل بستر پر گزرے، چلنے پھرنے تک سے معذور ہو گئے تھے۔ ٹھیک سا علاج معالجہ بھی نہیں ہوا! اسی میں اتوار ۲۴ اپریل ۱۹۷۷ء دوپہر ایک بجے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ اسی شام جنازہ اٹھا اور انھیں قبرستان عیش باغ میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ان کی بیگم کا نام صدیقۃ النسا بیگم ہے۔ بفضلہ یہ زندہ ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی جن کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے گھر بار والی تھیں۔ افسوس، وہ تین بچے چھوڑ کے ۱۹۶۴ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان سے چھوٹے ایک بیٹے سلیم عمر ہیں، جو روزنامہ قومی آواز میں کام کرتے ہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "مشعل" کے عنوان سے ان کی وفات سے کچھ قبل شائع ہوا تھا (لکھنؤ: ۱۹۷۶ء)۔ بچے کھچے کلام کا مجموعہ "باقیاتِ اسلم" کے نام سے وفات کے بعد چھپا (لکھنؤ، ۱۹۸۰ء)۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

میں جانتا ہوں خوب نشیب و فراز کو　　گزری ہے عمر اپنی بہار و خزاں کے ساتھ
شبنم کے اشک، گل کی ہنسی، کاروانِ نور　　ان سب کی زندگی ہے مرے آشیاں کے ساتھ

وہ مل گئے ہیں تو یوں ہیں مسرتیں دل کو　　کہ جیسے کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ لی میں نے

وہ بدنصیب اگر جائے تو کہاں جائے　　جسے سکوں ترے در کے سوا نہیں ملتا

جگر میں درد، دل میں زخم، آنکھوں سے لہو جاری　　یہ میری زندگی حسن و محبت کی کہانی ہے

اُف گئے، اور بے بلائے ان کی محفل میں گئے
ہو گئے مجبور آخر اضطرابِ دل سے ہم

خونِ ناحق کی ہے پُرسش، ذرا سنبھلے رہیے
بات محشر میں بگڑ جائے نہ گھبرانے سے

آنکھوں سے مری پوچھو دلِ زار کا عالم
بیمار بتا سکتا ہے بیمار کا عالم!
صیّاد! یہاں برق، وہاں جاؤں کہاں میں
جو حال قفس کا، وہی گلزار کا عالم!

وہ آرزو نہیں، پیغامِ موت ہے اسلم!
جو دل میں گھٹ کے رہے اور زباں پہ آ نہ سکے

رہے تنہا تو چُنوائے جنونِ عشق نے تنکے
چلے جب کارواں بن کر تو گردِ کارواں ہم تھے
ہمارے دم سے روشن تھا چمن، فصلِ بہاری میں
ہمارا آشیاں تھا اور چراغِ آشیاں ہم تھے
اب اسلم ہنس رہے ہیں ہم پہ یہ کون و مکاں والے
کبھی وہ دن بھی تھے، جب زینتِ کون و مکاں ہم تھے

بہار آئی، کھلے غنچے، مسکرایا چمن
مگر فسردہ دلوں کو نہ کچھ قرار ملا
خموش تھے تو بڑے لطف سے گزرتی تھی
کھلی زبان، تو اسلم! پیامِ دار ملا

عشق میں رسم نہیں سعیِ علاج، اے اسلم!
درد خود بڑھ کے نہ کیوں درد کا درماں ہو جائے

عجیب اسلم کی ہے طبیعت، ملی ہے غنچوں کی ان کو فطرت
خوشی ہے تو مسکرا رہے ہیں، الم ہے تو مسکرا رہے ہیں

مری شرحِ تمنا پر وہ یوں خاموش ہیں جیسے
خدا نا کردہ ان کے حسنِ ظن کی آزمائش ہے
بہاریں گل بدوش و گل بداماں رقص فرما ہیں
چمن میں پھر مرے دیوانہ پن کی آزمائش ہے

ٹھہرا دیا دنیا نے مجھے مجرمِ الفت — اور ان کی نگاہوں پہ کچھ الزام نہ آیا

فکرِ فردا ہے، نہ امروز کا غم ہے ہم کو — اب تو جو کچھ ہے، ترا لطف و کرم ہے ہم کو
اک نشیمن کے تو جلنے کی کوئی بات نہیں — ہاں، گلستاں سے بچھڑنے کا الم ہے ہم کو
مسکراتے ہیں مگر پھیر کے ہم سے نظریں — یہ مسرت بھی تو من جملۂ غم ہے ہم کو
بات یہ اور ہے، کچھ اپنی زباں سے نہ کہیں — ورنہ ہونے کو تو احساسِ ستم ہے ہم کو

نہ رُت بدلی، نہ گُل بدلے، نہ رنگِ گلستاں بدلا
مگر کچھ سوچ کر ہم نے قفس سے آشیاں بدلا

جب کبھی ان کی جستجو کی ہے — ہر قدم پر نگاہ چُوکی ہے
انتہا یہ بھی جستجو کی ہے — عمداً ترکِ آرزو کی ہے
سُن کے قاصد کی بات، یوں خوش ہوں — جیسے خود ان سے گفتگو کی ہے

Scanned with CamScanner

لائق لکھنوی، محمد ہادی، سیّد

دنیائے علم وادب کا یہ حیرتناک اور غالباً واحد معجزہ ہے کہ کسی ایک خاندان کی دس نسلوں نے مسلسل کم و بیش ڈھائی تین سو سال تک کسی ملک کے ادب کو مالامال کیا ہو۔ خاندان انیس نے یہ کر دکھایا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے سب سے پہلے فرد جو ہرات سے ہندستان آئے، ان کا نام میر امامی موسوی تھا۔ یہ شاہ جہان بادشاہ کا زمانہ تھا۔ یہاں ان کی مناسب آؤبھگت ہوئی۔ سہ ہزاری ذات منصب ملا، اور اپنے ہمعصروں میں عزت آبرو سے بسر ہونے لگی۔ وہ غالباً شاعر بھی تھے۔ دو تین نسل تک خاندان کی زبان فارسی رہی، تا آنکہ ان کے پرپوتے میر غلام حسین ضاحک (ف: ۱۱۹۶ھ / ۸۲-۱۷۸۱ء) نے اردو کی طرف بھی توجہ کی۔ ان کے میرزا سودا سے ہزلیہ معرکوں کا کچھ حال "آبِ حیات" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا دیوان بھی دستیاب ہو گیا ہے، اگرچہ یہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ مثنوی "سحرالبیان" کے مصنفِ شہیر میر حسن انھیں میر ضاحک کے صاحبزادے تھے۔ میر حسن کا یکم محرم ۱۲۰۱ھ (۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا؛ وہ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خان کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے تھے۔ میر حسن کے تین بیٹے تھے[٥]: میر حسن خلق، میر مستحسن خلیق (ف: ۱۲۶۰ھ / ۴۵-۱۸۴۴ء)، میر احسان مخلوق؛ تینوں شاعر تھے، خلق اور خلیق تو صاحبِ دیوان ہوئے۔

ماخذ: اسلافِ میر انیس (مسعود حسن رضوی)؛ علی احمد دانش زیدی (اسیرِ مرحوم)، لکھنؤ؛ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ: اپریل ۱۹۸۰ء

٥ بعض لوگوں نے چار بیٹے لکھے ہیں۔ لیکن یہ غالباً ٹھیک نہیں (دیکھیے اسلافِ میر انیس: ۸۰-۸۱)

میر ببر علی انیس (ف: ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ / ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء) منجھلے بھائی میر مستحسن خلیق کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان سے چھوٹے دو بھائی اور تھے: میر مہر علی انس (ف: ۶ محرم ۱۳۱۰ھ / ۳۱ جولائی ۱۸۹۲ء) اور میر نواب مونس (ف: ۱۲ شوال ۱۲۹۲ھ / ۱۱ نومبر ۱۸۷۵ء) تینوں بھائی بلند مرتبہ شاعر اور مرثیہ گو تھے؛ لیکن جو شہرت انیس کو نصیب ہوئی، اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔

انیس کے تین صاحبزادے ہوئے: میر خورشید علی نفیس (ف: ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ / ۴ مارچ ۱۹۰۱ء)، سید عسکری رئیس (ف: ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ / ۳ دسمبر ۱۸۹۱ء)، میر محمد سلیس (ف: ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ / ۲۹ نومبر ۱۸۹۰ء) یہ تینوں بھی شاعر تھے اور تینوں مرثیہ گو۔ خدا کی شان کہ سلیس کا سلسلہ نہ چلا، اگرچہ ان کے تینوں بیٹے شاعر ہوئے: سید محمد نواب غیور، سید ابو محمد معروف بہ آتو صاحب جلیس (ف: ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء) اور سید علی نواب قدیم (ف: ۱۹۵۱ء) ان میں سے جلیس اور قدیم لاولد فوت ہوئے۔ غیور کے بیٹے سید ہاشم حسین حزیں (ف: ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء) تھے؛ یہ ساری عمر مجرد رہے۔ اور یوں ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ رئیس کے اکلوتے بیٹے سید نواب حسین عرف منے صاحب سلیم کے علاوہ تین بیٹیاں تھیں۔ سلیم بھی لاولد رہے؛ البتہ بیٹیوں کی اولاد موجود ہے۔[1]

انیس کے سب سے بڑے بیٹے نفیس کے دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا میر خورشید حسن معروف بہ دولھا صاحب عروج (ف: ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ / ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء)۔ عروج کے بیٹے میر محمد حسن معروف بہ لڈن صاحب فائز (ف: رمضان ۱۳۶۶ھ / اگست ۱۹۴۶ء) لاولد فوت ہوئے؛ البتہ دونوں بیٹیوں سے سلسلۂ نسل آج تک جاری ہے[1]۔

نفیس کے دو بیٹیاں تھیں؛ ایک عروج سے بڑی (کاظمی بیگم[2]) دوسری ان سے چھوٹی (سیدہ

---

[1] اس سے معلوم ہوگا کہ میر انیس کے خاندان کے جو نام لیوا آج ملتے ہیں، وہ سب بیٹیوں کی اولاد ہیں؛ اولادِ نرینہ کے تمام سلسلے منقطع ہو گئے۔

[2] شعر بھی کہتی تھیں، گوہر تخلص تھا۔ عارف سے تقریباً سال بھر پیشتر ۱۳۳۲ھ میں انتقال ہوا۔

بیگم عرف بڈھن بیگم)۔ چھوٹی سید علی[1] مانوس رف : ۳۰ ربیع الاوّل ۱۳۶۰ھ / ۲۷ اپریل ۱۹۴۱ء) سے بیاہی گئیں۔ ان کی اولاد موجود ہے۔ بڑی بیٹی سادات بارہہ کے ایک زمیندار گھرانے میں سید محمد حیدر رجلیس سے منسوب ہوئیں[2]۔ انھیں کے اکلوتے بیٹے میر علی محمد عارف تھے، جو ۳ جمادی الاوّل ۱۲۷۶ھ (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) کو پیدا ہوئے۔ سید محمد حیدر کا عین عالم شباب میں بعمر ۲۶ سال ۸ محرم ۱۲۷۹ھ (۶ جولائی ۱۸۶۲ء) کو انتقال ہوا۔ اس پر نفیس بیٹی اور کمسن نواسے کو اپنے گھر لے آئے؛ یوں اس دُرِ یتیم کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کی سرپرستی میں ہوئی۔ بڑے ہوئے تو ماحول کے اقتضا اور خاندان کی روایات کے تتبع میں شعر کہنے لگے۔ عارف تخلص اختیار کیا اور نفیس ہی سے اصلاح لی۔ وہ اپنے زمانے کے باکمال شاعر ہوئے۔ انھوں نے ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء) کو بعمر ۵۷ برس بعارضۂ قلب رحلت کی۔ تاریخ ہوئی: عارف انیس عہد مثال نفیس بود (۱۳۳۴ھ)۔
ان کے ۱۶ مرثیوں اور چند سلاموں اور رباعیات کا ایک مجموعہ بعنوان "معارف سخن" پاکستان میں چھپا ہے (لاہور، ۱۹۷۷ء)۔

عارف کی اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ زوجۂ اولیٰ سے دو بیٹے، سید ظفر حسین عرف بابو صاحب فائق (ان کا ۱۲ شعبان ۱۳۶۳ھ / ۱۱ اگست ۱۹۴۴ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا) اور سید محمد ہادی لائق اور ایک بیٹی۔ زوجۂ ثانیہ سے سید یوسف حسین شائق اور تین بیٹیاں۔ یہ چاروں پاکستان چلے گئے تھے۔ شائق کا وہیں کراچی میں ۱۴ مارچ ۱۹۷۸ء) کو انتقال ہوا۔ تینوں بیٹیاں بحمدہٖ خوش و خرم حیات ہیں۔

---

[1] سید علی مانوس کی والدہ عباسی بیگم، انیس کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد مانوس کم و بیش تیس سال انیس کے بستہ بردار رہے۔ انیس کے حالات میں وہ مستند ترین ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
[2] سادات بارہہ، حضرت زید شہید پسر امام زین العابدین کی اولاد ہیں، اسی لیے اس بیٹی کی اولاد اپنے آپ کو زیدی لکھتی ہے۔ خیال رہے کہ سید محمد حیدر رجلیس اور سلیس کے بیٹے سید ابو محمد یعنی ابو صاحب جلیس الگ الگ شخص ہیں۔

سید محمد ہادی لائق ہیر ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ (۲۵ جون ۱۸۹۴ء) کو اپنے آبائی مکان مسکن میر انیس (چوبداری محلہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت نفیس مرحوم زندہ تھے لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت والد (عارف) اور نانا (نفیس) کی نگرانی میں ہوئی۔ خاندان کے کئی دوسرے بزرگ بھی حیات تھے، ان کا اثر بھی رہا۔ شروع میں تعلیم کا نجی انتظام ہوا۔ اس کے بعد مدرسۂ علویہ (جوہری محلہ) میں حاضری دینے لگے، جسے مولوی عالم حسین چلاتے تھے۔ مولوی صاحب موصوف کا اپنا مستقل قیام خود انھیں کے مکان کے دیوانخانے میں تھا۔ یہاں یہ عربی فارسی پڑھتے رہے۔ پھر انگریزی کا شوق ہوا، تو کوئنس کالج میں داخلہ لے لیا۔ مہاراجا سر علی محمد خان والیٔ محمود آباد شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے محبوب ساحر دو تخلص تھے۔ وہ ہادی صاحب کے والد عارف مرحوم سے مشورہ کرتے رہے تھے۔ اسی تعلق کے باعث انھوں نے استاد زادے (ہادی صاحب) کو اپنے ہاں بلوا لیا، تاکہ یہ ریاست کے خرچ پر وہاں تعلیم پا سکیں۔ لیکن ہادی صاحب زیادہ دن ان کے ہاں نہیں رہے؛ خاندان سے الگ رہنا انھیں منظور نہیں تھا۔ لہٰذا جلد ہی واپس لکھنؤ چلے آئے۔

جس ماحول میں ان کی پیدائش اور تربیت ہوئی، اس میں شعر گوئی گویا لازمۂ حیات تھی۔ اپنے بھائیوں کے تخلص فائق اور شائق کے وزن پر لائق تخلص اختیار کیا، اور شعر کہنے لگے۔ شروع میں زیادہ توجہ غزل پر رہی۔ جب مشق بڑھی تو دوسری اصناف سخن، سلام، رباعی وغیرہ میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ کلام پر اصلاح اپنے والد عارف مرحوم سے لی۔ اسی زمانے میں مرثیے کی طرف میلان ہوا۔ خود مرثیہ لکھتے اور والد سے مرثیہ خوانی کے آداب و قواعد سیکھتے اور مشق کرتے۔ رفتہ رفتہ اس فن میں طاق ہو گئے اور والد کی پیش خوانی میں پڑھنے لگے۔ عارف مرحوم نے مقامی عمائد کی دعوت پر حیدر آباد، بنارس، فیض آباد، جونپور، محمود آباد، سلیم پور، پنڈراول وغیرہ میں

مجلسیں پڑھیں؛ لائق بھی والد کے ہمراہ جاتے تھے۔ عارف کی رحلت کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی بابو صاحب فائق کے ساتھ بھی دوسرے شہروں میں جاتے رہے اور بعد کو اکیلے بھی جانا آنا رہا۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی وہی تھا، جو خاندان انیس کا مخصوص رنگ ہے۔ اسی لیے وہ لکھنؤ کے شاہی اماباڑوں میں بھی بحیثیت ذاکر برابر بلائے جاتے تھے۔ وہ بعض شاہی اماباڑوں اور درگاہوں کے منتظم او زنگران بھی رہے۔ چندے مہاراجکمار محمود آباد کے صاحبزادگان کی اتالیقی بھی کی۔ لیکن طبیعت کے عدم استقلال کے باعث کسی تعلق میں پختگی پیدا نہ ہوسکی۔ محرم کے زمانے میں وہ ۳۰ تا ۳۵ برس تک ریڈیو پر بھی انیس کے مرثیے پڑھتے رہے۔ انھوں نے اپنے خاندان کے علاوہ بیشتر اکابرِ لکھنؤ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ حافظہ بھی بہت اچھا پایا تھا۔ اس لیے وہ تاریخی روایات، ادبی معلومات اور آثارِ قدیمہ کا مخزن بن گئے تھے۔ لکھنؤ کے قدیم خاندانوں کے حالات، ان کے باہمی نسب اور مصاہرت کے تعلقات، اساتذہ کی قبور وغیرہ سے متعلق معلومات میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی زندگی میں، کسی نے ان کے پاس بیٹھ کر یہ تمام باتیں قلمبند کر لینے پر توجہ نہ کی، اور وہ یہ خزینہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ان کے پاس انیس کی اور ان کے خاندان کی کئی چیزیں اور تحریریں بھی محفوظ تھیں۔ چاہیے کہ ان کے پسماندگان سے یہ سب اشیا لے کر کسی میوزیم یا مرکزی جگہ میں محفوظ کر دی جائیں، ورنہ بعد کو یہ ضائع ہو جائینگی، یہ علم و ادب و ثقافت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ صحت بہت خراب رہنے لگی۔ بینائی کمزور ہوتے ہوتے زائل ہوگئی۔ مالی وسائل کی قلت سے بھی پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی ذاتی اور ان کے خاندان کی خدمات کو مدِنظر رکھ کر ۱۹۷۵ء میں یوپی اردو اکیڈمی نے ان کا ۱۵۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا؛ لیکن کہیں اوس سے پیاس بجھتی ہے۔ کنبہ خاصا بڑا تھا، اس پر گرانی کا عالم

ظاہر ہے کہ اس قلیل یافت سے کتنی راحت مہیا ہو سکتی تھی۔
آخر، خاندانِ انیس کا یہ نام لیوا یکشنبہ ۸ مئی ۱۹۷۷ء (۱۹ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ) بوقتِ ظہر اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے جاں بحق ہو گیا۔ اسی دن بعدِ مغرب جنازہ اٹھا۔ نماز سید مرتضیٰ حسین نقوی مجتہد نے پڑھائی اور انھیں احاطۂ مزارِ انیس (سبزی منڈی لکھنؤ) میں اپنے والد عارف صاحب کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔
وفات کی تاریخ متعدد حضرات نے کہی۔ ان کے چھوٹے بھائی سید یوسف حسین شائق نے ایک طویل قطعہ کہا۔ اس کے آخری دو شعر ہیں:

"تاریخ وفات ان کی لکھو سوچ کے شائق!
اب تو اسداللہ کے دَر پر گئے لائق
تاریخ کے مصرعے میں عدد "گو" کے ملا دو
"آخر سوئے فردوس سفر کر گئے لائق"

محمد میرزا مہذّب لکھنوی (صاحب مہذّب اللغات) نے تاریخ کہی:

اے مہذّب! مرثیہ گوئی کا ہے دَورِ زوال
اٹھ گیا دنیا سے اپنے وقت کا گویا نفیس
مصرعِ تاریخ نکلا عیسوی سنہ میں صاف
"جانِ ذکر لائق شہ، پیکر روحِ انیس" (۱۹۷۷)

ایک طویل تاریخ ان کے ایک عزیز دوست سید ظفر حسین ظفر (نبیسہ مفتی میر عباس شوستری) نے کہی جس میں گویا ان کی ذات و صفات کا نقشہ کھینچ دیا ہے:

دے گئے غم حیف ہے بعدِ زوال	نوزدہ ماہِ جمادی الاولیں
اُٹھ گئے ہادی ادیبِ باکمال	گفتگو جن کی تھی بیحد دلنشیں
لکھنوی اہلِ ہنر حضرات کے	تذکرے از بر تھے سینہ تھا امیں

لکھنؤ میں بلبلِ شیراز تھے | ناز کرتی تھی وطن کی سرزمیں
عمزدہ احباب، گریاں ہیں عزیز | ہے میسّر ان کو قربِ طاہریں
کوچہ ہائے لکھنؤ سے کیا غرض | جب ہے حاصل سیرِ فردوسِ بریں

یاد آتے ہیں ظفر! ہجری ہیں لکھ
"ابنِ عارف قصرِ جنت کے مکیں"
(۱۳۹۷)

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی حکیم محمد ہادی کی بیٹی (اور حکیم منّے آغا فاضل کی بھتیجی)؛ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے: سید علی محمد واثق اور کنیز عباس کنیز عباس کا انتقال ہو چکا ہے؛ علی محمد واثق ماشاء اللہ موجود ہیں۔ ان بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے دوسرا نکاح ایک بیوہ خاتون (طاہرت جہان) سے کیا۔ ان سے تین بیٹے (علی احمد دانش، علی قمر، علی حسن) اور تین بیٹیاں (سعیدہ، سکینہ، رئیسہ) ہوئیں۔ بفضلہ سب زندہ و سلامت ہیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ شائع نہیں ہوا اور تئے حالات میں اس کی اشاعت کی اب توقع بھی کم ہے۔ انھوں نے کم و بیش ہر صنفِ سخن میں دادِ طبع دی ہے۔ غزل، مرثیہ، سلام، نوحہ، رباعی۔ ہر طرح کا کلام ان کی بیاض میں موجود ہے۔ اسی میں سے کچھ نمونے کے طور پر ذیل میں دیا جا رہا ہے: تاکہ کچھ تو محفوظ ہو جائے۔

ایک رباعی میں اپنے دوسرے بھائیوں کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے:

کب میں نے کہا، کسی سے فائق ہوں میں | ہاں مدحتِ شبیر کا شائق ہوں میں
مدّاحِ امام، سب ہیں بہتر مجھ سے | دراصل برائے نام لائق ہوں میں

کوئی ہنس رہا ہے مجھ پر، کوئی توبہ کر رہا ہے
کوئی کہہ رہا ہے دل پر نہیں اختیار ہوتا
جو چلا تھا بوسہ دے کر، ترے دستِ نازنیں کو
وہی تیر کاش، ظالم! مرے دل کے پار ہوتا

تِرے تیر کو شکایت، مرے جذب سے نہ کیوں ہو
جو وہ دل سے چھوٹ جاتا، تو جگر کے پار ہوتا

مری الفت نے شاید کچھ خبر کی — کہ اب ہے اور ہی حالت نظر کی
وہ ہوں غم دوست، او ظالم کہ تجھ کو — دعا دے کر، شبِ فرقت بسر کی
مریضِ غم کہیں اچھا ہوا ہے — ہوئی بیکار کوشش چارہ گر کی
وہ نقدِ دل جسے ہاتھوں سے کھویا — کمائی تھی ہماری عمر بھر کی
نشانہ بن گیا، اور بیخبر ہوں — صفائی دیکھنا تیرِ نظر کی

دعائے وصل وہ مانگے شبِ ہجر
جسے اُمید ہو لائق! سحر کی

ہوا ہوں عشق کا بیمار، دیکھیے کیا ہو — بہت برا ہے یہ آزار، دیکھیے کیا ہو
فراق میں دلِ ہمدم نے ساتھ چھوڑ دیا — نہیں ہے اب کوئی غمخوار دیکھیے کیا ہو
کسی کے دام میں آیا، نہ جو کبھی' لائق! — ہوا ہوں اس کا گرفتار، دیکھیے کیا ہو

اشکِ غمِ شہ سے چشم تر ہو میری — قدرِ اہلِ ہنر کو بیشتر ہو میری
درگاہِ خدا میں یہ دعا ہے' لائق! — مدّاحیِ آل میں بسر ہو میری

کیوں حزن عیاں بجائے خوشحالی ہے — کس گل کا دلوں کو رنج پامالی ہے
کرتی ہے کسے تلاش، چشمِ حضّار — اس بزم میں کس گل کی جگہ خالی ہے

ایک مرثیے کے چند بند ملاحظہ ہوں، جس کے چہرے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت بیان کی ہے:

فزوں ہے دفترِ شرح و بیاں سے شانِ علی — حبیبِ ایزدِ اکبر ہے مدح خوانِ علی
خدا رسول ہیں واللہ قدر دانِ علی — رسولِ حق کی ہے گویا زباں زبانِ علی

کلامِ حق ہے خدا کی قسم کلام ان کا
عصائے پیر ہے، تیغِ جواں ہے نام ان کا

علی کے نام میں نام خدا یہ ہے تاثیر — کہ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں صغیر و کبیر
علی کو رکھتا ہے محبوب آپ ربِ قدیر — خدا کے عاشقِ بے مثل ہیں جنابِ امیر
خدا کے نام پہ یہ جان و دل سے قرباں ہیں
تمام خلقِ خدا پر علی کے احساں ہیں

علی نے کی ہے مصائب میں انبیا کی مدد — کہ دے رہا ہے کلامِ الٰہ اس کی سند
نزولِ نادِ علی ہے بروزِ جنگِ اُحد — علی کا نام اِدھر لو، اُدھر ہو دشمن رَد
ملائکہ کے لیے رہبرِ قدیم یہ ہیں
برائے جن و بشر، ہادی و کریم یہ ہیں

قسم خدا کی، یہ بیتِ خدا کے ہیں مولود — علی ہیں قبلۂ ایمان و کعبۂ مقصود
انھیں نے روزِ تولد کیے خدا کو سجود — جھکایا سر نہیں آگے کسی کے جز معبود
علی نے جلوۂ توحید جب دکھایا تھا
بتوں نے سجدۂ خالق میں سر جھکایا تھا

بلند دست نہ کس طرح ہو امیرِ عرب — کہ ہے علی کا ید اللہ دو جہاں میں لقب
علی کشندۂ عنتر ہیں، قاتلِ مرحب — پکارتے ہیں دمِ بیکسی علی کو سب
خدا کے فضل سے معجز نمائی کرتے ہیں
ہر اک کی آن کے مشکل کشائی کرتے ہیں

کروں سخا و عطا کا میں ان کے کیا مذکور — ہے ان کا جُود و سخا دو جہان میں مشہور
کہ راہِ حق میں دیا مال و جاں حدِ مقدور — حسن حسین سے فرزند تھے جو آنکھ کا نور
خدا کی راہ میں دونوں کو جب نثار کیا
گناہگاروں کو دوزخ سے رُستگار کیا

خدا کی راہ میں جو کچھ تھا کر دیا وہ نثار — ملاحظہ نہ کیا اپنی جان کا زنہار

نبی کے فرش پہ سوئے جو حیدرِ کرار — تھا آپ کرتا مباہات ایزدِ غفار

ملائک ان کے مناقب بیان کرتے تھے

گلِ مراد سے دامن کو اپنے بھرتے تھے

خدا کے فضل سے ہے ناصرِ علی منصور — خدا کے حکم سے ہے دشمنِ علی مقہور

نبی کی طرح ولی مومنوں کا ہے وہ ضرور — نبی کا نفس علیؑ ہے یہ حکمِ ربِّ غفور

خدا کے فضل سے معصوم، پاک و اطہر ہے

نبی کے بعد علی باعثِ مودّت ہے

علی ہے بابِ علومِ نبیِ ایزدِ پاک — نبی کے واسطے حق نے کہا ہے خود لولاک

علی کی مدح میں عاجز بشر کا ہے ادراک — علی ہے نورِ خدا اور ہم ہیں مشتِ خاک

بروزِ حشر وہ ساقیِ حوضِ کوثر ہے

علی کا مرتبہ وہم و گماں سے برتر ہے

لوائے حمد کو محشر میں جب اٹھائیگا — پھر اس کے سایے میں امت کو وہ بٹھائیگا

جگہ جناں میں قریبِ نبی وہ پائیگا — جو دوست ہیں انھیں وہ ساتھ لے کے جائیگا

مجتبو! قاضیِ دینِ رسول ہے حیدر

خدا کے دین کی اصلِ اصول ہے حیدر

وہ کرنے والا رعیت میں عدل ہے بخدا — وہ کرنے والا ہے تقسیم بالسویّت کا

علی کو حق نے ہے خیر البریّہ فرمایا — ہیں شامل اس میں مقلد علی کے سنا یا

وہ صالحین کا آقا ہے اور صادق ہے

علی ہے مصحفِ ناطق، حدیثِ ناطق ہے

خدا کے عاشقِ صادق ہیں حق کے ہیں محبوب — ہیں ان کے شیعوں میں موسیٰ یوسف و یعقوب

علی کے شیعہ ہیں الیاس و خضر اور ایوب — ہر اک نبی کو ولائے علی رہی مرغوب

شرف رسولوں نے پایا ہے حُبِّ حیدرؑ سے
نبی علی سے ہیں اور ہیں علی پیمبر سے

خطاب ان کا یداللہ ہے بقولِ نبیؐ　　　بہ حق حق اسداللہ ہیں علیِ ولی
خدائے پاک نے بھیجا ہے ان کو نادِ علی　　　یہ حق کے حافظ و ناصر ہیں بس خفی و جلی

بہ ربِّ کعبہ ہیں اصلِ اصولِ ایماں کے
علی کے ساتھ ہے قرآں، یہ ساتھ قرآں کے

علی سراجِ ہدیٰ، نورِ اولیا، اللہ　　　علی کے در کے گدا ہیں جہاں کے شاہنشاہ
ہیں بس نبی و علی ایک نور سے واللہ　　　جو کچھ طریقِ نبی ہے، وہی علی کی ہے راہ

خدا گواہ یہ دو ٹکڑے ایک نور کے ہیں
یہ پیشوا ملک و انس و جنّ و حور کے ہیں

جعفر طاہر، سید جعفر علی شاہ

جمعرات ۲۹ مارچ ۱۹۱۷ء کو جھنگ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید نور شاہ دیندار، متقی اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم جھنگ گورنمنٹ کالج میں۔ اس کی تکمیل کے بعد فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ اگرچہ انھیں نہ اس نوکری سے دلچسپی تھی، نہ یہ ان کے مزاج ہی کے مطابق تھی۔ یہاں وہ تعلیمی افسر مقرر ہوئے۔ وہ آخر تک اسی محکمے میں منسلک رہے؛ ۱۹۶۶ء میں پنشن ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں دوبارہ ملازمت اختیار کی۔ اور اب کے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو کر راولپنڈی میں مقرر ہوئے۔ یہاں سے ان کی بیشتر نشریات فوجی پروگرام میں ہوئیں۔ بدھ ۲۵ مئی ۱۹۷۷ء کو جب انتقال ہوا ہے، تو وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ لاش ان کے وطن جھنگ گئی، جہاں آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اولاد میں دس بچے اپنی یادگار چھوڑے: پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔

انھوں نے ۱۹۴۶ء میں شعر کہنا شروع کیا، جب وہ بسلسلۂ ملازمت پشاور میں مقیم تھے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ہفت کشور" کے نام سے پاکستان رائٹرز گلڈ نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ جس پر ادبی انعام (پانچ ہزار روپے) ملا۔ اس میں سات مختلف ملکوں کے بارے میں سات طویل نظمیں (کینٹوز) ہیں۔ مذہبی قصائد کا مجموعہ "سلسبیل" کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں

ماخذ: نیرنگ خیال (راولپنڈی)، نومبر ۱۹۷۰ء (جدید غزل نمبر)؛ مکتوبات مشفق خواجہ و شمشاد حسین رضوی (کراچی)

رحیم یار خان (بہاولپور) سے شائع ہوا تھا۔ ایک مجموعہ "ہفت آسمان" کے نام سے وفات کے وقت زیرِ طبع تھا۔ غزلیات کا مجموعہ "گردِ سحر" بھی مرتب شدہ موجود تھا، لیکن ہنوز شائع نہیں ہوا۔ انھوں نے ایک "تذکرۂ شعرائے پنجاب" بھی مرتب کیا تھا؛ اس کی کچھ اقساط انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے ماہنامے "قومی زبان" میں شائع ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزلیات، منظومات، مذہبی قصائد، منظوم ڈرامے، انشائیے؛ ان کا بڑا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا ہے۔

مرحوم بہت اچھے مکتوب نگار تھے؛ دوست احباب کو لمبے لمبے خط لکھا کرتے تھے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ انھیں جمع کر دے، تو یہ ادب کی خدمت ہوگی۔

ان کے چند شعر نمونے کے طور پر درج ذیل ہیں۔ یہ مکرمی مشفق خواجہ صاحب (کراچی) نے میری درخواست پر مہیا کیے ہیں:

شہرِ گل میں یہ گماں تھا کہ برات اتری ہے — پاس دیوانے کے آ بیٹھے جو دیوانے چند

ظلمتِ عرصۂ حیات کٹے — ہمنفس! مسکرا کہ رات کٹے

اے بقائے دوام کے مالک — کس طرح عمرِ بےثبات کٹے

آدمی جستجوئے راہ میں ہے — تجھ کو ضد ہے، رہِ نجات کٹے

پھر کر تذکرۂ دورِ جوانی رویا — رات یاروں کو سنا کر میں کہانی رویا

غیرتِ عشق نے کیا کیا نہ بہائے آنسو — سن کے باتیں تری، غیروں کی زبانی رویا

کس نے دی شوخیِ رفتار کی تیری طرح داد — کون یوں دیکھ کے دریا کی روانی رویا

چشمِ اربابِ وفا ہے، جو لہو روتی ہے — غیر پھر غیر ہے، رویا بھی تو پانی رویا

تیری مہکی ہوئی سانسوں کی تو یاد آئیں — آج تو دیکھ کے میں صبحِ سہانی رویا

میں نے جو تیرے تصور میں تراشے تھے کبھی — لے گئے وہ بھی مرے گھر سے پجاری پتھر

دل سے اس آہوئے درماندہ و بیکس کی طرح — مارتے ہیں جسے ہل ہل کے شکاری پتھر

نازِ ہر بت کے اٹھائے نہ جعفر طاہر — چوم کر چھوڑ دیے ہم نے یہ بھاری پتھر

کوئے حرم سے نکلی ہے کوئے بتاں کی راہ — ہائے کہاں پہ آکے ملی ہے کہاں کی راہ

صد آسماں بدامن و صد کہکشاں بدوش — بامِ بلندِ یار ترے آستاں کی راہ

طاہر! یہ منزلیں، یہ مقامات، یہ حرم — اللہ رے یہ راہ، یہ کوئے بتاں کی راہ

کبھی آسماں، کبھی آستاں، کبھی بام و در پہ نظر کرو
غمِ عشق تو غمِ عشق ہے، یونہی مر کے عمر بسر کرو

زہے دستہ دستہ یہ داغِ دل، زہے غنچہ غنچہ چراغِ دل
ہے کھلا ہوا درِ باغِ دل، کبھی اک نظر جو ادھر کرو

کوئی بات زلفِ دراز کی، خمِ ابرواں، رُخِ ناز کی
کوئی ذکر دار و رسن کرو، کوئی وصفِ تیغ و سپر کرو

کوئی پیچ و خم ہیں نہ فاصلے، کوئی منزلیں ہیں نہ مرحلے
جو اُتر کے بامِ جمال سے، تا کنارِ شوق سفر کرو

غمِ عشق عیشِ حیات ہے، کوئی لاکھ اس کو برا کہے
یہی عیب کام کی چیز ہے، اسی عیب کو جو ہنر کرو

نزدیک جو پہنچے تو آہوں کا دھواں تھا — کہنے کو تو ہم سایۂ دیوار میں آئے

آج ہر دیدۂ دل میں ہے اسی کی صورت — روک لیں شہر کی اس شخص نے راہیں کیا کیا

تاریکیوں میں کھو نہ کہیں جائیں قافلے — ہم مشعلیں جلا کے بیاباں میں لے گئے

اس ڈھلتے ہوئے حسن پہ لکھتا ہوں قصیدے — گرتی ہوئی دیوارِ حرم تھام رہا ہوں

مسلم ضیائی، عبدالوہاب

۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی عنایت حسین کے علماے فرنگی محل سے بہت عقیدتمندانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ ان کی درخواست پر حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی (رف: جنوری ۱۹۲۶ء) نے نومولود کا نام عبدالوہاب رکھا تھا۔ لیکن ان کا قلمی نام مسلم ضیائی اتنا مشہور ہوا کہ آج بہت کم لوگوں کو ان کا اصلی نام معلوم ہوگا۔

مسلم ضیائی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور کاکوری میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ حیدرآباد (دکن) چلے گئے، اور وہاں چادر گھاٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں مشہور مترجم قرآن مارماڈیوک پکتھال (رف: کارنوال، ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء) اس اسکول کے ہیڈماسٹر تھے۔ مسلم ضیائی ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اسی اسکول سے انھیں نے ۱۹۳۰ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد نظام کالج میں داخل ہو گئے، جہاں سے ۱۹۳۲ء میں انٹر اور ۱۹۳۴ء میں بی، اے کی سند عثمانیہ یونیورسٹی سے لی۔ پھر وہیں سے ۱۹۳۶ء میں تاریخ اور پولٹیکل سائنس میں ایم اے پاس کیا۔

تکمیل کے بعد انھوں نے اولاً صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ چنانچہ بمبئی پہنچے اور وہاں روزنامہ "خلافت" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں بدر جلالی "خلافت" کے ایڈیٹر تھے۔ لیکن بمبئی میں ان کا دل نہ لگا، اور وہ دو سال بعد حیدرآباد واپس چلے آئے۔ اسی زمانے میں وہ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ لکھنے کا شوق اور

ماخذ: ہندستانی اور پاکستانی اخبارات (اردو، انگریزی)

تجربہ تو تھا ہی۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے "اردو محل" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ "اردو محل" بعض ابھرتے ادیبوں کے لیے اپنی خفتہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بہت مفید ذریعہ ثابت ہوا۔ اس نے متعدد ادیبوں کی کتابیں شائع کیں۔

۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں سیاسی سرگرمیوں کے باعث معتوب حکومت ہوئے اور دو سال جیل کی سزا ہوگئی۔ ۱۹۵۶ء میں رہا ہوئے، تو اب انھوں نے سیاست سے کلی کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے آپ کو کاملاً ادب کے واسطے وقف کر دیا۔

مختلف اخباروں، رسالوں میں اُجرت پر مضمون لکھتے اور اس سے جو مل جاتا اسی میں تنگی ترشی سے گزارا کرتے رہے۔ یا پھر ذریعۂ معاش نادر پرانی کتابوں کی تجارت تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اچھا خاصا کتابخانہ فراہم کر لیا تھا بلا مبالغہ انھوں نے ہزاروں کی کتابیں نیشنل میوزیم، کراچی کے ہاتھ فروخت کی ہونگی۔ غالبیات کا ذخیرہ ہمدرد ٹرسٹ، کراچی نے گرانقدر معاوضے پر خریدا تھا۔ ان کا ادبی ذوق بہت قدیم تھا۔ وہ ابھی اسکول کے درجوں میں پڑھتے تھے کہ ۱۹۲۵ء (یا شاید ۱۹۲۶ء) میں انھوں نے بچوں کے لیے ایک نظم لکھی تھی؛ یہ انھیں ایام میں "غنچہ"، بجنور میں شائع ہوئی تھی۔ چادر گھاٹ اسکول کے دور میں انھوں نے پکھنال صاحب کی سرپرستی میں ایک ادبی رسالہ "چادر گھاٹ میگزین" کے نام سے جاری کیا۔ اولاً بہت دن تک اسے قلمی شکل میں شائع کرتے رہے، بعد کو ٹائپ میں تبدیل کر دیا۔

"اردو محل" کے اہتمام میں انھوں نے ۱۹۴۷ء میں بچوں کے لیے پندرہ روزہ "تارے" جاری کیا تھا، جو تین برس تک نکلتا رہا۔ کراچی کے قیام کے دوران میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی مطبوعات میں زیادہ اہم یہ ہیں (۱) روسی ظرافت (حیدرآباد، ۱۹۴۶)، (۲) بچوں کی دیکھ بھال (حیدرآباد ۱۹۴۷ء) یہ انگریزی سے ترجمہ ہے؛ (۳)

بچوں کی کہانیاں (۴) ٹیپو سلطان اور اس کے خواب : (۵) غالب کا نسوخ دیوان۔ (کراچی، ۱۹۶۹ء) میر تقی میر : آپ بیتی ۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی طرف سے ان کا مرتّبہ دیوان بہرام جی جاماسپ بھی شائع ہو چکا ہے (۱۹۴۳ء) غالب، کارل مارکس، حیدر علی پر بعض کتابیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں ۔ ایک تذکرۂ شعرا بھی مرتّب کیا تھا، یہ بھی نہیں چھپا، اور بھی بہت کچھ چھپنے سے رہ گیا۔ شعر بھی کہتے تھے لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

آخری دور میں بہت بیمار رہنے لگے تھے ۔ حافظہ گویا رہا ہی نہیں تھا۔ لکھنے پڑھنے تک کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ یہ ساری عمر کی جد وجہد اور جانکاہیوں کا نتیجہ تھا اسی حالت میں شنبہ ۵ جون ۷۷ء کی شب میں دس بجے کراچی میں رحلت کی ۔ جنازہ اگلے دن صبح دس بجے اٹھا اور انھیں ان کے مسکن کے قریب ڈرگ روڈ (حال شاہراہِ فیصل) کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا

ساری عمر مجرّد رہے ۔ عنفوانِ شباب میں ایک جگہ جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا جس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔ اس کے بعد متعدد اور ایسے حادثات پیش آئے ۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اہلی زندگی کا کھڑاگ پالینگے ہی نہیں ، عمر بھر اسی عہد پر قائم رہے ان کی پسند ناپسند میں ہمیشہ علو کا پہلو نمایاں رہا ۔ مثلاً ان کے ایک ہم سبق دوست تھے ، ضیاالدین، بہت محبت تھی اس سے ۔ اس کا انتقال ہو گیا، تو اپنے تخلص مسلم پر ضیائی کی نسبت کا اضافہ کرکے مسلم ضیائی بن گئے اور آخر تک اسی نام سے معروف رہے ۔

نجمی، نرندر ناتھ (ڈاکٹر)

۲۸ نومبر ۱۹۲۳ء کو ڈیرہ اسمٰعیل خان (حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد
شری جمنا داس گروور ماشاءاللہ زندہ ہیں اور پیشے کے لحاظ سے ساہوکارہ کرتے ہیں۔
نرندر ناتھ کا تعلیمی دور بہت شاندار رہا۔ میٹرک (۱۹۴۸ء)، انٹر (۱۹۵۰ء) بی اے (۱۹۵۳ء)
کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔ پھر اسی یونیورسٹی سے ایم اے کی دو مضامین
میں سند حاصل کی: انتظامِ عامہ ۱۹۶۴ء میں اور انگریزی ۱۹۶۷ء میں۔ اسی اثنا میں ایم ایڈ
اور ایم ایس سی کی اسناد بھی حاصل کیں۔ پی ایچ ڈی کی سند موت سے چند ماہ پہلے ۱۹۷۷ء
میں پائی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ کافی نہ ہو نجمی مطالعے سے ہومیوپیتھی میں ڈاکٹر آف میڈیسن
کی سند ۱۹۵۵ء میں درجۂ اول میں حاصل کی تھی۔

ملازمت اینگلو ویدک مڈل اسکول، ہوشیارپور کی ہیڈ ماسٹری سے شروع کی۔ یہاں وہ
۱۹۵۴۔۱۹۵۵ء دو سال رہے۔ اس کے بعد ہوشیارپور، حاجی پور، امرتسر، تلہ (ضلع
کرنال، ہریانہ)، کورکشیتر کے مختلف اداروں سے وابستہ رہے۔ سب سے آخر ۱۹۶۸ء میں
کورکشیتر کے سروسز ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے۔ موت کے وقت اسی عہدے پر متمکن
تھے۔

منگل ۲۶ جولائی ۱۹۷۷ء چنڈی گڑھ کے اسپتال میں بعارضۂ التہاب جگر رحلت ہوئی۔
اولاد میں ایک بیٹی چھوڑی۔

ماخذ: پروفیسر دشوا ناتھ دتا، صدرِ شعبۂ تاریخ، کورکشیتر یونیورسٹی، کورکشیتر (ہریانہ)

انھوں نے ایک کتاب انگریزی میں "انتظامِ عامّہ" بھی لکھی تھی۔ اردو شعر کا ایک مختصر مجموعہ "جامِ صد رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے (ہوشیارپور: ۱۹۶۶ء)۔ شروع میں متعدد حضرات سے مشورہ کیا۔ مثلاً جوشؔ ملسیانی، قیسؔ جالندھری، منور لکھنوی وغیرہ۔ ان سب سے دو دو چار چار غزلوں پر اصلاح لی۔ آخر میں جناب ساحرؔ ہوشیارپوری کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے۔

ذیل کے چند شعر جو ان کے مختصر مجموعے "جامِ صد رنگ" سے لیے گئے ہیں، ان کا اندازِ فکر عیاں کرنے کے لیے کافی ہیں:

جن کے سینوں میں نہیں سوزِ محبّت کا اثر — دل انھیں کے تو مرا دل نہیں ہونے پاتے
حاصلِ زیست سمجھتا ہوں جنھیں، اے نجمیؔ! — کیوں مری زیست کا حاصل نہیں ہونے پاتے

دل کو دُھن تھی ستم اٹھانے کی — کیوں شکایت کروں زمانے کی!

جان سے ہم کو ہاتھ دھونا پڑا — کیا سمائی تھی دل لگانے کی
جن کو نجمیؔ! نہیں کچھ اپنی خبر — خاک ہو پھر خبر زمانے کی

اگر موت ہی حاصلِ زندگی ہے — تو نوحۂ عمرِ رواں کیوں کریں ہم!
فریبِ نظر ہے تماشائے دنیا — یہاں ذکرِ سود و زیاں کیوں کریں ہم!

غمِ ہستی کے ماروں ہی کو ملتا ہے دلِ مضطر — جنھیں غم نہیں ہوتا، انھیں دل نہیں ملتا
زمانے بھر کے غم تم ڈال دو میرے ہی دامن میں — گلہ چھوڑو کہ اس سوغات کا سائل نہیں ملتا

رہے جس دل کے ہاتھوں خانماں برباد دنیا میں
اسی دل کو مگر دردآشنا کہنا ہی پڑتا ہے
خلافِ اعتمادِ دوستاں ضبطِ بیاں کب تک!
زباں تک دل سے کچھ آیا ہوا کہنا ہی پڑتا ہے

ملیں محرومیاں کچھ تو یہاں سے — کچھ اپنے ساتھ لائے ہم وہاں سے

نوید زندگی ملتی ہے دل کو
نظر آتے ہیں جب وہ مہرباں سے
مرے دل کی زباں ہیں میری آنکھیں
مرا قصہ سنو دل کی زباں سے

اشک آنکھوں میں رہے، دل میں رہا جذبۂ دل
میری ناکام تمناؤں کا بن کر حاصل
اور اک روز یہی آتش تر جاگ اُٹھی
اللہ اللہ! وہ قیامت کا سماں وہ ہل چل

مجھ کو خوفِ خدا نہیں واعظ!
میں تو خلقِ خدا سے ڈرتا ہوں

میں دوستی کے لیے ہوں، نہ دشمنی کے لیے
جہاں میں آیا ہوں اک فرضِ بندگی کے لیے
وفا پرستیِ انساں ہے روشنی دل کی
جلا دو اپنا جگر، دل کی روشنی کے لیے

دکھ درد کے ماروں کا سہارا نہ رہا
بے زور کی کشتی کو کنارا نہ رہا
ہاں، ساقیِ محفل کے چلے جانے سے
میخانے پہ کچھ زور ہمارا نہ رہا

آہ بھی اپنی تو بے رنگ و اثر دیکھی ہے
آنکھ بھی اپنی تو ہر حال میں تر دیکھی ہے
مجھ کو کیا حوصلہ دیتے ہو زمانے والو!
میں نے ہر رنگ میں دنیا کی نظر دیکھی ہے

ناکامِ محبت کی سزا موت نہیں
بیمارِ مسلسل کی دوا موت نہیں
دنیا کے مصائب سے نپٹنے کے لیے
ہے زیست بہر طور روا موت نہیں

بہاریں جواں ہیں، قفس آشیاں ہے
عجب، اے جوانی! تری داستاں ہے
جہاں در جہاں، ایک تیری نظر ہے
نظر در نظر، ایک میرا جہاں ہے

عبدالرزّاق قریشی

اعظم گڑھ (یوپی) سے تھوڑی دور ایک بستی بشہم نام ہے، بہت مختصر سی؛ اس میں مشکل سے ۵۰-۶۰ گھر ہونگے۔ بیشتر لوگوں کی بسر اوقات زمینداری اور کاشتکاری پر ہے یہیں ایک متوسط گھرانے میں ۲۱ اپریل ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔

مقامی روایت ہے کہ یہ خاندان حضرموت سے ہندستان آیا تھا۔ جو شخص سب سے پہلے یہاں وارد ہوئے، ان کا نام علاءالدین تھا۔ وہ موضع باتی بزرگ (بشہم سے ۳۲ کلو میٹر دور) میں مقیم ہوئے۔ ان کی سترھویں پشت میں شیخ بزرگ تھے، جنھوں نے منگئی ندی کے اُس پار سکونتی مکان تعمیر کر لیے۔ یہی مختصر آبادی بعد کو ترقی کر کے بشہم کی شکل اختیار کر گئی۔

شیخ بزرگ کی دسویں پشت میں شیخ مہربان ہوئے، جن کے پوتے شیخ احمد علی تھے، یہی احمد علی ہمارے عبدالرزاق قریشی کے والد تھے۔

شیخ احمد علی کی بیگم کا نام بتول تھا۔ ان کے چار بچے ہوئے: خلیل، جلیل، صاحبزادی، عبدالرزاق۔ یہ صاحبزادی تو پیدائش کے تیسرے ہی دن چل بسی۔ ۱۹۱۲ء میں گاؤں میں طاعون وبائی شکل میں نمودار ہوا۔ اس میں دونوں بڑے لڑکے خلیل (۱۶ سال) اور جلیل (۱۲ سال) بھی جاں بحق ہو گئے۔ عبدالرزاق بمشکل آٹھ ماہ کے تھے کہ والدہ کا

ماخذ: جناب اقبال فاروقی، بشہم (مرحوم کے پھوپی زاد بھائی)؛ جناب حامد اللہ ندوی، بمبئی؛ معارف اکتوبر ۱۹۷۷ء (مضمون: عبدالرزاق قریشی مرحوم از شہاب الدین دسنوی)

انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش ان کی دادی گُنّی بیگم نے کی۔ چار سال کے تھے کہ والد بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب ان کی تعلیم و تربیت اپنے چھوٹے چچا سخاوت علی کے ذمّے ہوئی۔ سخاوت علی پہلے رنگون (برما) میں سروے ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے، وہاں ان کے ساتھ بستی کے دو اور شخص بھی تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ان تینوں کا تبادلہ ہو گیا، اور وہ بمبئی آگئے۔ بقیہ زمانۂ ملازمت انھوں نے بمبئی میں بسر کیا، اور یہیں سے بالآخر پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ جب ۱۹۱۷ء میں احمد علی (والدِ عبدالرزاق) کا انتقال ہوا ہے، تو یہ صرف چار سال کے تھے۔ دادی اماں دیکھ بھال کرنے والی تھیں، جب ذرا بڑے ہوئے، تو ۱۹۲۱ء – ۱۹۲۲ء میں چچا نے انھیں بمبئی بلا لیا، اور کھنڈیا محلہ کے اُردو میونسپل اسکول میں ان کا نام لکھوا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کرائسٹ چرچ اسکول سے سینیر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔

وہ مزید تعلیم کے خواہشمند تھے، بلکہ انھوں نے اسمٰعیل یوسف کالج میں داخلہ لینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن چونکہ ان کے چچا کے مالی حالات کالج کی تعلیم کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے، انھیں بادلِ ناخواستہ یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

چونکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کی راہ بند ہوگئی تھی، انھیں بمبئی میں بسر اوقات کے لیے کام کی تلاش ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک فلمی پرچے "عکاس" میں کام شروع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن تک چل نہ سکا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ڈون باسکو ہائی اسکول کے شعبۂ اطفال میں پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ یہاں وہ کافی عرصہ رہے۔ پھر یہاں کا تعلق قطع کرکے فیلوشپ اسکول میں چلے گئے۔ ان دونوں اسکولوں میں کوئی دس برس کام کیا۔ اسی طویل تجربے کا نتیجہ تھا کہ یکم جون ۱۹۴۸ء کو انھیں انجمن اسلام ہائی اسکول میں اونچے درجوں کو اُردو اور فارسی پڑھانے کی جگہ آسانی سے مل گئی۔ وہ اس اسکول میں کم و بیش پندرہ برس ملازم رہے۔

انجمن اسلام نے ۱۹۴۷ء میں اپنے زیرِ اہتمام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس کے پہلے ڈائرکٹر تھے، جناب پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم (ف ستمبر ۱۹۶۸ء)۔ جب ۱۹۵۵ء میں وہ اسماعیل یوسف کالج، بمبئی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ عبدالرزاق قریشی مرحوم کا خطۂ اعظم گڑھ کی پیداوار ہونے کے باعث شبلی اسکول سے کچھ جذباتی لگاؤ تھا۔ یوں بھی پڑھنے لکھنے کے سوائے کوئی اور لَت تھی ہی نہیں۔ وہ ندوی صاحب کے پاس آنے جانے لگے اور روز بروز انھیں علمی اور تحقیقی موضوعات سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ اب وہ محسوس کر رہے تھے، کہ ان کا اصلی میدانِ عمل تحقیق ہی ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انجمن اسلام ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیاء الدین انھیں کسی طرح اسکول سے جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ان کے کام اور طلبہ سے ان کے سلوک سے ہر طرح مطمئن تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اگر یہ چلے گئے، تو ان کی جگہ پُر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ کے اربابِ حل و عقد بھی محسوس کر رہے تھے کہ قریشی صاحب کی اصلی جگہ انسٹی ٹیوٹ ہے، نہ کہ ہائی اسکول۔ بالآخر بعض دوستوں کی سفارش اور ترغیب پر یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا، اور عبدالرزاق قریشی ۱۹۵۹ء میں انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہو گئے۔ یہ تعلق اتنا پایدار ثابت ہوا کہ جب ۱۹۷۱ء میں ۵۸ برس کی عمر ہو جانے پر انھیں سبکدوش ہو جانا چاہیے تھا، انسٹی ٹیوٹ کے اصحابِ مجاز نے بخوشی ان کی ملازمت میں توسیع منظور کر لی۔

ندوی صاحب کی زندگی میں وہ انجمن کے سہ ماہی رسالے "نوائے ادب" کی ترتیب میں ان کے معاون رہے تھے، اور ان کی وفات (ستمبر ۱۹۶۸ء) کے بعد اس کے مدیر مقرر ہو گئے۔ وہ ۱۹۷۷ء کے آغاز تک یہاں کام کرتے رہے اور جب یہاں کا تعلق منقطع ہو گیا، تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب دارالمصنفین، اعظم گڑھ میں رہیں گے اور اپنا تحقیقی کام جاری رکھیں گے۔ پہلے وہ ایک زمانے کے بعد عزیزوں سے ملنے کو اپنے وطن ربشہ

گئے ۔ خدا کی شان، وہاں کچھ قبض و پیچش کے چکر میں مبتلا ہو گئے ۔ علاج سے تھوڑا افاقہ ہوا، لیکن پورا آرام نہیں آیا ۔ اسی میں وہیں ہفتہ ۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء نو بجے صبح دل کا دورہ پڑا ۔ دو تین مرتبہ قے ہوئی اور دو پہر کے چند منٹ بعد "یا اللہ" کہتے ہوئے، اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۔ وہیں گانو میں اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے :

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی مندرجۂ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں :

(۱) نوائے آزادی (بمبئی، ۱۹۵۸ء) مئی ۱۹۵۶ء میں اردو کانفرنس حیدر آباد میں ہوئی تھی ۔ وہاں ایک نشست میں "اردو اور تحریکِ آزادی" کے موقع پر بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کی صد سالہ سالگرہ اس طرح منائی جائے کہ اگلے سال اردو کا نثری اور منظوم مجموعہ شائع کیا جائے، جس سے معلوم ہو کہ اُردو نے ملک کی آزادی کی جنگ میں کیا حصہ لیا تھا ۔ چونکہ بعد کو انجمن ترقی اُردو نے اس ذمہ داری کے قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کیا، اس لیے انجمنِ اسلام، بمبئی نے یہ کام مکمل کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا اور قریشی صاحب کو اس کی تکمیل پر مقرر کر دیا ۔ یہ کتاب (نظم و نثر) انتخاب ہے، اس وسیع لٹریچر کا جو اُردو میں تحریکِ آزادی کے سلسلے میں لکھا گیا تھا ۔ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے ۔
(۲) مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام (بمبئی، ۱۹۶۱ء) (۳) دیوانِ غزلت (بمبئی، ۱۹۶۲ء) (۴) مبادیاتِ تحقیق (بمبئی، ۱۹۶۸ء) تحقیق کے اصول اور طریقِ کار ۔ اُردو میں اس موضوع پر اکیلی کتاب ہے) ۔ (۵) تاثرات (بمبئی ۱۹۶۹ء) (مختلف کتابوں اور اشخاص کے بارے میں سترہ مضامین کا مجموعہ) (۶) راگ مالا از غزلت (بمبئی، ۱۹۷۱ء)

دو کتابوں کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا : "اُردو ادب کے تمدنی اثرات" اور "منشی دیا نرائن نگم کے خطوط"، پہلی دار المصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں شائع ہونے والی ہے ! اور دوسری ان کے ایک دوست کے پاس بمبئی میں ہے ۔ ان کے علاوہ ان کے متعدد مضامین مختلف مجلات میں منتشر پڑے ہیں ۔

سفیر بجنوری، عبداللطیف

لکھنؤ سے بارہ کلومیٹر کی دوری پر بجنور ایک قدیم قصبہ ہے، جہاں کے خاندان شیوخ میں علمی قدر و منزلت اور دنیوی جاہ ومال کے متعدد نمایندے پیدا ہوئے ہیں۔ اس خاندان کے کئی افراد تعلیم کی آسانی اور روزگار کی سہولت کے باعث بجنور کی سکونت ترک کرکے لکھنؤ کے محلہ دگانواں میں منتقل ہوگئے۔ اسی سبب اس محلے کا وہ حصہ جہاں یہ حضرات مقیم ہوئے تھے، آج تک "احاطہ شیخان" کہلاتا ہے (اردو فارسی کا رواج نہ رہنے کا نتیجہ ہے کہ میونسپل کمیٹی نے بعض جگہ احاطے کا نام "احاطہ شیر خان" لکھ دیا ہے)

مولوی عبداللطیف ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبدالرحیم صدیقی اپنی مختصر زمینداری کے علاوہ لکھنؤ کچہری میں بحیثیت مختار بھی کام کرتے تھے۔ ان کا ۱۹۱۸ء میں انتقال ہوا۔ اپنے خاندانی قبرستان (بجنور) میں مدفون ہیں۔

سفیر کی ابتدائی تعلیم حسب دستور زمانہ گھر پر ہوئی۔ اس طرح عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں سے خاصی واقفیت پیدا ہوگئی۔ بعد کو ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے دسویں کا امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کیا۔ چونکہ اردو فارسی کی قابلیت معیاری تھی، انھیں منشی (فارسی) فاضل ادب اور دبیر کامل (اردو) کے امتحان پاس کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

بہت دن بعد ۱۹۵۱ء میں منبع الطب کالج، لکھنؤ سے پرائیوٹ طور پر طب کی سند بھی حاصل کی تھی۔ لیکن یہ محض شوقیہ اقدام تھا کیونکہ انھوں نے کبھی مطب نہیں کیا۔

وہ سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں سان جوزف ہائی اسکول، لکھنؤ میں فارسی کے مدرس

مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں یہ اسکول سان جوزف انٹر کالج بنا دیا۔ چونکہ کالج میں فارسی کا شعبہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس لیے ان کی ملازمت خطرے میں تھی۔ اس پر انھوں نے ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیوٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کیا اور کالج میں تاریخ پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ چونکہ اسکول کی عمارت بہت پرانی اور بوسیدہ ہو گئی تھی اور خدشہ تھا کہ اگر کسی وقت بیٹھ گئی، تو اس سے جانی نقصان کا قوی اندیشہ ہے، لہٰذا اصحاب مجاز نے ۱۹۶۳ء میں کالج توڑ دیا اور اسٹاف کو مناسب معاوضہ دے کر الگ کر دیا۔ اسی میں مولوی عبداللطیف بھی ریٹائر ہو گئے۔ پنشن کا سوال ہی نہیں تھا، صرف ایک سال کی تنخواہ (پانچ ہزار روپے) بطور معاوضہ ملی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کہیں نوکری نہیں کی۔

شعر میں سید محمد حسین افقر موہانی (ف: نومبر ۱۹۷۱ء) سے مشورہ رہا۔ افسوس کہ زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ چونکہ طبیعت پر تصوف کا غلبہ تھا اور ساری عمر صوم و صلوٰۃ بلکہ اوراد و انفال کے سختی سے پابند رہے، لہٰذا غزل کے علاوہ نعت گوئی سے بھی خاص شغف رہا۔

ان کا نکاح ۱۹۳۲ء میں فتح پور (ضلع بارہ بنکی) کے مشہور صوفی بزرگ مولانا عابد حسین مرحوم کے حقیقی بھانجے مولوی عبدالصمد کی صاحبزادی راضیہ خاتون سے ہوا تھا! ان سے تین اولادیں ہوئیں: (۱) عبدالحفیظ صدیقی ایم ایس سی (علیگ) پہلے شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ میں پڑھاتے رہے؛ آج کل نیشنل ڈیفنس اکاڈیمی، کھڑک واسلا میں مدرس ہیں۔ ادبی ذوق ورثے میں پایا ہے۔ علی گڑھ میگزین کا "مجاز نمبر" (۱۹۵۶ء) انھیں کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔[۵]

(۲) طاہرہ خاتون۔ ان کا نکاح مولانا محمد میاں فاروقی سابق رکن پارلیمنٹ کے صاحبزادے

---

۵ یہ حالات بھی انھیں نے فراہم کیے۔

محمد اسمٰعیل فاروقی سے ہوا۔ آج کل بمبئی میں قیام ہے۔ (۳) عبدالحسیب صدیقی بی، اے۔ ٹاٹا آئل کمپنی کی شاخ کانپور سے وابستہ ہیں؛ قیام لکھنؤ میں ہے۔

کبرسنی کے ساتھ حافظہ بالکل جواب دے گیا تھا۔ نسیان کے غلبے کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ میں جہاں ساری عمر بیتی تھی اور جس کے چپّے چپّے سے واقف تھے، اپریل ۱۹۷۶ء میں ایک مرتبہ راستہ بھول گئے اور میلوں دور نکل گئے۔ جب دیر تک گھر نہ لوٹے، تو قدرتاً اعزّہ کو فکر لاحق ہوئی۔ تلاش میں ہر طرف آدمی دوڑائے گئے، لیکن بیسود۔ وہ تو خدا کو خیر منظور تھی ایک رکشا والے نے پہچان لیا، اور انھیں سوار کر کے مکان پر پہنچا گیا۔

وہ آخری ایام میں اپنے بڑے صاحبزادے عبدالحفیظ صدیقی کے پاس کھڑک واسلا چلے گئے تھے۔ یہیں وفات واقع ہوئی۔ معمولی تکلیف موت کا بہانہ بن گئی۔ کوئی خاص شکایت نہیں تھی۔ شدید زکام لاحق ہو گیا۔ علاج سے بظاہر ٹھیک ہو رہے تھے، لیکن اچانک ہفتہ ۱۳ اگست ۱۹۷۷ء صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے سوتے میں جان بحق ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔ اسی دن نمازِ مغرب کے بعد مقامی مسجد کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ جس شخص نے حتی الوسع کبھی نماز باجماعت ناغہ نہ کی ہو، اس کے لیے خوابِ ابدی کی اس سے زیادہ موزوں جگہ تصوّر میں نہیں آسکتی۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ۔

کلام کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ چند شعر جو ان کی بیاض سے اُن کے صاحبزادے عبدالحفیظ صدیقی صاحب نے عنایت کیے ہیں، بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں:

بزم میں دشمن کی جانب وہ دہاں دیکھا کیے
ہم یہاں حسرت سے سوے آسماں دیکھا کیے

دیر و کعبہ کا انھیں معلوم کیا رسم و رواج
تم پہ مٹ کر جو تمھارا آستاں دیکھا کیے

ہم تو تیرے دیکھنے والے تھے، او بیدادگر!
پھر یہ کیا گزری کہ چشمِ پاسباں دیکھا کیے

بتادے جو، صیّاد! تو نے سنا ہو
نشیمن ہمارا کہاں جل رہا ہے

وہ اٹھ کے آستاں سے ترے جائے کس لیے
ہونا ہو جس کو مٹ کے تری خاکِ در ابھی

ان کو تو اپنے حسنِ تغافل سے کام ہے ــــ پہچانتے نہیں وہ کسی کی نظر ابھی
لازم ہے زندگی میں رہے موت کا خیال ــــ درپیش ہے، سفیر! عدم کا سفر ابھی

کوئی دیکھے تو کیا دیکھے، کوئی سمجھے تو کیا سمجھے
نہیں؛ ان کی دلیل لن ترانی ہوتی جاتی ہے

دل آج پریشان ہے، معلوم نہیں کیوں ــــ پھر قصدِ بیابان ہے، معلوم نہیں کیوں
کچھ تھوڑا بہت چین ملا تھا، تہِ مدفن ــــ پھر حشر کا سامان ہے، معلوم نہیں کیوں
دل وقفِ ستم، جانِ حزیں نذرِ ستمگار ــــ اور مجھ پہ یہ احسان ہے، معلوم نہیں کیوں
رہزن کہا کرتے ہیں دلِ زار کو عشاق ــــ رہبر پہ یہ بہتان ہے، معلوم نہیں کیوں
ارماں تو پریشان ہیں، اے جانِ تمنا! ــــ دل آپ پہ قربان ہے، معلوم نہیں کیوں
کچھ تنکے چنے تھے کہ چمکنے لگی بجلی ــــ پھر چرخ کو ہیجان ہے، معلوم نہیں کیوں

ہے یوں تو سفیر اب، واقفِ آلامِ محبت
کچھ جان کے انجان ہے، معلوم نہیں کیوں

بیدار، کرپال سنگھ

تحصیل ننکانہ صاحب (ضلع شیخوپورہ حال پاکستان) کے ایک مختصر گاؤں کھنگراں والا میں ۲۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان گل جاٹوں کا تھا، جو اپنی قوم میں ممتاز طبقہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے والد سردار خوشحال سنگھ خاصے بڑے زمیندار تھے، اور یہ گاؤں اس کے اردگرد ساری اراضی انھیں کی ملکیت تھی۔ اس زمیندارانہ ماحول میں کرپال سنگھ کا بچپن لاڈ چاؤ اور آرام و آسائش میں گزرا، اور انھیں کبھی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔

ان کے خاندان میں علم و ادب کی کوئی روایت نہیں تھی۔ ان کے والد سردار خوشحال سنگھ بھی غالباً لکھنے پڑھنے سے عاری تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے فیصلہ کیا کہ کرپال سنگھ کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائیگی۔ چنانچہ انھیں لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں انھوں نے سنٹرل ماڈل اسکول سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد بی، اے تک دیال سنگھ کالج، لاہور کے طالبعلم رہے۔ اور بالآخر ۱۹۳۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے (فارسی) کا امتحان پاس کیا۔ وہ اس سال کے جملہ طلبہ میں اوّل آئے تھے، اور سند بھی درجۂ اوّل کی تھی۔

۱۹۳۹ء ہی میں وہ سکھ نیشنل کالج، لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس مقرر ہو گئے۔ یہ کالج سردار بلدیو سنگھ نے قائم کیا تھا، جو آزادی کے بعد مرکزی حکومت ہند میں وزیر دفاع

ماخذ: انگریزی ماہنامہ اڈوانس، چنڈی گڑھ (ستمبر ۱۹۷۷ء)؛ دیباچۂ "صفیر خیال"؛ مکتوب رام لعل نابھوی۔

رہے۔ ۱۹۴۳ء میں کسی دوست نے بیدار کو مشورہ دیا کہ حکومتِ وقت کی ملازمت میں شامل ہو جائیں۔ بیدار نے یہ مشورہ رد کرتے ہوئے اپنی مشہور نظم "پیامِ خودداری" کہی جس کے آخری دو شعر ہیں :

مرا ایمان ہرگز کفر کا دم بھر نہیں سکتا — خدا کو چھوڑ کر بندے کو سجدہ کر نہیں سکتا
سرِ تسلیم کیونکر خم کروں، انگریز کے آگے — کبھی فرہاد جھک سکتا نہیں پرویز کے آگے

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور تقسیمِ وطن اس کے ساتھ آئی۔ بیدار کو بھی لاہور سے نقلِ مکان کرنا پڑا۔ یہاں انھوں نے پٹیالے میں رختِ سفر کھول دیا۔ شروع میں پریشانی اور ناداری کا دور رہا، لیکن وہ اسے صبر و شکر سے جھیل گئے۔ مدتوں بعد ۱۹۵۰ء میں پیپسو سرکار نے انھیں مہاجرین کی جائداد کا نائب نگران مقرر کر دیا۔ بدقسمتی سے دو برس بعد ۱۹۵۲ میں اعصاب نے جواب دے دیا اور سخت بیمار پڑ گئے۔ بیماری نے طول کھینچا، تو اس کے باعث نوکری سے مستعفی ہونا پڑا۔ بہت دن بیکار رہے۔ پھر ۱۹۵۷ء میں مالیر کوٹلہ میونسپل کمیٹی کے ایگزیکٹو افسر مقرر ہو گئے۔ لیکن ایک تو انھیں انتظامی امور کا تجربہ برائے نام تھا، اس پر مالیر کوٹلہ کا ماحول بھی مزاج کے مخالف؛ لہٰذا ۱۹۶۰ء میں اس جگہ سے بھی دستبردار ہو گئے۔ اگرچہ اس کے بعد ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۶ء تک ضلع پریشد پٹیالہ کے سکتر بھی رہے، لیکن ہے یہ کہ بیشتر زمانہ عسرت اور بے اطمینانی میں گزرا۔ کثیر العیال آدمی تھے، ہوشربا گرانی اس پر مستزاد۔ بارے، اگست ۱۹۶۷ء میں پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے شعبۂ فارسی میں جگہ مل گئی، اور یوں قدرے عافیت کی سانس لینے کا سامان ہو گیا۔ ان کی شروع سے تمنا رہی کہ انھیں کہیں فارسی کی جگہ مل جائے، لیکن اس کا موقع انھیں بہت دیر سے ملا۔ عید ہوئی ذوق ولے شام کو وفات کے وقت وہ اسی اسامی پر فائز تھے۔ آخری ایام زیادہ تر علالت میں گزرے۔ اسی میں پنجشنبہ ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے رحلت ہو گئی۔

شادی کے بارے میں ان سے پوچھا تک نہیں گیا۔ یوں بھی اس زمانے میں والدین بالعموم اولاد سے ان باتوں میں مشورہ غیر ضروری بلکہ معیوب خیال کرتے تھے۔ اور یوں ان کی ایک نہیں، دو دو شادیاں کر دی گئیں، جو اس عہد کے زمینداروں کے ہاں تموّل و تعیش اور ریاست کا نشان خیال کیا جاتا تھا۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۳۷ء میں ان کے والد نے موضع کانھا کاچھا (ضلع لاہور) کے نمبردار سردار خوشحال سنگھ کی صاحبزادی اقبال کور سے کی۔ اس بیوی سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ دوسری شادی ۱۹۴۷ء میں موضع ڈِپتھو (تحصیل قصور۔ ضلع لاہور) کے رئیس سردار گجن سنگھ کی دختر نیک اختر جسونت کور سے ہوئی۔ ماشاء اللہ ان سے بھی چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے:
انھوں نے ایک قطعے میں دو بیویوں کے "عذاب" پر تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

تمام رشک و رقابت، تمام جنگ و جدل
بڑا عذاب ہے دو بیویاں بشر کے لیے
کوئی دوا، کوئی درماں نہ ہو سکے جس کا
لگا لیا ہے وہ آزار عمر بھر کے لیے

خدا معلوم یہ جگ بیتی ہے یا آپ بیتی!
شعر گوئی انھوں نے دیال سنگھ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے زمانے میں کلام پر پنڈت کشور اخگر فیروز پوری (ف: اپریل ۱۹۶۷ء) سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لی۔ بعد کو پنڈت میلا رام وفا (ف: ستمبر ۱۹۸۰ء) اور پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) سے بھی کچھ مشورہ رہا۔ لیکن بالآخر (شمس العلما) مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کی شاگردی اختیار کر لی۔ تاجور مرحوم نے پنجاب میں اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ بیدار نے ان سے بہت استفادہ کیا، اور وہ آخر تک

اس کے معترف اور احسان مند رہے۔ ایک فارسی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

بیدار! حق گواہ کہ در دینِ شاعری
جز تاجور نبود کسے پیشوائے ما

استاد کی وفات پر ایک نظم کہی تھی، اس کا آخری شعر ہے:

اب محفلِ سخن میں کوئی سحر گر کہاں
شاعر تو سینکڑوں ہیں مگر تاجور کہاں

مولانا تاجور کو بھی اپنے اس شاگرد پر ناز تھا، ایک مرتبہ ان کے بارے میں لکھا تھا:

اس صوبے کے تمام مشہور و غیر مشہور شعرا میں صرف بیدار کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا کلام فن کی تمام لغزشوں سے پاک ہے۔ وہ عمر کے لحاظ سے تو نوجوان، لیکن پختہ مشقی کے اعتبار سے پیر ہفتاد سالہ ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء کو پنجاب سرکار کے محکمۂ السنہ نے اپنی سالانہ ادبی تقریب میں بیدار کو "ادیب اعلیٰ" کے اعزاز و خلعت سے سرفراز کیا۔ اس موقع پر جو ایڈریس انھیں پیش ہوا، اس میں انھیں "شاعرِ اعظم" کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اسی سال نومبر میں معززین پٹیالہ نے ان کے اعزاز میں شاندار جلسہ کیا۔ پنجاب سرکار نے دوبارہ ایک جلسہ ۱۹۷۳ء کے یومِ جمہوریہ (۲۶ جنوری) پر بھٹنڈا میں کیا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ افسوس کہ انھیں اپنا مجموعۂ کلام "صفیرِ خیال" کتابی شکل میں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ زندگی کے آخری زمانے میں انھیں نے اسے بڑے چاؤ سے مرتب کیا، پھر ایک نامور خوشنویس سے اس کی کتابت کرائی اور بڑے اہتمام سے اسے آفسٹ میں چھپوانا شروع کیا۔ لیکن وہ اس کی طباعت کی تکمیل سے قبل خود عالمِ جاودانی کو رحلت کر گئے۔ اللہ بس، باقی ہوس۔

بیدار کا کلام بیحد پختہ اور بلند مرتبہ ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ گوناگوں مصائب کا شکار

رہے؛ عسیر الحالی اور افلاس اور علالت نے انھیں عزلت گزینی پر مجبور کر دیا، ورنہ وہ اس سے کہیں زیادہ شہرت اور مقبولیت کے مستحق تھے۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے، اور اس میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کے ضخیم کلیات (صفیر خیال) کے صفحے صفحے سے ان کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن کا ثبوت ملتا ہے۔ ذیل کا سرسری انتخاب وہیں سے ماخوذ ہے:

کسی کی مہربانی پر محبت کا گماں کیوں ہو!
جو پابندِ محبت ہو، وہ اپنا مہرباں کیوں ہو!
جسے الفت کا دعویٰ بھی ہو، رسوائی کا خدشہ بھی
وہ ننگِ عشق، ناموسِ وفا کا پاسباں کیوں ہو!
مشیت کی شکایت پر کوئی آمادہ ہو کیونکر
مشیت کی شکایت کے لیے منہ میں زباں کیوں ہو!
محبت آگ ہے، لیکن ذرا سی تیرہ منظر ہے
اگر دل صاف جلتا ہو تو آنکھوں میں دھواں کیوں ہو!
اگر دنیا کی ہر آفت سبک افتادہ ہوتی ہے
تو پھر اہلِ محبت پر کوئی صدمہ گراں کیوں ہو!

آفاق میں ہر سُو ہے خدائی اس کی
ہر چیز میں ہے جلوہ نمائی اس کی
جتنے بھی ہیں اعداد جہاں میں، بیدار!
ہر ایک میں پھیلی ہے اکائی اس کی

اب حدِ نظر تک کہیں ظلمات نہیں
رستے سے بھٹکنے کی کوئی بات نہیں
دل سینے میں روشن ہو تو پھر اے بیدار!
ہر سمت سویرا ہے، کہیں رات نہیں

دنیا کی طرف آنکھ اٹھاتا ہی نہیں
دنیا سے کبھی ربط بڑھاتا ہی نہیں
جس رند کی قسمت میں ہو جنت، بیدار!
میخانے سے اٹھ کر کہیں جاتا ہی نہیں

ہر ذرہ خورشید جبیں لگتا ہے
ہر قطرہ اک دُرِّ ثمیں لگتا ہے
کچھ پھول پہ موقوف نہیں، اے بیدار!
کانٹا بھی جوانی میں حسیں لگتا ہے

ہستی جو کبھی زیر و زبر ہوتی ہے
سمجھو کہ وہ تنظیمِ دگر ہوتی ہے
آئی ہے شبِ مرگ، تو ڈرنا کیسا!
ہر رات کی تقدیر سحر ہوتی ہے

جلوہ گہِ جہاں تک سعیِ نظر نہ کر تمام
یہ ہے فقط اک آینہ، آینہ ساز اور ہے

بندۂ بے نیاز کو عجز گدا روا نہیں
کہتے ہیں جس کو بندگی، اس کا جواز اور ہے

ایک تمام تر حضور، ایک تمام تر سرور
آنکھ کی ہے نماز اور، دل کی نماز اور ہے

اک ذرا کافری نہ ہو جب تک
بندگی کا مزا نہیں ہوتا

تم مہرباں، تو سارا زمانہ ہے مہرباں
تم مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

نہ اب وہ شکوے ہیں بیرخی کے، نہ اب وہ چرچے ہیں برہمی کے
کہ ایک ہی شرمگیں نظر نے تمام جھگڑے چکا دیے ہیں

بجا کہ موت غنیمت ہے زندگی کے لیے
مگر وہ موت جو آئے تری خوشی کے لیے

وہ آنکھ عذرِ جفا میں بھی طُرفہ کار سی ہے
کہ شرمسار نہیں اور شرمسار سی ہے

تمھاری یاد میں لذت یہ آ چلی کیسی!
کہ ناگوار جدائی بھی خوشگوار سی ہے

کچھ تو میری چپ ہی کہہ دیگی مری رودادِ غم
اور کچھ ان کے تغافل سے بیاں ہو جائیگی

زندگی ہے کہ سزا ہو جیسے
دل لگانے کا صلا ہو جیسے

آج آئے ہیں وہ بہرِ پرسش
کوئی اپنا بھی خدا ہو جیسے

ہائے ان عاشقوں کی مجبوری
جو تمھیں بیوفا نہیں کہتے

ہر کسی سے نہ کہیے درد اپنا
رازِ غم جا بجا نہیں کہتے

جو بھلے آدمی ہیں، اے بیدار!
وہ کسی کو بُرا نہیں کہتے

جان ہی دینی پڑتی ہے بس، اس کے سوا کچھ اور نہیں
عشق نے اپنے درد کی قیمت کیا ارزاں ٹھہرائی ہے

دل کا آنا، دل کا جانا، اپنے بس کا روگ نہیں
ناصح کو یہ بات نہایت مشکل سے سمجھائی ہے

حبیب ٹانکی، جے کرشن چودھری

۱۹۰۴ء میں ٹانک (ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان، حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں اگرچہ ان سے پہلے کوئی ادیب نہیں ملتا، لیکن اس دور کے طرزِ تعلیم کے طفیل اردو فارسی کا مذاق اور وہ بھی اعلیٰ درجے کا نا پید نہیں تھا۔ خود ان کے والد (رائے صاحب) کیول کرشن چودھری، جو پشتینی زمیندار اور پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے، صاحبِ ذوق بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے کے لیے گھر پر ایک معقول کتابخانہ جمع کر رکھا تھا۔ جے کرشن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی اور غیر شعوری طور پر ان کے دل میں ادب سے شغف پیدا ہوتا گیا۔

انھوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے تاریخ میں بی اے (آنرز) کی سند لینے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا؛ اور یہاں سے ایم اے (تاریخ) اور ایل ایل بی کی اسناد پائیں۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد ایبٹ آباد (سرحدی صوبہ) میں وکالت شروع کی۔ اور اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اب ان کا شہر کے سربرآوردہ اصحاب میں شمار تھا۔ یہ وہ دور ہے جب غیر ملکی حکومت کے خلاف ہماری قومی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ جے کرشن چودھری اگرچہ زمانۂ طالب علمی سے اس کے حامی اور مؤید رہے تھے، لیکن تعلیمی پابندیوں اور مصروفیتوں کے باعث اس میں عملی حصّہ نہیں لے سکے تھے۔ اب جو آزادی نصیب

ماٰخذ: مقدمہ "نغمۂ زندگی" از کوثر چاند پوری؛ مختلف اخبارات (اردو، ہندی)

ہوئی تو وہ کھلے بندوں سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے۔ اس سے ان کا کانگریس کے مختلف اکابر سے قریبی تعلق قائم ہوگیا۔ وہ مدتوں خان عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی) کے خدائی خدمتگاروں میں بھی شامل رہے اور پھر ایک زمانے تک مقامی کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور ملک تقسیم ہوگیا۔ اسی سال ستمبر میں وہ ہندستان چلے آئے، اور حکومت کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک تقریباً پانچ برس وہ حکومتِ ہند کی طرف سے راجستھان میں اسسٹنٹ ریجنل کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں انتخاب ہوگیا؛ اگلے سال (۱۹۵۴ء) میں کلکٹر بنا دیے گئے۔ اور پھر تعلیم اور صنعت و تجارت کے محکموں میں تعینات رہے۔ ۱۹۶۰ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے وقت وہ ریوان (مدھیہ پردیش) میں ڈویژنل کمشنر کے عہدے پر متمکن تھے۔ اس کے بعد مدھیہ پردیش حکومت نے انھیں جبل پور کارپوریشن کا کمشنر مقرر کردیا۔ تین سال بعد (۱۹۶۳ء) میں اس سے فارغ ہو کر انھوں نے جبلپور ہی میں اپنا مکان تعمیر کرلیا اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ اس مکان کا نام انھوں نے "آشیانہ" رکھا تھا۔

جے کرشن چودھری نے سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں سیاسی نوعیت کی ایک کتاب Gate Keepers of India (ہندستان کے پاسبان) کے نام سے لکھی؛ اس میں سرحد کے مسائل سے بحث کی تھی۔ چونکہ وہ ہندی اور سنسکرت سے فاضلانہ واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے ان زبانوں کے شاہکاروں سے بھی اُردو کا دامن مالامال کردیا۔ اس سلسلے میں ان کی کتابیں "کالی داس"، "بھرتری"، "تلسی داس"، "میرا کے گیت"، "عبدالرحیم خانخاناں" اور سنسکرت کے مشہور ڈراما نویس بھاس کے ڈرامے "سَوپن وَاسَوْدَتم" کا ترجمہ "خوابِ شیریں" چھپ چکے ہیں۔ جو لوگ ترجمے کی دشواریوں سے واقف ہیں، وہی ان کی محنت

اور چابکدستی کی داد دے سکتے ہیں کہ کس طرح سے انھوں نے سنسکرت اور ہندی کے ان مصنفوں کے نازک سے نازک خیالات کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ "کالی داس" اور "تلسی داس" پر انھیں یو، پی سرکار کی طرف سے انعام بھی ملے تھے۔

ان نثری فتوحات کے علاوہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے؛ جبیب تخلص تھا۔ ان کا دیوان "نغمۂ زندگی" چھپ چکا ہے۔ (جبلپور، ۱۹۷۶ء)؛ اسے انھوں نے دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا تھا۔

جمعہ ۱۹ اگست ۱۹۷۷ء شام کے وقت جبلپور میں انتقال ہوا۔ چونکہ بیشتر اعزہ جبلپور سے باہر تھے، اس لیے انھیں پہنچنے کا موقع دیا گیا، اور رارتھی اگلے دن ہفتے کی شام کو اٹھی۔ ان کا جسدِ خاکی رانی تال کے شمشان میں نذرِ آتش کیا گیا۔

اولادِ جسمانی میں دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔

جبیب کا اصلی کام ان کے سنسکرت کے کلاسیکی ادب کے تراجم ہیں۔ وہ روایتی انداز کے شاعر تھے، اور اسے وہ غالباً تفننِ طبع سے زیادہ نہیں خیال کرتے تھے۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

محبت جس کو راس آجائے اُس کو ضرورت کیا دعا کی، یا دوا کی
چپکے چپکے کہہ گئی جو داستاں کی داستاں اس نگاہِ شوق کو ہم بےزباں کہتے رہے
اک تبسم، اک نگاہ اور ایک قطرہ اشک کا بس انھیں پر کہنے والے داستاں کہتے رہے
مانا کہ ایک روگ ہے الفت بھی اے جبیب! اس کے بغیر دل بھی جو پاؤں، تو کیا کروں!

وہ بھی کیا مزے کی تھی زندگی، جو سفر سفر میں گزر گئی
نہیں منزلوں میں وہ دلکشی، مجھے پھر سفر کی تلاش ہے

ہو گئے کتنے ہی گم عقل و خرد کی راہ میں منزلِ مقصود تک تو صرف دیوانہ گیا
زندگی نے اب تراشے نو بتانِ دلربا وہ پرانا طرزِ سجدہ اور بتخانہ گیا

اے چمن سے آنے والو! کچھ کہو　　میرا بھی اک آشیاں تھا، کیا ہوا؟

کبھی طویل، کبھی مختصر بھی ہوتی ہے　　ہر ایک رات کی لیکن سحر بھی ہوتی ہے

راہِ جنوں میں بھٹکتے، کہاں کہاں پہنچے　　کہاں کہاں کی سنائیں، کہاں کی بات کریں

وصل ہو، یا ہجر ہو، یا انتظارِ یار ہو　　دردِ دل ہیں، حسرتوں میں کچھ کمی ہوتی نہیں

نگاہِ مختصر سے، داستاں تک بات جا پہنچی　　خدا جانے، کہاں سے اب کہاں تک بات جا پہنچی

سنور اٹھی ہے کیا زلف زمیں از دستِ انساں سے　　کہ ماہ و مشتری و آسماں تک بات جا پہنچی

گئی شاید جوانی، اور گیا اندازِ جرأت بھی　　کہ اب اندیشۂ سود و زیاں تک بات جا پہنچی

نظر بیباک، دل بیباک، کیا پروا جیب اس کی　　یہاں تک بات جا پہنچی، وہاں تک بات جا پہنچی

وہی ہے شوق کا جذبہ، وہی ہے عجز و نیاز　　کہ دیکھ لینا بھی تجھ کو ہے بندگی کی طرح

حریمِ ناز سے آ تو گیا ہوں میں، لیکن　　پکارتا ہوا کوئی ہر ایک گام آیا

خرد کی ساری گئیں پختہ کاریاں بیکار　　بس ایک شوق کا سودائے خام کام آیا

نہ حرم میں تیرا نشاں ملا، نہ صنمکدے میں کوئی پتا

کہ نہ جانے، تیری تلاش میں، میں پھرا بھٹکتا کہاں کہاں!

تقصیر تھی چشمِ نم کی مری، یا تیری نگاہِ لطف کی تھی

اب روز بناتے چلتے ہیں، ہر بات پہ کچھ افسانے لوگ

منزلِ زندگی نہ پوچھ، صرف سفر ہے زندگی

پاؤں اٹھا، قدم بڑھا، ہوش سنبھال، تھم نہیں

اس طرح جیتا ہوں میں تیرے بغیر　　زندگی ایک سزا ہو جیسے

لب پہ یوں نام تیرا آتا ہے　　آخرِ شب کی دعا ہو جیسے

نہ تجھ میں جرأت ہے رند کی سی، نہ وسعتیں ہیں دل و نظر کی

عظیم شے ہے، یہ رسمِ رندی، فقط یہ بادہ کشی نہیں ہے

ہے دو ہی دن کی عمرِ گُل، مگر زندہ دلی دیکھو — تبسم لب پہ رقصاں ہے، فغاں گر ہے نہیں نکلی
جہاں پر سرحدیں دیر و حرم کی ختم ہوتی ہیں — وہیں پر نورِ ایماں ہے، وہیں راہِ یقیں نکلی

منتظر ہیں ترے آنے کا رہوں گا ہر دم — جھوٹا ہر ایک ترا پیماں ہو، ضروری تو نہیں
عشق نے ناصحِ مشفق کی سُنی ہی کب تھی — عقل ہی دل کی نگہباں ہو، ضروری تو نہیں

خود ہی اپنے پونچھ لے آنسو — کون، حبیب! ہیں آنے والے

آساں سمجھ کے منزلِ جاناں پہ ہو لیے — وہ مشکلیں پڑیں کہ خدا یاد آگیا
گمنام تھا حبیب، اور گمنام چل دیا — اُس کا مگر وہ صدق و صفا یاد آگیا

شاب اورنگ آبادی، ابو مہدی احمد علی، شیخ

اورنگ آباد کا اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز اور اہم مقام ہے، سراج اور ولی اسی سرزمین سے اٹھے۔ خود شاب نے بھی اس پر فخر کیا ہے:

اُٹھے ہیں سراج اور ولی بھی
جس خاک سے، شاب! میں اُٹھا ہوں

احمد علی شاب سادات علوی کے ایک خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کے واسطے سے حضرت علی سے جا ملتا ہے۔ پہلے یہ خاندان عرب فاتحین کے ساتھ ایران پہنچا اور وہاں سے سلطان محمود غزنوی کے جلو میں ہندستان آگیا۔ اس عہد میں تین بزرگوں نے اپنی روحانی اور مادی فتوحات کے باعث خاص شہرت حاصل کی: سالار ساہو، سالار مسعود غازی، سالار داؤد۔ احمد علی شاب حضرت سالار داؤد کی نسل سے تھے۔ اس خاندان میں علم و ادب، تصوف و عرفان، بزم و رزم کا عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے مثلاً منشی خادم علی سخا، جو عہدِ واجد علی شاہ میں دارالانشا کے میر منشی رہے، شاب صاحب کے پردادا تھے۔ جب سلطنتِ اودھ کا شیرازہ بکھرا، تو ان میں سے کچھ اصحاب نے حیدر آباد (دکن) کی راہ لی۔ ان میں سخا کے بیٹے (یعنی شاب کے دادا) منشی عبدالغفور حسان بھی تھے۔ انھوں نے ریاست کے محکمۂ بندوبست میں ملازمت اختیار کی۔ شاب کے والد منشی منصور علی پیشے کے لحاظ سے تحصیلدار رہے اور اسی عہدے

ماخذ: ہفتہ وار القریش، حیدر آباد (۷ جون ۱۹۷۶ء)؛ خطوطِ میر احمد علی الہام واحدی (شاگرد مرحوم)

سے انھوں نے بنیش پائی۔ وہ اپنے عہد کے مشہور خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ ان کے اتقاء اور زہد و ورع کا بھی دور دور شہرہ تھا۔ وہ حضرت وارث علی شاہ (دیوہ) کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کا نکاح بھٹول کلاں، ضلع بارہ بنکی (یو پی) کے زمیندار کبیر احمد کی صاحبزادی وحید النسا بیگم سے ہوا۔ کبیر احمد صاحب بھی سالار داؤ دہی کے نام لیوا تھے؛ دونوں کا سلسلۂ نسب اوپر جاکر مل جاتا ہے۔

اسی خانوادے میں احمد علی شاب شب دوشنبہ ۲۲ نومبر ۱۹۰۳ء (۲ رمضان ۱۳۲۱ھ) اپنے آبائی مکان محلہ رمنست پورہ (اورنگ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ دو بھائی اور تھے: محمود علی اور ناصر علی۔ سن شعور کو پہنچے، تو والدہ نے، جو خود تعلیمیافتہ، نیک دل اور صاحب استعداد خاتون تھیں؛ ان کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لی۔ نجی تعلیم کے بعد فوقانیہ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸ سال کی عمر میں دسویں کی سند پائی (۱۹۱۷ء) اور ریاست کی ملازمت میں بطور کلرک داخل ہو گئے (۱۹۱۸ء)، لیکن اپنے طور پر تعلیم کا سلسلہ اب بھی جاری رکھا۔ اس طرح عربی فارسی، کنڑی تینوں زبانوں میں قابل اعتماد مہارت حاصل کرلی۔ اس کے ساتھ قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ جب اطمینان ہو گیا، تو قانون مال اور محاسبی کے امتحانات پاس کیے، جس کے نتیجے میں سررشتۂ مالگزاری میں ملازمت مل گئی۔ ترقی کرتے کرتے تحصیلداری کے عہدے تک پہنچے۔ مختلف اضلاع میں مقرر رہے۔ ۲۷ سال کا پورا زمانہ نیکنامی سے بسر ہوا۔ آخری تعیناتی ضلع ناندیڑ میں تھی۔ چونکہ اب صحت خراب رہنے لگی تھی، اس لیے طبی مشورے پر قبل از وقت نومبر ۱۹۴۵ء میں وظیفۂ حسن خدمت کی درخواست پیش کی، جو منظور ہو گئی۔

تقریباً سال بھر کے علاج کے بعد جب صحت بحال ہو گئی، تو مئی ۱۹۴۶ء میں پائیگاہ خورشید جاہی میں مجلس انتظامی کے منتظم مقرر ہو گئے۔ وہ اس عہدے پر چار سال تک کام کرتے رہے۔ جب پائیگاہ کا ریاست میں انضمام ہو گیا، تو ان کا عہدہ تخفیف میں آ گیا۔ اس

کے بعد پانچ برس بیکاری میں گزرے۔ اگست ۱۹۵۵ء میں وہ آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خان مرحوم (ف: فروری ۱۹۶۷ء) کی ذاتی جاگیر میں لے لیے گئے۔ یہاں بھی ۱۲ سال تک ملازم رہے۔ اس کے بعد کہیں نوکری نہیں کی، گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ نوّے روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔ اسی پر قناعت کی اور صبر و شکر سے بسر کردی۔

اس دوران میں والدین کا انتقال ہوگیا تھا۔ والد منشی منصور علی نے پنجشنبہ یکم ستمبر ۱۹۴۹ء (۷ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) کو بھٹولی کلاں میں رحلت کی، اور وہیں دفن ہوئے۔ شاب نے ان کی "تاریخِ وفات" کہی:

روحِ اقدس کو کیا جب حق نے یاد ‏ ‏ کہ دیا دنیائے دوں کو خیر باد
شاب نے "تاریخِ ہجری" عرض کی ‏ ‏ "رحلتِ منصور علی قدسی نہاد"
(۱۳۶۸)

والدہ وحید النسا بیگم آٹھ برس بعد سہ شنبہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء (۲۵ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ) کو راہیِ عالمِ جاودانی ہوئیں۔ ان کا انتقال بھی بھٹولی کلاں میں ہوا، اور وہیں دفن ہیں۔ شاب نے ان کی تاریخِ وفات کہی:

بفضلِ خدا، بہرِ خیر البشر ‏ ‏ ہوا خاتمہ دینِ اسلام پر
کہا سالِ ہجری بھی یہ شاب نے ‏ ‏ "وفاتِ وحید النسا عمرہ تر"
(۱۳۷۶ھ)

دوسری تاریخ بھی ہجری میں ہے:

احمد و محمود ناصر نوحہ خواں ‏ ‏ بر وفاتِ مادرِ خود از غمش
سالِ فوتِ آں وحید العصر شاب! ‏ ‏ یکہزار و سہ صد و ہفتاد و شش
(۱۳۷۶)

شاب کو تاریخ گوئی اور سجع نگاری کا خاص ملکہ تھا۔ ان کے دیوان میں متعدد تاریخیں

ہیں اور سب کی سب برجستہ، بے کم و کاست۔ انھوں نے اپنے نام کے بھی دو سجعے کہے تھے: (۱) رحمتہ للعالمین احمد علی مشکل کشا (۲) شہر ہیں علم کا احمد علی باب۔

شاب مرحوم نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی (اولیا بیگم) قاضی فضل حسین انصاری رجسٹرار بارہ بنکی (ضلع سیتاپور) کی صاحبزادی تھیں، ان سے جون ۱۹۲۱ء میں اورنگ آباد میں نکاح ہوا۔ چونکہ یہ بیگم بعض دماغی امراض میں مبتلا ہو گئی تھیں، اس لیے انھوں نے ان کی زندگی ہی میں دوسرا نکاح اپریل ۱۹۲۵ء میں اپنی سگی خالہ کی بیٹی نیاز النسا سے کیا۔ خدا کی شان، اس کے بعد اولیا بیگم بھی بالکل صحتیاب ہو گئیں۔ شاب مرحوم کہا کرتے تھے کہ دونوں کا آپس میں ایسا اتحاد اور اتفاق تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اسی باعث شاب نے ان دونوں کو "شیر و شکر" کا لقب عطا کیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں دوسری بیگم (نیاز النساء) کا اچانک انتقال ہو گیا؛ اس زمانے میں شاب پربھنی میں تعینات تھے۔ ان سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی یادگار ہیں۔ جب ۱۹۴۴ء میں پہلی بیگم بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں، تو انھوں نے تیسری شادی کی۔ یہ محمد احمد ٹھیکیدار تعمیرات آرمور (ضلع نظام آباد) کی صاحبزادی کنیز فاطمہ تھیں، اور یہ بفضلہ حیات ہیں۔ ان سے چھ اولادیں ہوئیں: دو لڑکے اور چار لڑکیاں۔

شاب کی زندگی کے آخری دس برس مختلف امراض کی تکلیف میں گزرے۔ ضیق النفس (دمہ) کا مرض عمر بھر سوہانِ روح رہا۔ پھر بواسیر اور گٹھیا (وجع المفاصل) نے آدبوچا۔ اس سے نقل و حرکت بہت محدود ہو گئی؛ بیشتر وقت گھر ہی پر گزرنے لگا اور آخری دو برس تو تقریباً بستر پر بسر ہوئے۔ جب بہت کمزور ہو گئے، تو عارضۂ قلب بھی لاحق ہو گیا۔ اسی میں شنبہ ۲۰ اگست ۱۹۷۷ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ حیدر آباد کے محلّہ سید علی چبوترہ میں ایک تکیۂ یٰسین علی شاہ کی مٹی نصیب میں لکھی تھی۔ ان کے استاد بھائی اور استادزادے جناب علی احمد جلیلی نے ایک طویل قطعۂ تاریخِ رحلت کہا۔ اس کے چند شعر ہیں:

آہ تلمیذِ جلیل نامور — نامِ نامی جن کا تھا احمد علی
شاب کہتے تھے جنھیں اہلِ سخن — کر گئے اہلِ سخن کو ماتمی
خلد میں یارب! ملے ان کو جگہ — سایہ افگن ان پہ رحمت ہو تری
سالِ رحلت ہے "علی یہ لاجواب" ۱۲ — "ہو گئی خاموش شمعِ شاعری"
(۱۹۸۹ - ۱۲ = ۱۹۷۷)

موت کے وقت تیسری بیگم، کنیز فاطمہ کے علاوہ دو بیٹے (احمد ہادی اور احمد مہدی) اور سات بیٹیاں اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

چونکہ خاندان میں علم و ادب کا چرچا تھا، اس لیے بچپن ہی میں مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا۔ حافظہ اچھا تھا، سینکڑوں شعر یاد ہو گئے۔ اس سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ آغاز میں انھوں نے علامہ اقبال کی شاگردی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اقبال کسی کو شاگرد قبول نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا۔ اس کے بعد شاب نے فصاحت جنگ جلیل مانکپوری (ف: جنوری ۱۹۴۶ء) سے رجوع کیا اور کلام پر ان سے اصلاح لینے لگے۔

تلامذۂ جلیل میں انھیں ممتاز مقام حاصل تھا۔ غزل میں ان کی حیثیت مستند تھی۔ اس کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ قطعہ، رباعی، مثنوی، حمد، نعت، مرثیہ۔ غرض کسی صنف میں بند نہیں تھے۔ ان کی مندرجۂ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) تخئیلِ شاب۔ ابتدائی کلام (اورنگ آباد: ۱۹۲۴ء) توشۂ آخرت۔ مسائلِ فقہ (بجنور: ۱۹۲۴ء)؛ (۳) تابِ شکیب۔ اخلاقی مثنوی (بجنور: ۱۹۳۱ء)؛ (۴) کائناتِ شاب۔ دیوانِ اوّل (حیدرآباد: ۱۹۴۹ء)؛ (۵) ہادیٔ اعظم (جلد اوّل) تعلیماتِ قرآنی عام فہم زبان میں (حیدرآباد: ۱۹۵۹ء)؛ (۶) ژالہ بر لالہ۔ مجموعۂ رباعیات و قطعات۔ (حیدرآباد: ۱۹۶۹ء)؛ (۷) آدم تا ایں دم۔ "تاریخ اسلام۔ بہ بالاقساط ماہنامہ "ارشاد"

حیدرآباد میں جون ۱۹۶۵ء سے فروری ۱۹۶۹ء تک چار سال شائع ہوتی رہی تھی۔ کل ۴۴ قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ غالباً کتابی شکل میں نہیں چھپی۔ (۸) اوامر (جلد دوم) (حیدرآباد: ۱۹۷۱ء)؛ (۹) درود و سلام (حیدرآباد: ۱۹۷۴ء)؛ (۱۰) اوامر (جلد سوم) (حیدرآباد: ۱۹۷۱ء) بہت کچھ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ اس میں دو دیوان غزلیات کے اور ایک دیوان نعت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی سوانح عمری بھی "شاب بیتی" کے عنوان سے لکھی تھی؛ یہ بھی نہیں چھپی۔

غرض ان کے اٹھ جانے سے ایک قادر الکلام شاعر اور نیک انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

شاب کا کلام بہت سنجیدہ ہے۔ یوں بھی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف بہت تھا۔ چنانچہ دیوان میں نعتوں اور سلاموں کی خاصی بڑی تعداد شامل ہے۔ پورے دیوان میں بوسہ یا اس قبیل کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ ذیل میں چند شعر دیوان اول (کائنات شاب) سے ملاحظہ کیجیے:

بارِ ہستی سے کیا اس نے سبکدوش مجھے — تیغ رکھ دی مری گردن پہ کہ احساں اپنا
کیا غضب ہے کہ قیامت پہ بھروسا ہے تجھے — کام آئے گا پرایا، نہ مری جاں اپنا

وعدہ ہزار مستقل، جان مگر ہے مضمحل — اس کا تو اعتبار ہے، اس کا ہے اعتبار کیا

یاد آتا ہے، نہ نیند آتی ہے شامِ انتظار — کیا نصیبا سو رہا ہے دیدۂ بیدار کا

میں ٹھاٹ میکدے کا بیاں تم سے کیا کروں — ساقی تھا، مے تھی، شاب تھے، ابر بہار تھا

چشمِ کرم میں شاب! یہ اعجاز تھا نہاں — دیکھا جسے، وہ بندۂ بے دام ہو گیا

جو تیرا نہیں، وہ کسی کا نہیں — وہ سب کا ہوا، جو ترا ہو گیا

عقل و تدبیر کا میں شاب نہیں ہوں قائل — میرا ہر کام دعاؤں کے اثر سے نکلا
آتا رہا خیال یہی دل میں بار بار — جب تو نہیں رہا، تو مرے دل میں کیا رہا

دیر تیرا ہے، حرم تیرا ہے، بتخانہ ترا
ہر چمن میں ہے زبانِ گل پہ افسانہ ترا

کون برباد ہوا؟ کس نے کیا ہے برباد؟
شاب برباد ہوا، آپ نے برباد کیا

چاہے بیمار نہ اچھا ہوتا
آپ آجاتے، تو اچھا ہوتا

نہ سہی عرش، آسماں تو ملا
سجدہ کرنے کو آستاں تو ملا

جا کے کعبہ کو، فائدے میں رہے
کچھ نہ کچھ یاد کا نشاں تو ملا

ہے بتکدے میں، کلیسا میں، دیر و کعبہ میں
جو ڈھونڈتا ہے اُسے، وہ کہاں نہیں ملتا

حال کیا تم پوچھتے ہو شاب کا
عشق میں برباد ہے خانہ خراب

ہر گنہگار کو رحمت نے دیا ہے حصہ
شیخ تنہا نہیں فردوس بریں کے وارث

کہاں وہ صحنِ گلستاں، کہاں یہ کنجِ قفس
کہاں سے آیا ہے لے کر مجھے کہاں صیاد

طاعت پہ ناز ہے نہ عبادت پہ ہے گھمنڈ
ہم کو تو بس خدا کی عنایت پہ ہے گھمنڈ

اے شاب! میکدوں سے رستے پٹے پڑے ہیں
مسجد میں آگئے تم حضرت، کدھر سے بچ کر

باتیں بنا کے شیخ نے گمراہ کر دیا
رندوں کے دل پہ آج بلا کا ہوا اثر

گریباں ہے، نہ جیب و آستیں ہے اور نہ دامن ہے
کفن کی سادگی نے لطف پیدا کر دیا تن پر

جو دیکھتے تھے کبھی لوگ، شاب! صدیوں میں
دکھا رہا ہے وہ نیرنگیاں زمانہ روز

بتخانہ ہے، حرم ہے، کلیسا ہے، دیر ہے
ملنے کے ہیں مقام کئی، اے شاب خاص خاص

جھوٹا ہمارا قول، ہماری قسم غلط
ہاں، سچے آپ ہی ہیں، مری جان! ہم غلط

دنیا میں کروں کس کی رفاقت پہ بھروسا
دیتی نہیں جب ساتھ مرا عمرِ رواں بھی

اللہ اگر میری طرف ہے، تو نہیں غم
ہو جائے اگر اس کی طرف سارا جہاں بھی

دیر و کعبہ کی سمت جا نہ کبھی
یوں ملیگا تجھے خدا نہ کبھی

مستحق تھا وہ حسن، جس حق کا
ہو سکا عشق سے ادا نہ کبھی

پہلو میں درد، دل میں تپش، روح میں تڑپ
آنکھوں میں اشک، سر میں ہوں سودا لیے ہوئے
رخصت سفر تو دیکھیے محشر میں شاب کا
خم سر پہ، اور بغل میں ہے شیشہ لیے ہوئے

جائے نہ کوئی شاب کے بالیں پہ خدارا
لیٹا ہے ابھی، آنکھ بھی مشکل سے لگی ہے

جو لطف ہے طاعت میں، تمرد میں نہیں شاب!
جو رام نہیں ہے، اسے آرام نہیں ہے

دنیا اِدھر عذاب، قیامت اُدھر غضب
جائے قرار ہے، نہ تو راہِ فرار ہے

نہ ہوتا میں، تو یہ کون و مکاں سب
عبث تھے، بے سبب تھے، رائیگاں تھے

نہیں شاب! کچھ دل لگی، دل لگانا
مگر دل لگانے کو جی چاہتا ہے

در کہاں اور کہاں جبیں سائی
سر لیے پھر رہے ہیں سودائی
غم خوشی سے رہا قریب اتنا
اشک نکلے، اگر ہنسی آئی

خواہ کعبہ ہو، خواہ بتخانہ
رائیگاں جستجو نہیں جاتی

مرنا، مری جاں! کوئی بڑا کام نہیں ہے
آغازِ محبت ہے، یہ انجام نہیں ہے

بعد ان کے زندگی بیکار ہے
ان سے پہلے زندگی بیکار تھی

بسمل سعیدی ٹونکی، سید علیسی

اہلِ دل کے حلقوں میں کون نویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ سید جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت کے نام سے واقف نہیں ہوگا! وہ سید الشہدا حضرت حسین علیہ السلام سے سترھویں پشت میں تھے، اور سید علیسی بسمل سعیدی انھیں مخدوم موصوف کی سولھویں پشت میں ہوئے۔

مخدوم جہانیان جہانگشت کی اولاد کی ایک شاخ ہندستان آکر دلّی میں مقیم ہوگئی تھی۔ ان میں سے غالباً سید عنایت علی (بن مفتی سید فضل علی) دلّی سے رامپور منتقل ہوگئے۔ وہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی، والیِ عہد نے بھی ان کے اعزاز و اکرام میں کمی نہیں کی۔ ان کے تین بیٹے ہوئے: سید حیدر علی، سید حسن علی، سید محمد علی۔

سید حیدر علی اور سید محمد علی دونوں بھائیوں کا حضرت سید احمد بریلوی کے اصحاب کی حیثیت سے تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ سید حیدر علی ان کی تحریکِ جہاد کے اہم رکن تھے۔ حضرت سید احمد ان کے زہد و ورع اور علم و فضل کے معترف تھے؛ اور انھوں نے سید حیدر علی کو اپنی طرف سے بیعتِ جہاد لینے کی اجازت دی تھی۔ جب بالاکوٹ کا سانحۂ الیمہ پیش آیا، تو سید حیدر علی نے اس کے بعد ٹونک میں سکونت اختیار کرلی۔ نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خان، جن کا نام غالب کی سوانحِ عمری میں آتا ہے، حضرت بریلوی کی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے معرکۂ بالاکوٹ کے بقیۃ السیف قافلے کو ٹونک

ماخذ: بسمل سعیدی: شخص اور شاعر، مخمور سعیدی؛ اسما سعیدی

میں پناہ دی۔ ٹونک کا بازار "قافلہ" انھیں حضرات کا مسکن اوّل تھا۔ مولانا سیّد حیدر علی کے ٹونک آجانے کے بعد نواب وزیرالدولہ بھی ان کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور انھیں اپنا دیوان مقرر کر دیا۔ مولانا حیدر علی نے دو سال بعد دیوانی کے عہدے پر درس و تدریس کو ترجیح دی اور مدارالمہامیِ ریاست سے دستبردار ہو کر شہر سے باہر ایک مسجد میں جا بیٹھے، جہاں تشنگانِ علم دور دور سے شدِ رحال کر کے آتے اور ان کے سرچشمۂ فضل سے سیراب ہو کر واپس جاتے۔ ان کا دوشنبہ ۱۸ اگست ۱۸۵۶ء (۱۶ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ) انتقال ہوا۔ اپنے مدرسے کے جوار ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔
چھوٹے بھائی سیّد محمد علی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح حضرت بریلوی کی تحریکِ جہاد کے حامی اور مؤیّد تھے۔ انھوں نے اس تحریک کی ترویج میں اپنی جادو بیانی سے نئی روح پھونک دی تھی۔ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک کتاب "باغِ رحمت" چھپ چکی ہے۔ ان کا بعمر ۵۰ برس ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) میں الٰہ آباد میں انتقال ہوا۔
مولوی محمد علی کے بڑے صاحبزادے احمد علی سیماب ٹونکی (ف: یکم اکتوبر ۱۹۰۰) تھے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے: سعید احمد اور عبدالعلی۔ چھوٹے عبدالعلی عین جوانی میں والدین کو داغِ مفارقت دے گئے۔ بڑے سعید احمد شعر بھی کہتے تھے۔ اسعد تخلص تھا۔ وہ اس کے علاوہ حاذق طبیب بھی تھے۔ ٹونک اور قرب و جوار میں ان کی شہرت طبیب ہی کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں رحلت کی۔ "فنائے حذاقت" مادۂ تاریخِ وفات سنہ ہجری میں ہے (۱۳۵۰ھ)۔ یہی بسمل سعیدی کے والدِ بزرگوار تھے؛ ان کے تخلص کے ساتھ "سعیدی" کا لاحقہ انہی کے نام کی مناسبت سے ہے۔ اسے بسمل کے بعض شاگردوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔
مولوی سعید احمد نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم اپنے خاندان ہی سے مولوی سیّد زکریا (ابنِ مولانا سیّد حیدر علی) کی صاحبزادی محمدی بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے تین بیٹے

اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ دوسری بیوی صدیقہ بیگم (دختر سید عاشق علی رامپوری) تھیں ان سے تین بیٹے سید یحییٰ، سید عیسیٰ، سید احمد علی۔ سید یحییٰ ٹونک میں اپنے والد کی مسندِ طبابت پر متمکن ہیں۔ سب سے چھوٹے سید احمد علی آج کل لاہور (پاکستان) میں مقیم ہیں۔ منجھلے سید عیسیٰ کو دنیائے ادب و شعر بسمل سعیدی ٹونکی کے نام سے جانتی ہے جن کا شبِ ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء جمعہ کو انتقال ہوگیا۔
بسمل مرحوم ۱۳۱۹ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ "فضل نواب" ان کا تاریخی نام تھا، جس سے ہجری سال کے عدد (۱۳۱۹) برآمد ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ اگرچہ ٹھیک مہینا اور دن انھیں معلوم نہیں تھا، لیکن کسی مرحلے پر گھر میں کسی کو یہ کہتے سنا تھا کہ "رمضان شریف کا مہینا، آخری عشرہ تھا؛ پیر کے دن صبحِ صادق کے وقت پیدا ہوا تھا"۔ جنتری میں رمضان ۱۳۱۹ھ کے ۳۰ دن درج ہیں۔ ۲۱ رمضان کو یکم جنوری ۱۹۰۲ء تھی اور بدھ کا دن تھا۔ ۳۰ رمضان جمعہ کی اور ۱۰ جنوری تھی۔ اتفاق سے پورے عشرے میں صرف ایک پیر کا دن پڑتا ہے یعنی ۲۶ رمضان مطابق ۶ جنوری کو۔ پس اگر بسمل مرحوم نے اپنی ولادت سے متعلق جو کچھ سنا تھا، وہ درست ہے تو ان کی ولادت پیر ۶ جنوری ۱۹۰۲ء (مطابق ۲۶ رمضان ۱۳۱۹ھ) کو ہوئی تھی — واللہ اعلم بالصواب۔
سنِ شعور کو پہنچے، تو والد نے خود پڑھانا شروع کیا اور ساتھ ہی سید اصغر علی آبرو مؤلف تاریخ ٹونک (ف: نومبر ۱۹۳۹ء) سے بھی پڑھنے کی ہدایت کی۔ اگرچہ آبرو سے بھی انھوں نے فارسی کی تحصیل کی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے استفادہ بیشتر اپنے والد ہی سے کیا۔ اس کے بعد دربار ہائی اسکول، ٹونک میں چھٹے درجے تک پڑھا۔ خدا معلوم کیا بجوگ پڑا کہ اس کے بعد اسکول کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کے بہنوئی مولانا محمد سورتی کا ریاست رامپور سے تعلق تھا۔ مولانا سورتی انھیں ساتھ لے کر رامپور پہنچے اور انھیں مولانا

شجاعت علی کے حوالے کرکے، خود حیدرآباد سدھارے۔ مولانا شجاعت علی نے انھیں مدرسۂ عالیہ میں داخل کرا دیا۔ یہاں عربی پڑھتے رہے۔ کچھ فارسی بھی پڑھی، لیکن یہ نصاب وہ پہلے ٹونک میں مکمل کرکے آئے تھے، اس لیے فارسی میں قیام رامپور کے زمانے میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعۂ ملّیہ اسلامیہ کا علی گڑھ میں افتتاح ہوا۔ مولانا محمد سورتی وہاں عربی پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں بسمل صاحب بھی ان کے پاس علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں انھوں نے انگریزی میں بھی کچھ شُد بُد حاصل کی، اور مولانا اسلم جیراجپوری (ف: دسمبر ۱۹۵۵ء) سے فارسی کی بعض کتابیں، جن میں شاہنامۂ فردوسی اور مثنوی مولانا روم زیادہ اہم تھیں، پڑھیں۔

دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں بسمل صاحب گوالیار چلے گئے، جہاں ان کے بھانجے حکیم سیّد ریاست کی ملازمت میں تھے، اور مطب بھی کرتے تھے۔ بسمل صاحب نے یہاں طب کی کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور اتنی استعداد پیدا کر لی کہ خود مطب کرنے اور مریضوں کو دیکھنے لگے۔ سیّد احمد جب دفتری کام کے لیے جاتے، تو اُن کی غیر حاضری میں ان کے مریضوں کو بھی دیکھتے۔ غرض بحیثیتِ طبیب ان کی خاصی شہرت ہو گئی۔

گوالیار ہی میں والد کی طرف سے حکمنامہ پہنچا کہ ٹونک واپس آ جاؤ۔ ۱۹۲۶ء میں شادی ہو گئی۔ بیوی کا نام سیّدہ ذاکرہ بی (عرف منجو بی) ہے اور ماشاء اللہ حیات ہیں۔ یہ مولوی سیّد شریف الاسلام قاضی شہر ثانی کی صاحبزادی ہیں! یہ بسمل صاحب کی حقیقی خالہ سیّدہ ذاکیہ بی کی بیٹی بھی ہیں۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ کئی بچے ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ بعض کمسنی میں والدین کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ان میں سے پانچ سن رشد کو پہنچے، ڈاکٹر اسما سعیدی، ثریا عندلیب، رعنا پروین، تین لڑکیاں، اور مسعود الرحمان حبیب سعیدی اور محمد علی محبوب سعیدی دو بیٹے۔ ثریا عین جوانی میں

جل مری تھی، جس نے بسمل صاحب کی زندگی تلخ کردی۔ باقی بچے بفضلہٖ زندہ سلامت موجود ہیں۔ بڑے صاحبزادے لاہور میں مطب کرتے ہیں: دوسرے بچے یہیں ہندستان میں ہیں۔

اس شادی کو دس بارہ سال بیت گئے۔ ماشاءاللہ اولاد بھی تھی۔ لڑکے لڑکیاں، کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن ہونی بلوان ہے، اسے کون ٹال سکتا ہے! ۱۹۳۸۔ ۱۹۳۹ء میں یہ اپنے خالو سیّد عابد حسین شاہ رامپوری کے وہاں معمولی سے زیادہ جانے آنے لگے۔ خالو کی جوان بیٹی سلمیٰ سے ملاقات لابد تھی۔ لیکن اس سے زیادہ کوئی بات نہیں تھی کہ دونوں میں بے لوث سی محبت تھی، جیسے قریبی رشتے داروں میں عام طور پر ہو جاتی ہے، مگر لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے! جتنے منھ، اتنی باتیں اندیشہ پیدا ہو گیا کہ خدانخواستہ کہیں لڑکی کی زندگی داغدار نہ ہو جائے۔ اس پر طرفین کی رضامندی سے دونوں کا نکاح ہو گیا۔ اس بیگم سے چار بچے پیدا ہوئے: تین بیٹیاں (نجمہ، عائشہ، فاطمہ) اور ایک لڑکا جو کمسنی میں داغِ جدائی دے گیا۔ یہ بیگم آج کل پاکستان میں مقیم ہیں۔

۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں جے پور گئے۔ یہاں ممتاز الدولہ نواب مکرم علی خاں رئیس پہاسو کے وہاں حاضری کا موقع ملا۔ مراسم کچھ ایسے بڑھے کہ بسمل ان کے مصاحب بن گئے۔ یہاں چھ سات برس قیام رہا؛ یہ زمانہ کاملاً آرام و آسایش اور بےفکری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

بسمل صاحب کا دلّی آنا جانا اپنے والد کی زندگی سے تھا۔ لیکن یہی تھوڑی مدت رہے اور واپس چلے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اس موقع پر بڑے پیمانے پر مشاعرے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ بسمل صاحب ٹونک سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے۔ اس موقع پر ان کا یہاں کے اہلِ ادب سے تعارف ہوا اور یہی ان کے دلّی میں مستقل قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تین برس بعد (۱۹۴۹ء) میں وہ حضرت

نظام الدین اولیاء کے عرس کے مشاعرے میں شریک ہوئے اور پھر واپس نہیں گئے۔ دلّی میں بھی اچھی گزری، اگرچہ مادّی پہلو سے حسبِ دلخواہ فارغ البالی کبھی حاصل نہ ہوئی۔ مختلف موقت الشیوع رسائل و جرائد سے وابستہ رہے۔ شاگرد اور دوست احباب بھی خدمت کرتے رہے۔

عمر کے ساتھ قواء مضمحل ہوتے چلے گئے۔ ادھر آمدنی کے سارے سوتے خشک ہو گئے۔ اکثر بیمار رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ جسم میں نمی کی کمی کے باعث استسقاء کا شکار ہو گئے۔ اسی میں جمعہ ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء مغرب کے بعد ساڑھے نو بجے یہیں دلّی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اگلے دن اٹھا اور انھیں چمیلیوں کے قبرستان میں (نزد پرانی عیدگاہ) سپرد خاک کیا گیا۔

پورا گھرانا مذہبی اور علمی روایات کا حامل تھا۔ اوپر کی پشتوں میں کسی شاعر کا نام نہیں ملتا، لیکن ان کے دادا احمد علی سیماب اور والد مولوی سعید احمد اسعد کا شاعر ہونا ثابت ہے۔ اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ پہلا شعر گیارہ بارہ برس کی عمر میں کہا۔ اس کے بعد کبھی کبھی کہنے لگے؛ اس میں مشورہ اپنے والد مولوی سعید احمد اسعد سے رہا۔ جب علی گڑھ گئے، تو کلام مولانا اسلم جیراجپوری کو دکھاتے رہے۔ پھر واپس ٹونک پہنچے، تو حافظ محمد عمر خان جام سے مشورہ کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے (بلکہ خود سیماب اکبرآبادی نے بھی) انھیں سیماب مرحوم کا شاگرد کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بسمل دو تین برس تک اپنا کلام سیماب کے پاس بھیجتے رہے۔ بسمل کا دعویٰ تھا کہ باہمی قرارداد تھی: "اگر مجھے آپ کی اصلاحیں پسند آئیں۔ تو میں ضرور انھیں قبول کروں گا اور آئندہ یہ سلسلہ رہیگا۔ برس دو برس تک میں نے جو کچھ بھیجا اور وہ اصلاح کے بعد واپس آیا، میری طبیعت نے اسے پسند و قبول نہ کیا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ مشورہ ضرور رہا۔

ان کے کلام کے چار مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے: نشاطِ غم (دلی: ۱۹۵۱)؛ کیفِ الم (دلی: ۱۹۵۳ء)؛ مشاہدات (دلی: ۱۹۶۰ء)؛ اوراقِ زندگی (نئی دلی: ۱۹۷۱ء) یقیناً بہت کچھ غیر مطبوعہ رہ گیا ہوگا۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ قدرتِ زبان، مہارتِ فن، گہرائی اور گیرائی میں وہ کسی استادِ سلف سے کم نہیں تھے۔ خدا چاہے، تو ان کا مقامِ تاریخِ ادبِ اردو میں محفوظ ہے:۔

تم اپنے قول، تم اپنے قرار یاد کرو
اور ان پہ پھر وہ مرا اعتبار یاد کرو

جو مجھ پہ اب نہ رہیں، ان نوازشوں کی قسم
نوازشوں کے وہ لیل و نہار یاد کرو

تمام دن مری حسرت میں، روزنِ در سے
نگاہِ شوق سوئے رہگزار یاد کرو

وہ شرم و شوق کے ہیجان ہیں شبِ مہتاب
تمام رات مرا انتظار یاد کرو

ذرا خلافِ توقع مرے پہنچنے پر
وہ طرزِ گفتگو بیگانہ وار یاد کرو

کبھی وہ آپ ہی مجبور ہو کے رہ جانا
کبھی وہ مجھ پہ بھی اک اختیار یاد کرو

ذرا سکوت پہ میرے وہ سو توہم سے
مری طرف نگہِ بیقرار یاد کرو

مری جدائی گوارا ہوئی تمھیں کیونکر
تمھیں یہ ذکر بھی تھا ناگوار یاد کرو

خدا کرے، کبھی بے اختیار یاد آؤں
خدا کرے، کبھی بے اختیار یاد کرو

بھلا چکے، سو بھلا ہی چکے وہ اب بسمل
ہزار یاد دلاؤ، ہزار یاد کرو

نشاں ہیں کتنی جبینوں کے آستاں پہ ترے
مری جبیں پہ کسی آستاں کا داغ نہیں

رہیں گواہ ستارے ترے شبستاں کے
کہ میری راتوں میں روشن کوئی چراغ نہیں

آ گیا ہوں وہاں سے گھبرا کر
اب کہیں دل بہل نہیں سکتا

جان اس بے تعلقی پر بھی
بر بنائے تعلقات گئی

اُف مسلسل یہ تیرگی لحد — نہیں معلوم، کتنی رات گئی

یہ وقت کل نہ رہیگا، رہینگے یاد یہ دن — ستم کی عمر زیادہ ہے، زندگی کم ہے

اک اضطراب مسلسل کو عشق کہتے ہیں — وہ اضطراب کہ اک آرزوئے پیہم ہے

ہے یہ دلوں کی تیرگی، رات کی تیرگی نہیں — لاکھ چراغ ہیں، مگر بزم میں روشنی نہیں

اگر اب کرم ان کے ہم پر نہیں ہیں — تو ہم بھی اب ان کے کرم پر نہیں ہیں

ٹھہرنے بھی نہیں دیتی ہے اُس محفل میں بیتابی
مگر تسکین بھی جا کر اسی محفل میں ہوتی ہے

تاریک ترے بغیر دنیا — تا حدِ نگاہ ہو گئی ہے

اب ہجر کی رات چاندنی سے — کچھ اور سیاہ ہو گئی ہے

پرتوِ حسن ایک ہے، اور آئینہ خانے بہت — اک حقیقت نے بنا ڈالے ہیں افسانے بہت

منزلِ مقصود، بسمل! وہ نظر آنے لگی — ہر نظر منزل پہ جیسے ہر قدم منزل میں ہے

سر جس پہ نہ جھک جائیں، اسے در نہیں کہتے — ہر در پہ جو جھک جائے، اسے سر نہیں کہتے

میخانے کے اندر بھی وہ کہتے نہیں میخوار — جو بات کہ میخانے کے باہر نہیں کہتے

فرض ہی پابندیِ آئینِ میخانہ سہی — بسمل! اوّل چشمِ ساقی کا اشارہ دیکھیے

وہ آرزو، وہ تمنّا، وہ اضطراب نہیں — میں اب وہاں ہوں، جہاں کوئی بابِ نہیں

جب التفات نہ تھا، اشتیاق رہتا تھا — اب التفات ہوا ہے، تو دل کو تاب نہیں

عشق بھی ہے کس قدر برخود غلط — ان کی بزمِ ناز، اور خود داریاں

محبت ہی مرے ہر کام کو مشکل بناتی ہے — محبت ہی سے ہر مشکل کو آساں کر رہا ہوں میں

دل اُن کا، جان اُن کی، عشق اُن کا، آرزو اُن کی — مگر با ایں ہمہ کچھ ان پہ قرباں کر رہا ہوں میں

جب وہ ہوتے ہیں، تو ہر شے جیسے ہو جاتی ہے گم
وہ نہیں ہوتے، تو ہر شے میں انھیں پاتا ہوں میں

بسمل! اگرچہ اب نہیں فرصت کاروبارِ عشق
پائے طلب نہیں، مگر ذوقِ طلب ضرور ہے

قفس میں تو مجھے جب تک بھی رہنا ہو، مگر یارب!
تصور میں مرے جلتا رہیگا آشیاں کب تک

نہیں جب پاسِ وعدہ، تو مکر بھی جاؤ گے اک دن
بدل جائیگا جب دل، تو نہ بدلیگی زباں کب تک

ہے کیوں ہنوز حوصلۂ امتحاں مجھے
تم مطمئن نہیں ہوا ابھی امتحاں سے کیا

آپ جانا بھی نہیں، ان کو بلانا بھی نہیں
مگر اس طرح کچھ آسان بھلانا بھی نہیں

جو فسانوں کو حقیقت میں بدل دیتے تھے
آج دنیا میں کہیں ان کا فسانا بھی نہیں

عشق نومید تو نہیں، لیکن
عشق امید پر نہیں ہوتا

اللہ رے شرطِ عشق کہ ناکامیوں پہ بھی
بسمل! رہا نہ جائے تمنا کیے بغیر

کتنا بلند عشق کی غیرت نے کر دیا!
جس دن سے گر گئے ہیں تمھاری نظر سے ہم

بیٹھیں، تو کس امید پہ بیٹھے رہیں یہاں!
اٹھیں، تو اٹھ کے جائیں کہاں تیرے در سے ہم

جس آرزو میں تیری خوشی بھی نہ ہو شریک
وہ آرزو نصیبِ دلِ دشمناں رہے!

یہ دیتے ہیں مجھے طعنے تری نامہربانی کے
جو میرا حال مجھ سے پوچھتے ہیں مہربانی سے

مجھ کو ہر ظلم گوارا ہے تمھارا، لیکن
یہ گوارا نہیں، کہتی ہے جو دنیا تم کو

ناروا ان کی ہر اک بات ہو، بسمل! لیکن
ان سے یہ کون کہے، یہ نہیں زیبا تم کو

جتنا ہوں تجھ سے پاس میں، اتنا ہی دور ہوں
بڑھتی ہے یعنی بیخبری، آگہی کے ساتھ

تمھارے در سے ہم ناکام اٹھ کر آئے ہیں جب سے
کسی در پر جبینِ بندگی دیکھی نہیں جاتی

وہ کچھ اس طرح مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی

لرزتا تھا کبھی دل مرگِ بسمل کے تصور سے
مگر کمبخت کی اب زندگی دیکھی نہیں جاتی

کیا چیز دل میں ہے کہ ابھی ناتمام ہے — حال آں کہ کامیاب ہے دل بھی، نگاہ بھی

ہزار حسن عبادت گناہ سے پہلے — اور ایک لطفِ عبادت، مگر گناہ کے بعد

شوق کی کامیابیاں، تسلیم — دل مگر ناصبور رہتا ہے
حاصلِ عشق ہے یہی، بسمل! — یہ جو دل پُر سرور رہتا ہے

راتیں اسی کی، دن ہیں اسی خوش نصیب کے
وہ جس کے خواب میں ہیں، وہ جس کے خیال میں

جو جہاں ہے، وہیں تجھ سے ہے قریب — ہے کمال انجمن آرائی کا

فرشتوں کی جبیں جھکتی تھی، بسمل! جس کے قدموں پر
وہ انساں مر گیا سجدہ گزارِ این و آں ہو کر

ہو کسی کی داستاں، میرا ہی افسانہ ہے وہ — ہاں، مگر اس میں تمھارا نام ہونا چاہیے
دیکھ کر، بسمل! تمھاری زندگی آیا خیال — زندگی کا موت بھی، اک نام ہونا چاہیے

وائے افسردگیِ روح، ہائے شکستگیِ دل — ٹیس سی سانس سانس میں، ٹھیس سی بات بات میں

لاکھ شمعیں سہی مزاروں پر — روشنی تو نہیں مزاروں میں

یہاں ہر چیز جنت کی فراہم ہوتی جاتی ہے — مگر دنیا کو دیکھو، تو جہنم ہوتی جاتی ہے

اندیشۂ رسوائی، توجہ میں تو کم ہے — پھیلیگی تغافل سے خبر اور زیادہ
دیکھا ہے، رہِ ترکِ محبت پہ بھی چل کر — دشوار ہے یہ راہگزر اور زیادہ

بسمل! تم آج روتے ہو انجامِ عشق کو — ہم کل سمجھ گئے تھے کچھ آثار دیکھ کر

آصف بنارسی، عبدالرحمٰن

بنارس میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالشکور کم قیمت دھاتوں کے زیورات کا کاروبار کرتے تھے۔ خود بھی بناتے تھے اور فروخت بھی کرتے تھے۔ ان کے پانچ بیٹے ہوئے اور عبدالرحمٰن ان میں سب سے بڑے تھے۔ خدا کی شان، سب بیٹے شاعر ہوئے۔ ان کے نام ہیں: محمد سلیمان واصف (غالباً ۱۹۵۷ء میں ڈھاکے میں انتقال محمد عارفین عارف (کلکتے میں مقیم ہیں)؛ محمد یٰسین کاشف (آج کل کراچی میں رہتے ہیں)؛ شاکرالدین شاکر (یہ بھی کلکتے میں ہیں)۔

عبدالرحمٰن چھ سال کے تھے کہ ان کے والد عبدالشکور صاحب نے ۱۹۰۷ء میں اپنا کاروبار کلکتے منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بڑے بیٹے، عبدالرحمٰن اور محمد سلیمان ان کے ساتھ تھے۔ جب اُن کے پاؤں یہاں جم گئے، تو خاندان کے باقی افراد بھی کلکتے آ گئے۔ عبدالرحمٰن نے دسویں تک تعلیم کلکتے ہی میں پائی۔ اس زمانے میں کلکتے کی فضا شعر و نغمہ سے معمور تھی۔ نوجوان عبدالرحمٰن کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ شہر میں واقف بہاری کا شہرہ تھا۔ عبدالرحمٰن نے ان سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنی شاگردی میں قبول کریں۔ اس کے بعد واقف انھیں کے مکان پر رہنے لگے اور ایک طرح سے عبدالرحمٰن کے اتالیق بن گئے۔ آصف تخلص بھی انھیں نے عطا کیا تھا۔ اب نوجوان عبدالرحمٰن کو شعر و سخن کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہ رہا۔

ماخذ: مشرقی بنگال میں اردو، از سید اقبال عظیم؛ خطوط شعیب عظیم، ڈھاکہ (بنگلا دیش)؛ مغربی بنگال کے اردو شعرا (مشتاق احمد)، ماہنامہ روشنی، میرٹھ سٹی، جون، جولائی ۱۹۷۵ء)

والد نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے، تو انھیں اپنے ساتھ دکان پر بٹھا لیا؛ اس طرح میٹرک سے آگے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تھوڑے دن بعد واقف اپنے وطن بہار تشریف لے گئے، اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ آصف استاد کے ساتھ دو ایک مرتبہ مشہور استاد رضا علی وحشت (ف: جولائی ۱۹۵۶ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، جو اس زمانے میں کلکتے ہی میں رہتے تھے۔ واقف کی وفات کے بعد آصف کو کسی اور سے مشورۂ سخن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس پر انھوں نے وحشت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جوہر قابل تھا، اور وہ مبتدی بھی نہیں تھے۔ استاد نے بھی خاص توجہ سے نوازا۔ بہت جلد فارغ الاصلاح ہو گئے؛ اور استاد نے نئے اور مبتدی شاگرد ان کے حوالے کر دیے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور تقسیم ملک کے باعث وحشت مشرقی بنگال چلے گئے، کلکتے کے ادبی اور شعری حلقوں نے آصف کو غنیمت جانا اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ لیکن شہر کی فضا رفتہ رفتہ مسموم ہوتی چلی گئی اور بالآخر آصف نے بھی ہجرت کا عزم کر لیا۔ چنانچہ وہ وسط مارچ ۱۹۵۰ء میں اہل و عیال سمیت ڈھاکے چلے گئے۔ لیکن وہ کسی پر بار نہیں بنے۔ یہاں ایک مختصر دکان کر لی اور کسبِ حلال سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کا انتظام کر لیا۔

ان کی پہلی شادی ۱۹۲۰ء میں ہاجرہ خاتون سے ہوئی تھی۔ ان سے چار لڑکے (ضیاء الرحمٰن، ذکاء الرحمٰن مانی، رضاء الرحمٰن، ثناء الرحمٰن) اور دو لڑکیاں (سراج اللیل اور اشرف النساء) ہوئیں۔ اس بیگم کا ۱۹۳۷ء میں کلکتے میں انتقال ہو گیا، تو آصف نے دوسری شادی کی۔ اتفاق سے اس بیگم کا نام بھی ہاجرہ خاتون ہی تھا، ان کا ۱۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ڈھاکے میں انتقال ہوا؛ وہیں عظیم پور قبرستان میں مدفون ہیں۔ دوسری بیگم سے بھی چھ بچے ہوئے؛ چار لڑکے (بقاء الرحمٰن، ارشد الرحمٰن، احسن الرحمٰن، احمر الرحمٰن) اور دو لڑکیاں (نسرین

اور غزالہ پروین) ماشاء اللہ سب بچے برسرِ روزگار اور خوشحال ہیں، بعض ڈھاکے میں مقیم ہیں اور بعض کراچی میں۔

عمر کے ساتھ صحت جواب دے گئی اسی میں جمعہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اپنی دوسری بیگم کے قریب عظیم پور قبرستان، ڈھاکہ میں دفن ہوئے۔

سید محمد حسن رضا دانروی (لائبریرین ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگلا دیش) نے تاریخ کہی:

برمزارِ حضرتِ آصف مرا   گفت شخصے، از جہاں مخدوم رفت

با "دعا" گفتم، رضا، سالِ وصال   "جانشینِ وحشتِ مرحوم رفت"

(۷۵ + ۱۹۰۲ = ۱۹۷۷)

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ سخت پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے، اور اپنے زہد و ورع کے لیے مشہور تھے۔ اسی عزلت گزینی اور استغنا کے باعث انھوں نے کبھی کلام کی اشاعت کی طرف بھی توجہ نہ کی۔ نمونے کے چند شعر دیکھیے، جو شعیب عظیم (ڈھاکا) کا عطیہ ہیں:

پاتے ہیں اپنے کو اب تک فیض سے بیگانہ ہم   اے حرم والو! کریں آباد پھر بتخانہ ہم

تم کہو تو پھیر لیں اپنی حقیقت سے بھی آنکھ   تم سنو، تو چھیڑ دیں کوئی نیا افسانہ ہم

جا بجا آتا گیا اس کی نوازش کا بیاں   اپنے دل کا دیر تک کہتے رہے افسانہ ہم

غم کی طرح، خوشی کا تعلق بھی جی سے ہے   دل مبتلائے غم ہے، تو اپنی خوشی سے ہے

ہوا بھی مستانہ چل رہی ہے، گھٹا بھی چھائی ہے میکدے پر

ہے کس کا اب انتظار ساقی، شراب شیشے میں کیا نہیں ہے!

میکدے میں آگئے ہو، مان لو ساقی کی بات   توبہ کرنے سے تو آصف! روکتا کوئی نہیں

خیال آتا ہے جب آشیاں بنانے کا   نظر کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے

ساقی کی چشمِ مست کی کیفیتیں نہ پوچھ — ساغر چھلکتے رہتے ہیں بزمِ خیال میں

اس کی نظر نے جی نہ بڑھایا — دل میں تو اٹھا ولولہ اکثر
دل کی بدولت گرم ہے محفل — شیشہ نہ ساقی، بادہ نہ ساغر

کچھ کم نہیں ہے بیتِ حرم سے حریمِ دل — کیوں اس کی جلوہ گاہ وہاں ہو، یہاں نہ ہو

تھی انھیں سے تری دنیائے محبت آباد — زندگی بھر جو تری راہ میں برباد رہے
ہم کو مطلوب بہرحال خوشی تھی تیری — تو نے جس حال میں رکھا ہمیں، ہم شاد رہے
ہم کچھ اس طرح رہے بزمِ جہاں میں آصف! — جس طرح شمع سرِ رہگزرِ باد رہے

بے التفاتیوں کی تری جو ہے شکوہ مند — وہ چشمِ التفات کے قابل کہاں ہوا!

مالک کی مشیت میں اجارا کیا ہے! — سب کچھ تو اسی کا ہے، ہمارا کیا ہے!
کہتے ہیں، مصیبت پہ کرو صبر، آصف! — کہیے تو، سوا صبر کے چارا کیا ہے!

سنی جاتی نہ، آصف! ہجومِ ساقی کی غیبت میں
نظر پڑتے ہی واعظ پر نہ میخانے میں ہم ٹھہرے

ابراہیم جلیس، ابراہیم حسین

ان کا خاندان دراصل ریاست حیدرآباد کے شہر عثمان آباد کا رہنے والا تھا، لیکن ابراہیم حسین اپنی ننھیال بنگلور میں ١١ اگست ١٩٢٤ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد احمد حسین صاحب صحیح معنوں میں خود ساختہ آدمی تھے۔ احمد حسین کے والد محمد حسین (یعنی ابراہیم حسین کے دادا) عثمان آباد تحصیل میں معمولی مشاہرے پر اہلمد تھے۔ آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ بچوں کو معقول تعلیم دلا سکتے۔ احمد حسین اور ان کے بڑے بھائی محمد اسحاق دونوں کے دل میں ولولہ تھا کہ کسی طرح تعلیم ضرور حاصل کی جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ عثمان آباد میں یہ ارمان پورا نہیں ہونے کا۔ اس پر دونوں بھائیوں نے حیدرآباد کی راہ لی، اور محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کی۔ خدا نے بھی مدد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ کسی قابل ہوئے، تو محمد اسحاق نے واپس آکر عثمان آباد میں وکالت شروع کر دی۔ احمد حسین شروع میں پیشکار ثانی مقرر ہوئے، اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے تحصیلدار کے عہدے تک پہنچے۔ وہ لمبے عرصے تک گلبرگہ میں تعینات رہے۔ ان کی اولاد میں ماشاء اللہ نو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ سب سے بڑے بیٹے محبوب حسین جگر آج کل روزنامہ سیاست، حیدرآباد میں جائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ ان سے چھوٹے عابد حسین نے مہاراشٹر گورنمنٹ کے کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ سے پنشن پائی ہے۔ اکلوتی بہن (صندلی بیگم)

ماخذ: مجتبیٰ حسین (برادر مرحوم)؛ حیدرآباد کے ادیب (زینت ساجدہ)؛ جان پہچان (نریش کمار شاد)؛ روزنامہ سیاست، حیدرآباد

انھیں سے چھوٹی تھی ؛ اس کا ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ ابراہیم حسین بھائیوں میں تیسرے تھے۔ ایک بھائی یوسف حسین کراچی میں ملازم ہیں۔ اقبال حسین کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوگیا۔ اُردو کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین، انھیں ابراہیم حسین مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں (ولادت: ۱۵ جولائی ۱۹۳۶ء)۔ ان سے چھوٹے تین بھائی اور ہیں: خورشید حسین، محمود حسین، سراج حسین۔

احمد حسین صاحب ۱۹۴۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد نواب کلیانی کی جاگیر میں تعلقدار مقرر ہوگئے؛ تین سال بعد واپس گلبرگہ چلے آئے۔ طویل عرصے تک گلبرگہ میں رہنے کے باعث وہ گویا وہیں کے باشندے ہوگئے تھے۔ انھوں نے وہاں خاصی جاداد پیدا کرلی اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ پھر ۱۹۴۶ء میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ گلبرگہ کی ساری جاداد فروخت کرکے اپنی جنم بھومی عثمان آباد چلے گئے۔ زندگی کے بقیہ ایام وطن میں گزارے۔ انھوں نے تقریباً سو برس کی عمر میں ۱۰ مئی ۱۹۷۳ء کو رحلت کی۔

احمد حسین مرحوم نے خود جس شوق اور محنت سے تعلیم حاصل کی تھی، اور اس کا جو شیریں پھل پایا تھا، اس نے انھیں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی ترغیب دلائی۔ ان کا دوسرا اصرار یہ تھا کہ دورانِ تعلیم میں بچے اسکول یا کالج کی اقامت گاہوں (ہوسٹل) میں رہیں، تاکہ انھیں سوسائٹی میں رہنے کا سلیقہ آئے اور وہ اچھے شہری بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بچوں نے عام طور پر اقامتگاہوں میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ ابراہیم اپنے والد کے چہیتے تھے۔ والد چاہتے تھے کہ وہ ریاست کی سول سروس میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۰ء میں گورنمنٹ انٹر کالج گلبرگہ سے انٹر کی سند لی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ اس کے بعد والد نے انھیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا، جہاں سے یہ دو سال بعد ۱۹۴۲ء میں بی، اے

پاس کرکے واپس آئے۔ اب یہاں انھوں نے وکالت (ایل ایل بی) میں داخلہ لے لیا، لیکن اسے مکمل نہ کرسکے۔

سب سے پہلی ملازمت سول سپلائی کے محکمے میں ملی، جو اس زمانے میں کمرشل کارپوریشن کہلاتا تھا۔ لیکن یہاں انھوں نے سال بھر بھی نہیں گزارا، دس گیارہ مہینے ہی میں کسی دفتری چپقلش پر استعفٰے دے کر الگ ہوگئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بنیادی طور پر ان کا مزاج ادبی تھا، اور وہ نزاکتِ طبع کے باعث دفتری پابندیوں کی گون کے آدمی نہیں تھے۔ اسی لیے جہاں کوئی معمولی سی بات بھی ناپسندِ خاطر ہوئی، وہ بھڑ جاتے اور سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی میں مقامی اخباروں، رسالوں میں لکھنے اور ریڈیو پر تقاریر کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی عام شہرت ۱۹۴۱ء میں ہوئی، جب ان کا افسانہ "رشتہ" ساقی، دلّی میں شائع ہوا، جس کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی تھے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۹۴۲ء میں ان کے دوست مسلم ضیائی نے اپنا اشاعتی ادارہ "اردو محل" قائم کیا۔ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں ابراہیم کے افسانوں کا مجموعہ "زرد چہرے" شائع کیا۔ اس سے ان کی افسانہ نویس اور طنز نگار کی حیثیت سے ملک گیر شہرت ہوئی۔ اس کے بعد تابڑ توڑ ان کی چار کتابیں شائع ہوئیں: چالیس کروڑ بھکاری (ناول)، تکونا دیس (افسانے)، چور بازار (ناول)، کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں (افسانے)۔ ایک اور کتاب "بھوکا بنگال" بھی تھی؛ اس میں دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات جمع کی تھیں۔

۱۹۴۴ء ہی میں وہ فلم کے میدان میں قسمت آزمائی کرنے کو بمبئی گئے۔ یہاں ان کے دوست عبدالحی ساحر لدھیانوی پہلے سے موجود تھے۔ قیامِ بمبئی کے زمانے میں ابراہیم انھیں کے ساتھ رہے۔ لیکن مزاج کے تلوّن نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، اور سال بھر بعد وہ حیدرآباد واپس آگئے۔ یہاں ان دنوں ترقّی پسند تحریک کا دَور دورہ تھا، اور ہر طرف اس کے

جلسے اور اجتماع ہو رہے تھے ۔ ابراہیم بھی ان میں سرگرم حصّہ لینے لگے ۔ ۱۹۴۶ء میں اس تحریک سے وابستہ مصنّفین کی کانفرنس کا کل ہند اجلاس حیدرآباد میں ہوا تھا؛ ابراہیم نے اسے کامیاب بنانے میں برابر کا حصّہ لیا تھا ۔
۱۹۴۶ء میں ان کی گلبرگہ کے مشہور اور متموّل تاجر جناب حاجی حیدر کی صاحبزادی کنیز فاطمہ سے شادی ہوئی ۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور ملک تقسیم ہو گیا ۔ ابراہیم کی سیاست نے پھر کروٹ لی؛ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلے گئے ۔ وہ اکیلے گئے تھے، بیوی بچے یہیں حیدرآباد میں رہے ۔ اس سفر میں اور پاکستان پہنچنے کے بعد انھیں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، اس سے انھیں احساس ہوا کہ بہر زمیں کہ رسیدیم، آسماں پیداست ۔ ان کا رپورتاژ " دو ملک ایک کہانی "، اسی سفر کی داستان ہے، جو انھوں نے چند دن میں قلمبند کر دی تھی، اور جولاہور سے اوائل ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی ۔
لاہور میں ان کی ملازمت کا آغاز بچوں کے رسالے "ساتھی" کے ادارۂ تحریر سے وابستگی سے ہوا ۔ اس کے بعد وہ روزنامہ " امروز " میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے چلے گئے ۔ اس زمانے میں احمد ندیم قاسمی اور ابن انشا بھی اسی اخبار میں کام کرتے تھے ۔ امروز میں وہ دو برس تک رہے ۔ انھیں ایام میں حکومت پاکستان نے پبلک سیفٹی ایکٹ نافذ کر دیا ۔ ابراہیم جلیس نے اس پر ایک طنزیہ افسانہ لکھا: " پبلک سیفٹی ریزر " فوجی حکمرانوں کی ادب و مزاح کی حس بہت کمزور ہوتی ہے ۔ جلیس بیچارے کی طنز کی داد وہ کیا دیتے! اسی سیفٹی ایکٹ کے تحت انھیں گرفتار کر لیا؛ اور نہ مقدمہ، نہ صفائی کا موقع، بس جیل میں ٹھونس دیا ۔ بارے، وہ زیادہ دن جیل میں نہیں رہے؛ بعض دوستوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر تین چار مہینے بعد رہا ہو گئے ۔ اسی نظر بندی کے زمانے میں انھوں نے " جیل کے دن، جیل کی راتیں " لکھی تھی ۔
۱۹۵۰ء میں پاکستانی صحافیوں کا ایک وفد چین گیا تھا، میاں افتخار الدین (ف:

جون ۱۹۶۲ء) اس کے قائد تھے۔ ابراہیم جلیس بھی اس وفد کے ایک رکن تھے۔ اسی سفر
سے واپسی پر انھوں نے اپنی کتاب "دیوارِ چین کے سائے میں" شائع کی۔ لیکن اب
ان کے پاس مستقل کام کوئی نہیں تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت افسانے
اور طنزیہ مضامین لکھے اور اس پہلو سے ان کی خاصی شہرت ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں
ان کے چھوٹے بھائی یوسف حسین بھی یہاں سے پاکستان چلے گئے؛ کراچی ہوائی اڈے
پر کالٹکس میں ان کا تقرر ہوگیا۔ ان کے اصرار پر جلیس بھی لاہور سے کراچی چلے گئے۔
ہاتھ کچھ کھلا تو دو سال بعد ۱۹۵۵ء میں جلیس کے بیوی بچے بھی کراچی پہنچ گئے۔
کراچی میں اولاً مدتوں ریڈیو اور ٹیلی وژن معاش کا سہارا رہا؛ فلموں کے لیے مکالمے
وغیرہ بھی لکھے۔ ایک ڈراما "اجالے سے پہلے" بھی لکھا تھا؛ اس کی غالباً فلم بھی بنائی
گئی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب عارضی کام تھے اور اطمینان کا فقدان تھا۔ مجید
لاہوری مشہور مزاح نگار روزنامہ "جنگ" کراچی میں مزاحیہ کالم "وغیرہ وغیرہ"
لکھا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی (ف: مئی ۱۹۶۳ء) بھی اخبار میں کام کرتے تھے۔ ابراہیم
جلیس کا ان دونوں کے وہاں جانا آنا تھا، بلکہ ان سے گہرے مراسم تھے۔ کارِ قضا
۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو مجید لاہوری اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب اخبار کے اصحابِ حل و
عقد کو ان کا فکاہیہ کالم جاری رکھنے کے لیے کسی موزوں شخص کی تلاش ہوئی۔
حسنِ اتفاق سے قرعۂ فال ابراہیم جلیس کے نام پڑا اور یہ "جنگ" کا کالم "وغیرہ
وغیرہ" لکھنے پر مقرر ہوگئے۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ مجید لاہوری کے بعد ان کی اس
روایت کو برقرار رکھنا دشوار ہوگا، وہ بھی ابراہیم جلیس کے زورِ قلم اور شوخیِ تحریر
کے قائل ہوگئے۔ اس سے نہ صرف پرچے کی مقبولیت میں کوئی فرق آیا، بلکہ خود
جلیس کی شہرت میں بھی چار چاند لگ گئے۔
"جنگ" کی ملازمت ترک کرنے کے بعد ان کی تین کتابیں شائع ہوئیں: (۱) "نیکی کر

تھاتے جا" اور (۲) "اور پر شیروانی، اندر پریشانی"۔ یہ ان کے کالمی شذرات کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب "شگفتہ شگفتہ" ہے۔ اس میں طنزیہ مضامین ہیں۔
روزنامہ "جنگ" سے الگ ہو کر وہ روزنامہ "انجام" کراچی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں بھی چندے بعد کسی بات پر اخبار کے مالکوں سے جھگڑا ہو گیا، اور انھوں نے حسب عادت استعفے داغ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار "عوامی عدالت" جاری کیا۔ لیکن ایک تو روپے کی کمی، دوسرے انتظامی صلاحیت مفقود؛ اس پرچے سے انھیں کوئی مالی یافت ہوئی، نہ ذہنی سکون ملا۔ اس کے باوجود انھوں نے اسے لشتم پشتم چار سال چلایا اور بالآخر مجبوراً بند کرنا پڑا۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں وہ حکمران "پاکستان پیپلز پارٹی" کے نفسِ ناطقہ روزنامہ "مساوات" کے مدیرِ اعلیٰ بنا دیے گئے۔ لیکن یہ عروج دولت مستعجل ثابت ہوا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو حکومت کا تختہ الٹ گیا اور ملک میں مارشل لا (جرنیلی قانون) نافذ ہو گیا۔ "مساوات" بھی اسی کا شکار ہوا اور اس کی اشاعت بند کر دی گئی۔ جب پابندی رفع ہوئی، تو مطبع نے جس میں یہ اخبار چھپتا تھا، اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ جلیس نے اصحاب مجاز سے رجوع کیا کہ اخبار کو کسی دوسرے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی جائے۔ انھیں زیادہ فکر ان سیکڑوں ملازمین کی تھی، جو اخبار کے بند ہو جانے سے بیروزگاری کا شکار ہو گئے تھے، اور قدرتاً بیحد پریشان تھے۔ جلیس جا کے خود متعلقہ افسروں سے ملے اور انھیں قائل معقول کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کی یہ مساعی بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ حکّام نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ جلیس دل کے عارضے کے مریض تھے، وہ اس لیت و لعل کی تاب نہ لا سکے۔ گھر پہنچے اور اچانک بیمار ہو گئے۔ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر انھیں فوراً جناح اسپتال میں داخل کیا گیا، جہاں اگلے دن بدھ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء علی الصبح چار بجے دماغ کی شریان پھٹ جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ

وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ ۔ جنازہ جمعرات ۲۷ اکتوبر (۱۹۷۷ء) کی سہ پہر میں اٹھا، اور انھیں کراچی کے قبرستان "گلشنِ اقبال" میں دفن کر دیا گیا۔
رئیس امروہوی نے ہجری میں تاریخ کہی:

ہمنشیں مجلسِ صحافت کا — آج یارانِ خُلد کا ہے جلیس
وہ ادیب و صحافی و طناز — بہ طرازِ جمیل و طرزِ نفیس
اس کی تقریر دلکش و سادہ — اس کی تحریر دلنشین و سلیس
مل کے اہلِ قلم وداع کریں — "آج رخصت جلیس کی ہے رئیس"

جسمانی اولاد میں آٹھ بچے اپنی یادگار چھوڑے: تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے

بسمل سندیلوی، سیّد امیر حسن، چودھری

لکھنؤ سے ۴۵ کلومیٹر کی دوری پر یوپی کے ضلع ہردوئی میں سندیلہ بہت قدیم قصبہ ہے، اور اپنی بعض خصوصیات کے باعث اہم بھی۔ یہاں کی خاک سے کئی اصحاب علم و فضل اٹھے۔ بسمل یہیں محلہ چودھرانہ میں ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سیّد تاج الدین فاریابی سے ملتا ہے، جو اپنے وطن فاریاب سے نقل مکان کر کے ہندستان آئے اور سندیلہ میں مقیم ہو گئے۔

بسمل کے والد چودھری سیّد علی حسن اور دادا چودھری سیّد حسن رضا کا بڑے زمینداروں اور قصبے کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے نانا چودھری سیّد علی رضا ان کے دادا کے برادرِ خرد تھے غرض دادھیال اور ننھیال، دونوں طرف عزت و آبرو کا ماحول تھا، بلکہ روپے کی فراوانی تھی۔ جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو فارسی پڑھانے کا نجی انتظام کیا گیا۔ چند برس بعد مقامی اسکول میں بھیج دیے گئے۔ لیکن بیجا لاڈ چاؤ تعلیمی ترقی میں روک ثابت ہوا۔ اس زمانے میں بالعموم رؤسا بھی بچوں کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے؛ ان کے خیال میں یہ ان کی شان سے فروتر بات تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر حسن آٹھویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

جب سنِ شعور کو پہنچے، تو خاندانی اثر و رسوخ سے کورٹ آف وارڈس کے محکمے میں معقول ملازمت مل گئی۔ لیکن رئیسانہ ماحول کا پروردہ نوجوان نوکری کی کھکھیڑ برداشت

ماخذ: چودھری محمد فہیم ایم اے، سندیلہ: "تذکرۂ مشاہیر سندیلہ"، از چودھری نبی احمد (مرتبہ نور الحسن ہاشمی)

نہ کرسکا؛ جلد ہی مستعفی ہوکر گھر چلے آئے۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال میں وقت گزرا۔ لیکن یہ زمینداری بھی جلد ختم ہوگئی۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جہاں دن عید، رات شب برات کا سماں تھا، وہاں بعد تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ بارے، یوپی حکومت نے ساٹھ روپلے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، جس سے کچھ اشک شوئی کا انتظام ہوگیا۔

اُس زمانے میں رُوسا کے گھرانوں میں بچوں کی شادی جلد کر دینے کا رواج عام تھا۔ امیر حسن بھی بمشکل نوجوانی کی حد سے متجاوز ہوئے تھے کہ ۱۹۱۲ء میں قصبہ دیوہا کے ملک کرم حسین کی پوتی سے اُن کی شادی ہوگئی۔ اس کا نتیجہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے۔ خدا کی شان دونوں بچے یکے بعد دیگرے ماں کی گود خالی کر گئے۔ غریب ماں کے لیے یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ روز بروز گھلنے لگی، اور بالآخر تپ دق میں مبتلا ہوگئی اور اسی میں جنت سدھاری۔ امیر حسن ان پے در پے صدمات سے بوکھلا اُٹھے اور اندوہ وغم کا شکار ہوکر گوشہ نشین ہوگئے۔ گھر والوں نے بہت چاہا کہ ان کا دوسرا نکاح کر دیا جائے تاکہ ان کا غم غلط ہو سکے، لیکن امیر حسن اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر بزرگوں کے متواتر اصرار اور سمجھانے بجھانے سے دس برس بعد ۱۹۳۰ء میں دوسری شادی پر رضامند ہوئے۔ دوسری بیوی سندیلہ ہی کے اشراف محلہ کے چودھری کلو کی پوتی تھیں۔ چودھری کلو متمول اور صاحب حیثیت آدمی تھے؛ وہ یہاں چکلے دار تھے۔ ان کا شاہی تعزیہ، مسجد، امام چوک اور بارہ دری، مقبرہ وغیرہ آج بھی یادگار ہیں۔ امیر حسن صاحب کے اس بیگم سے صرف ایک بیٹے (چودھری) سید محمد نصیر ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی۔ آج کل روزنامہ قومی آواز کے چیف رپورٹر کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں؛ نصیر تخلص کرتے ہیں۔

امیر حسن کو شعر گوئی کا شوق ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ دراصل یہ مختلف اہل ذوق اصحاب

کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ ان کا بچپن اور عنفوانِ شباب کا کافی زمانہ لکھنؤ میں بسر ہوا یہاں انھیں اپنے خاندانی تعلقات کے باعث اس عہد کے بعض مشاہیر مثلاً سراج لکھنوی، شمس لکھنوی، منظر لکھنوی، قدیر لکھنوی، حسرت لکھنوی وغیرہ سے ملنے کے مواقع ملے۔ ناممکن تھا کہ اتنے سارے قادر الکلام شعرا سے دن رات کا اٹھنا بیٹھنا رنگ نہ دکھاتا۔ امیر حسن بھی شعر کہنے لگے۔ سب سے پہلے مشورے کے لیے ان کی نظر اپنے ہموطن میر منصب علی ہنر سندیلوی (شاگردِ آفتاب الدولہ قلق لکھنوی) پر پڑی۔ میر منصب علی ہنر اپنے عہد کے مشہور اور مشّاق شاعر تھے۔ وہ اُردو ہی میں نہیں، فارسی میں بھی کہتے تھے، اور اس میں کاظم علی سندیلوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے سول کورٹ ہردوئی سے پنشن پائی تھی، جہاں وہ سررشتہ دار کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن میں مقیم ہوگئے۔ سندیلہ کے رئیس سیّد التفات رسول ہاشمی تعلّقہ دار سخنور اور سخن شناس بزرگ تھے۔ وہ اپنی عمر بھر شعر و سخن کے سرپرست رہے۔ ان کے منعقدہ سالانہ مشاعرے بڑی دھوم دھام کے ہوتے تھے۔ ان میں دُور دُور سے اساتذۂ سخن بلائے جاتے تھے۔ ان مشاعروں کا اہتمام و انصرام میر منصب علی ہی کیا کرتے تھے۔ افسوس ان کا دیوان آج تک شائع نہیں ہوا؛ بعمرہ ۶ سال ۶ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔

سیّد التفات رسول ہاشمی کے ۱۹۱۱ء کے مشاعرے میں سیّد انور حسین آرزو لکھنوی بھی مدعو تھے۔ ہاشمی کو ان کا کلام کچھ ایسا پسند آیا کہ انھوں نے آرزو مرحوم (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے سندیلہ میں قیام کرنے کی درخواست کی، اور ان سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ آرزو صاحب ہاشمی صاحب کی وفات یعنی ۱۹۲۱ء تک سندیلہ میں مقیم رہے۔ ہنر کی وفات کے بعد بسمل بھی آرزو سے مشورہ کرنے لگے اور جب آرزو لکھنؤ واپس چلے گئے، تو بسمل وہاں بھی ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے، تاآں کہ آرزو بعض فلم سازوں کی دعوت پر

آول کلکتے اور پھر وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے۔ استاد نے اس سے پہلے ہی بسمل کو فارغ الاصلاح قرار دے دیا تھا۔

بسمل نے اگرچہ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کا اصلی میدان غزل تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ان کے کلام کا مختصر انتخاب "فکر و نظر" کے عنوان سے لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شانتا رام کی مشہور فلم "صبح کا تارا" کی مرکزی غزل، جس کا مطلع درجِ ذیل ہے، بسمل ہی کی کہی ہوئی ہے:

زرا اُو جانے والے! رُخ سے آنچل کو ہٹا دینا
تجھے اپنی جوانی کی قسم، صورت دکھا دینا

یہ غزل بسمل نے اپنے محبوب کی بیوقت وفات پر کہی تھی۔ مرحوم کہتے تھے کہ فلم ساز نے نہ غزل کے استعمال کی ان سے اجازت لی، نہ انھیں کوئی معاوضہ ہی دیا۔

مرورِ زمانہ اور کبرسنی کے ساتھ صحت خراب رہنے لگی تھی۔ رہی سہی کسر چچا زاد بھائی چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی کی وفات (۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء) نے پوری کر دی بسمل کو نشتر سے محبت نہیں، عشق تھا؛ ان کی وفات نے بسمل کی دنیا تاریک کر دی۔ پھر اچانک حبسِ بول کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد نصیر انھیں لکھنؤ لے گئے۔ مثانہ میں پتھری تشخیص ہوئی۔ طوعاً و کرہاً عملِ جراحی پر راضی ہو گئے۔ آپریشن کامیاب رہا۔ لیکن نقاہت اس بلا کی ہو گئی کہ اس کے بعد مستقلاً بالکل بستر سے لگ گئے۔ اسی حالت میں ہفتہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کی سہ پہر میں چار بجے سندیلہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اور اسی دن بعدِ مغرب اپنے آبائی قبرستان (نزدِ آئی، آر، کالج) سپردِ خاک کر دیے گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب درجِ ذیل ہے، جو ان کے مجموعے 'فکر و نظر' سے ماخوذ ہے۔

چونکہ طبیعت پر تصوف کا غلبہ تھا، ان کے کلام میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے:

مانا کہ شکستہ ہے کشتی، تنہا ہی سہی، ساتھی نہ سہی
یہ بات تو ہے تیرے بس کی، دھارے کو بھی ساحل کر دے

ملنا نہیں تم کو مجھ سے اگر، تو آس بھی توڑو ملنے کی
دشوار ابھی تو ہے جینا، مرنا نہ کہیں مشکل کر دے

یہ ہے کلید محبت کی کامیابی کی — بس ایسی بات نہ کر، ان کو جو گراں گزرے
وفا میں اس کی کوئی اب تو شک نہیں باقی — تری جفا پہ کرم کا جسے گماں گزرے
وہ حسن و عشق کی دشوار منزلیں، توبہ! — ہمیں تھے ایسے جو دونوں کے درمیاں گزرے

وہی ایک ذات ہے حسن کی، جو ہزار طرح سے ہے عیاں
نئے رنگ سے، نئے ڈھنگ سے، نئے روپ سے، نئے نام سے

مرے دل کو ان سے لگاؤ ہے، جو ہمیشہ چیں بجبیں رہے
مری بات سے، مرے ذکر سے، مری شکل سے، مرے نام سے

ہے کرکے جفائیں ناز انھیں، میں کرکے وفائیں نادم ہوں
نا اہل محبت کیا جانیں، یہ کیسی گھاتیں ہوتی ہیں

عیاں ہوا راز نہاں کسی پر، وہ میرا راز نہاں نہیں ہے
بیاں کو تاب نظر نہیں ہے، نظر کو تاب بیاں نہیں ہے

اللہ، اتنا دشمن کوئی نہ ہو کسی کا — آنکھیں دکھا رہے ہیں تیرے بھی اس گلی کے

غم سے جب تک خوشی نہیں ہوتی — زندگی زندگی نہیں ہوتی
غم کی تکمیل ہی نہیں ہوتی — مطمئن زندگی نہیں ہوتی
لوگ کس طرح کرتے ہیں شکوے — ہم سے تعریف بھی نہیں ہوتی

اتنے ناکامی پیہم نے دیے ہیں چرکے — کام سے پہلے ہی ہر کام سے جی ڈرتا ہے
یا وہ دن تھے کہ محبت تھی سبب جینے کا — یا یہ ہے وقت کہ انجام سے جی ڈرتا ہے

اشاریہ

۱۔ اشخاص

[۱۔ کسی ہندسے کے نیچے خط سے یہ مراد ہے کہ یہ نام اس صفحے پر ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے
۲۔ اس کے ساتھ فہرست مضامین بھی پیش نظر رہے۔]

ا

آ

خ

د

ذ

ر

ن

۲۔ مطبوعات
(کتب و رسائل)

غ

ف

ق

ک

گ